سفرنامہ

غبارِ راہ

امیر محمد اکرم اعوان



غبارِ راہ

تالیف

ملک محمد اکرم اعوان

اویسیہ کتب خانہ

اویسیہ سوسائٹی ۔ کالج روڈ ۔ ٹاؤن شپ لاہور

نام کتاب	غبارِ راہ
مصنف	مولانا محمد اکرم اعوان
تعداد	ایک ہزار
بار	سوم
قیمت	150 روپے
کتابت	شفیق احمد اعجاز
سرورق	خالد جاوید یوسفی
مطبع	یمانی پرنٹرز

ترتیب

پیش لفظ

مصنف کو دنیا ایک کامل صوفی کی حیثیت میں پہچانتی ہے اور بحیثیت مصنف بھی وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اب وہ ایک غیر معمولی سیاح کی حیثیت میں سامنے آئے ہیں اُن کی یہ تحریر "غبارِ راہ" سفرنامہ بھی ہے۔ مختلف تہذیبوں کا مطالعہ بھی ہے اور وہ لافانی پیغام بھی پہلو میں لیے ہوئے ہے جو قوموں کو بناتا اور سنوارتا ہے۔ باطل تہذیبوں کو مٹاتا ہے۔ اور پاکیزہ معاشرے اور تہذیب کی تشکیل کر کے پروان چڑھاتا ہے۔

انہوں نے نگری نگری اور دیس دیس کی سیاحت کی ہے۔ محض سیر کی خاطر نہیں، ایک مقصد، ایک مشن لے کر۔ مختلف ممالک اور علاقوں کے قدرتی نظارے دیکھے ہیں تو ان کی تہذیب و تمدن کو بھی دیکھا ہے۔ لوگوں کو دیکھا ہے تو اُن کے دلوں کی گہرائیوں میں جھانک کر بھی دیکھا ہے۔

"غبارِ راہ" کے مصنف کو اللہ نے ایسی نگاہ بخشی ہے کہ اُن کی اس تحریر میں نظاروں کا حسن بھی ہے تو ان ہی نظاروں میں رہنے والے انسانوں کے شکستہ دلوں کا حال بھی ہے۔

سیاح تو عموماً انسان کے بنائے ہوئے شاہکار عمارتوں کو دیکھتے ہیں۔ پارکوں اور تفریح گاہوں کو دیکھتے ہیں۔ سڑکوں اور قدرتی مناظر کو دیکھتے ہیں۔ لوگوں کے ظاہری خوشحالی یا بدحالی کو دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن قوموں کی تہذیب اور اُن کے قلوب کی سیاحت کرنا، ایک بالکل نیا اور منفرد تجربہ ہے۔ مغرب کی عریانی دیکھ کر مصنف نفرت کا اظہار نہیں کرتا (وہ تو سب ہی کر لیتے ہیں) بلکہ اپنی سوچ کے مختلف انداز کو یوں بیان کرتا ہے۔ "یہ نوجوان لڑکیاں جو ننگی پھر رہی ہیں۔ جن کو دیکھ کر آپ خوش ہوتے ہیں۔ یہ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ میری اور آپ کی بیٹیاں ہیں۔ ان تک اللہ کا، اور اللہ کے رسول کا پیغام پہنچانے کے ہم مکلف ہیں ہم اُن کے ننگے بدن دیکھنے کے مکلف نہیں ہیں۔ ہم اُن کے بدن ڈھانپنے کے مکلف ہیں۔ ہم سے

یہ حساب ہوگا۔ ہم سے یہ پوچھا جائے گا کہ اِن ننگے جسموں کو ڈھانپنے کے لیے ہم نے کیا محنت کی ہے۔ جن کو دیکھ کر تم کہتے ہو۔ یہ انگریز کی بیٹی ہے۔ یہ امریکن کی بیٹی ہے۔ یہ سویڈش کی بیٹی ہے۔ یہ ناروے کی لڑکی ہے۔ مَیں اُنہیں آدم علیہ السلام کی بیٹیاں سمجھتا ہوں۔ مَیں اُنہیں محمد رسول اللہ ﷺ کی امتِ دعوت تسلیم کرتا ہوں۔ کیونکہ اِن سب کی طرف حضور مبعوث ہوئے ہیں۔ مَیں اور آپ اُن کے برہنہ جسم دیکھ کر انجوائے کریں گے تو اُنہیں اللہ کا پیغام کون پہنچائے گا۔ کافر اور مسلمان میں فرق کیا ہوا۔"

ہم مغرب کی سوچ کو اپنے پاکستانی معیار پر تولتے ہیں۔ خود کو اُن کے سامنے چھوٹا محسوس کرتے ہیں اس لیے اُن سے نفرت کرتے ہیں اور اُس نفرت کا جواز ڈھونڈتے ہیں لیکن مصنف اِس سوچ کے قائل نہیں۔ اُن کی فکر کا معیار، تمام معیاروں سے بہت ہی بلند ہے۔ پاکستان ہو یا اقوامِ مغرب، سب کو ایک جج کی طرح تولتے ہیں اور پھر ایک تجربہ کار معالج کی طرح علاج تجویز کرتے ہیں۔ اِس کا اظہار یوں کیا ہے۔ "آپ کہتے ہیں مغربی اقوام مسلمانوں کی عزت نہیں کرتے۔ مَیں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مسلمان کی اپنے گھر میں کوئی عزت نہیں ہے۔ اگر مسلمان کی امریکن عزت نہیں کرتے تو مسلمان کی پاکستان میں کیا عزت ہے ...... شاید اس لیے کہ ہم اُس پائے کے مسلمان رہے ہی نہیں جس پائے کا مسلمان عزت کا مستحق ہوتا ہے۔" یہ جو ہم دوسری اقوام کے مقابلے میں کمتری کا شکار ہیں تو کیوں؟ مصنف نے اس کا علاج یوں تجویز کیا ہے۔ "ہمیں اپنا تعارف تلاش کرنا ہے۔ کہ ہم کون ہیں؟ اپنے آپ کو پرکھنا ہے۔ اپنے متعلق صحیح رائے قائم کرنا ہے۔ کہ ہمیں کہاں ہونا چاہیئے اور ہم کس جگہ کھڑے ہیں۔"

کسی نے سوال کیا کہ اگر آپ نے مغرب کی بے حیائی میں حصہ نہیں لینا ہے تو اسے دیکھنے کیوں جاتے ہو؟ جواب میں لکھتے ہیں "ہم دیکھنے نہیں جاتے۔ ہم اُس کا مقابلہ کرنے جاتے ہیں۔ اور بحمد اللہ! یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہم نے ایک مہینے میں چودہ ممالک میں ذاکرین کی جماعتیں پیدا کی ہیں۔ اور یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہر ملک میں غیر مسلموں کو مسلمان بھی کیا ہے۔"

اِس غیر معمولی سیّاح کی سیاحت صرف مغربی ممالک پر ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اپنے ہی دیس کے اُن علاقوں کی سیاحت بھی شامل ہے۔ جہاں تک اسی ملک کے شہری پہنچ ہی نہیں پاتے ہیں۔ اگر کوئی سیّاح پہنچا ہے تو وہ صحیح عکاسی نہیں کر پایا ہے۔ جہاں کے متعلق پاکستان کے لوگ صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ اُونچے اُونچے برفانی پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور بس۔ "دیس اندر پردیس" ملک کے اُس حصّے کی عکاسی ہے۔ جہاں کے بسنے والے انسان ہمارے لیے اجنبی اور پردیسی ہیں۔

"شیروں کا کچھار" اُس علاقے کی سیاحت ہے۔ جسے ہم علاقہ غیر کہتے ہیں۔ اور ڈاکوؤں اور قاتلوں کی پناہ گاہ سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ وہ ہم سے بہتر اور کھرے مسلمان ہیں۔ اور برِصغیر میں اسلام پھیلانے میں اُن کا کتنا بڑا کردار ہے۔ کیونکہ کسی مسلمان سیّاح نے وہاں جانے کی جرأت ہی نہیں کی۔ اِس لیے اب تک ہم نے اُن غیور مسلمانوں کے ماضی کو اور نہ حال کو جانا ہے۔ انگریز نے اُن کا جو تصوّر ہمارے ذہنوں میں ڈال دیا ہے ہم اُسی کو سچ سمجھ کر سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔ لیکن مصنف شیروں کے اُس کچھار میں گھسنے سے بھی باز نہ آئے۔ وہاں کے پہاڑوں کی سختی اور وادیوں کی خوبصورتی کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ خبر بھی لائے کہ وہ بھی ہم ہی ہیں کوئی غیر نہیں۔

بنگلہ دیش جو کبھی پاکستان تھا۔ اب کیا ہے؟ کس حال میں ہے؟ ہم نے اُن کو بھلا دیا جو کبھی ہمارے بھائی تھے۔ جو ہم خود تھے۔ ہم سب مسلمان تھے۔ مگر اب وہ کون ہیں؟ کس حال میں ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ وہاں کا ہر چہرہ ایک سوال ہے۔ جواب کون دے گا؟ یوں تو ہر تہذیب ایک سوال ہے۔ مغرب ہو یا مشرق۔ کوئی شخص جواب دینا ہی نہیں چاہتا یا شاید کسی کو جواب معلوم ہی نہیں۔ لیکن جواب تو موجود ہے۔

یہ حساب ہوگا۔ ہم سے یہ پوچھا جائے گا کہ اِن ننگے جسموں کو ڈھانپنے کے لیے ہم نے کیا محنت
کی ہے۔ جن کو دیکھ کر تم کہتے ہو۔ یہ انگریز کی بیٹی ہے۔ یہ امریکن کی بیٹی ہے۔ یہ سویڈش کی
بیٹی ہے۔ یہ ناروے کی لڑکی ہے۔ میں اُنہیں آدم علیہ السلام کی بیٹیاں سمجھتا ہوں۔ میں اُنہیں
محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمتِ دعوت تسلیم کرتا ہوں۔ کیونکہ اِن سب کی طرف حضور مبعوث
ہوئے ہیں۔ میں اور آپ اُن کے برہنہ جسم دیکھ کر انجوائے کریں گے تو اُنہیں اللہ کا پیغام
کون پہنچائے گا۔ کافر اور مسلمان میں فرق کیا ہوا۔"

ہم مغرب کی سوچ کو اپنے پاکستانی معیار پر تولتے ہیں۔ خود کو اُن کے سامنے چھوٹا محسوس
کرتے ہیں اس لیے اُن سے نفرت کرتے ہیں اور اُس نفرت کا جواز ڈھونڈتے ہیں لیکن
مصنف اِس سوچ کے قائل نہیں۔ اُن کی فکر کا معیار، تمام معیاروں سے بہت ہی بلند ہے۔
پاکستان ہو یا اقوامِ مغرب، سب کو ایک جج کی طرح تولتے ہیں اور پھر ایک تجربہ کار معالج کی
طرح علاج تجویز کرتے ہیں۔ اِس کا اظہار یوں کیا ہے۔ "آپ کہتے ہیں مغربی اقوام مسلمانوں
کی عزت نہیں کرتے۔ میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مسلمان کی اپنے گھر میں کوئی عزت نہیں ہے۔
اگر مسلمان کی امریکن عزت نہیں کرتے تو مسلمان کی پاکستان میں کیا عزت ہے ...... شاید
اس لیے کہ ہم اُس پائے کے مسلمان رہے ہی نہیں جس پائے کا مسلمان عزت کا مستحق ہوتا
ہے۔" یہ جو ہم دوسری اقوام کے مقابلے میں کمتری کا شکار ہیں تو کیوں؟ مصنف نے
اس کا علاج یوں تجویز کیا ہے۔ "ہمیں اپنا تعارف تلاش کرنا ہے۔ کہ ہم کون ہیں؟
اپنے آپ کو پرکھنا ہے۔ اپنے متعلق صحیح رائے قائم کرنا ہے۔ کہ ہمیں کہاں ہونا چاہیے
اور ہم کس جگہ کھڑے ہیں۔"

کسی نے سوال کیا کہ اگر آپ نے مغرب کی بے حیائی میں حصہ نہیں لینا ہے تو
اُسے دیکھنے کیوں جاتے ہو؟۔ جواب میں لکھتے ہیں "ہم دیکھنے نہیں جاتے۔ ہم اُس کا مقابلہ
کرنے جاتے ہیں۔ اور بحمد اللہ! یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہم نے ایک مہینے میں چودہ ممالک
میں ذاکرین کی جماعتیں پیدا کی ہیں۔ اور یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہر ملک میں غیر مسلموں
کو مسلمان بھی کیا ہے۔"

اِس غیر معمولی سیاح کی سیاحت صرف مغربی ممالک پر ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اپنے
ہی دیس کے اُن علاقوں کی سیاحت بھی شامل ہے۔ جہاں تک اسی ملک کے شہری پہنچ
ہی نہیں پاتے ہیں۔ اگر کوئی سیاح پہنچا ہے تو وہ صحیح عکاسی نہیں کر پایا ہے۔ جہاں کے
متعلق پاکستان کے لوگ صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ اونچے اونچے برفانی پہاڑوں کا
سلسلہ ہے اور بس۔ "دیس اندر پردیس" ملک کے اُس حصے کی عکاسی ہے۔ جہاں کے
بسنے والے انسان ہمارے لیے اجنبی اور پردیسی ہیں۔

"شیروں کا کچھار" اُس علاقے کی سیاحت ہے۔ جسے ہم علاقہ غیر کہتے ہیں۔ اور
ڈاکوؤں اور قاتلوں کی پناہ گاہ سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ وہ ہم سے بہتر اور
کھرے مسلمان ہیں۔ اور برِصغیر میں اسلام پھیلانے میں اُن کا کتنا بڑا کردار ہے۔ کیونکہ کسی
مسلمان سیاح نے وہاں جانے کی جرأت ہی نہیں کی۔ اِس لیے اب تک ہم نے اُن
غیور مسلمانوں کے ماضی کو اور نہ حال کو جانا ہے۔ انگریز نے اُن کا جو تصور ہمارے
ذہنوں میں ڈال دیا ہے ہم اُسی کو سچ سمجھ کر سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔ لیکن مصنف
شیروں کے اس کچھار میں گھسنے سے بھی باز نہ آئے۔ وہاں کے پہاڑوں کی سختی اور وادیوں
کی خوبصورتی کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ خبر بھی لائے کہ وہ بھی ہم ہی ہیں کوئی غیر نہیں۔

بنگلہ دیش جو کبھی پاکستان تھا۔ اب کیا ہے؟ کس حال میں ہے؟ ہم نے
اُن کو بھلا دیا جو کبھی ہمارے بھائی تھے۔ جو ہم خود تھے۔ ہم سب مسلمان تھے۔ مگر
اب وہ کون ہیں؟ کس حال میں ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ وہاں کا ہر چہرہ ایک سوال ہے۔
جواب کون دے گا؟ یوں تو ہر تہذیب ایک سوال ہے۔ مغرب ہو یا مشرق۔ کوئی شخص
جواب دینا ہی نہیں چاہتا یا شاید کسی کو جواب معلوم ہی نہیں۔ لیکن جواب تو موجود ہے۔

اسی تحریر میں قدم قدم پر آپ کو وہ جواب ملے گا۔ اُسی جواب کو لے کر دُنیا کے گوشے گوشے تک، ہر تہذیب اور ہر فرد تک پہنچانے کے لیے ہی تو مصنف نے صحرانوردی اختیار کی ہے۔

اس کتاب میں چند صفحات پر مشتمل سفرنامے بھی ہیں۔ اور "اُبھرتے ڈُوبتے سُورج" کا طویل سفرنامہ بھی اندازِ بیاں کو نہ صرف دلچسپ بلکہ ادب کا ایک حسین شاہکار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

تاج رحیم

ایڈیٹر ماہنامہ "المرشد" لاہور

مدینہ منورہ، ۸، اپریل ۱۹۸۶ء

فاصلے

آج اپریل کی آٹھ تاریخ ہے۔ ابھی ابھی مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام جمعہ سے فارغ ہو کر آئے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہیں ؎

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے
یہ بڑے نصیب کی بات ہے

اللہ کریم کا احسانِ عظیم ہے کہ بہت جلدی جلدی دوبارہ حاضری نصیب ہو جاتی ہے۔ سو میں نے سفر کے حالات لکھنے چھوڑ دیتے ہیں کہ ہر بار ایک ہی جیسے تو ہوتے ہیں کوئی نئی بات ہو تو لکھی جاتے اب یہ کیا لکھتے کہ یوں سیٹ ملی یوں سفر کٹا، یوں آئے یوں گئے۔ مگر اب کے ایک نئی بات ہے جو میں قارئین کرام تک پہنچانا ضروری خیال کرتا ہوں۔ یوں کہ اب کے بچے ساتھ تھے اُن کا ارادہ بھی بدر کی زیارت کا تھا خود مجھے بھی خیال تھا کہ مدت گزری پھر وہاں حاضری نہیں ہو سکی۔ دراصل وقت کی کمی اور جہازوں کے سفر نے مل کر کوئی موقع ہی نہیں بننے دیا۔ اب کے پہلے سے ارادہ لے کر آئے تھے۔ سو ۷، اپریل کو جدہ سے کار پر نکلے اور ظہر کی نماز میدانِ بدر میں ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوتی۔ پہلے غالباً ۷۲ء میں حاضری ہوئی تھی یا ۷۳ء میں۔

اب سال ٹھیک سے یاد نہیں کہ پندرہ سولہ برس درمیان میں حائل ہیں اور برسوں کے فاصلے ہمیشہ یادوں کے نقوش دُھندلا دیا کرتے ہیں۔

خیر! تب یہ سارا میدان خالی تھا۔ شہداء کی قبور پر سفیدی لگی ہوئی تھی، اور دُور پہاڑی کے دامن میں چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ہاں! سڑک پر ہوٹل وغیرہ تھے جو اُس زمانے کے مطابق تھے۔ مگر تھے بہت بڑے بڑے کُھلے کُھلے سے۔ سہ منزلہ، چارپائیاں سی پڑی ہوئی تھیں اور لمبی سُننے والے حُقے۔ مگر اب تو بات ہی دُوسری ہے، ہوٹل بھی جدید بن گئے ہیں بہت سی دوکانیں بھی اور ساتھ پیٹرول پمپ وغیرہ نیز شہر پھیلتا ہُوا سڑک تک آگیا ہے۔ میدانِ بدر جہاں حق و باطل کا سب سے پہلا اور سب سے عظیم معرکہ برپا ہوا تھا درمیان میں رہ گیا ہے اور صرف اتنی جگہ خالی ہے جسے قبرستان قرار دے کر گرداگرد چار دیواری بنا دی گئی ہے۔ ورنہ تو فلک بوس عمارتیں، خوبصورت سڑکیں اور شاندار چوک دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ لیکن اگر دیدۂ دل وا ہو تو یہ سب کچھ کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اصل بات وہ انوارات ہیں جو ان پہاڑوں کو ریگزاروں، میدانوں اور صحراؤں کو نصیب ہیں۔ اصل وہ نشانات ہیں جو نبی کریم ﷺ کے قدم مبارک سے بنے جو آج زمین کے سینے پر چاند بن کر چمکتے ہیں یا وہ روشن نشان صحابہ کے قدوم مبارک نے روشن کر دیئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں رسُول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا،

"اے اللہ! میں سارے کا سارا اسلام کُفر کے مقابلے پر لے آیا ہوں اگر یہ لوگ آج یہاں کھیت رہے تو پھر قیامت تک کوئی جبین تیرے در سے آشنا نہیں ہوگی"۔

یہی وہ میدان ہے جہاں لڑنے کو آسمان سے فرشتے نازل ہوتے تھے اور یہاں وہی شہداء آرام فرما ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کے مبارک قدموں میں

عادتِ انسانی کے کہی جائے مگر عجیب بات یہ ہے کہ چند قدم کا فاصلہ ہے۔ شہداء کی قبور کے ساتھ چھوٹی سی ٹیکری ہے یا مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیر جس پر پتھر پڑے ہیں۔ اس کے ساتھ سے بارش کا پانی گزرتا ہے۔ دوسری طرف بھی چھوٹی سی ٹیکری ہے، مگر اس سے ذرا چھوٹی۔ اُن کے درمیان ہی وہ مشہور گڑھا تھا جو آج بھی دوزخ کی آگ سے بھڑک رہا ہے۔ اور شعلوں کی زبانیں دُور تک لپکتی ہیں جیسے بھُوکے اژدھے پھنکار رہے ہوں۔ میدان وہی ہے، مقام وہی ہے پہاڑ اور ریگزار وہی ہیں۔ پھر قبروں میں تو چند قدموں یا چند گزوں کا فاصلہ ہے مگر حالت میں بہت لمبا فاصلہ ہے کہ ایک طرف جنت نچھاور ہو رہی ہے، نعمتیں ہیں، نور ہے، رحمتیں ہیں اور بخششیں بٹ رہی ہیں، آنے جانے والے بھی جھولی بھر کر لے جا رہے ہیں۔ مگر چند گزوں پر دوزخ کی گرمی ہے تپش ہے، جہنم کے جانور ہیں، عذاب ہیں اور ایذائیں ہیں۔ اور مکے کے بڑے بڑے مشرک سردار چیخ رہے ہیں، چلا رہے ہیں نہ کوئی فریاد رس ہے، نہ داد کرنے والا۔

تو یہ فاصلہ کیوں ہے؟

صرف اس لئے کہ اس فاصلے کا تعلق زمین سے ہے نہ زمانے سے، اس کا واسطہ ان تعلقات سے ہے جو ان لوگوں کو محمد رسُول اللہ ﷺ سے نصیب تھے جن کے تعلقات درُست تھے انھوں نے نہ صرف آبا و اجداد کی رسُومات ترک کیں، پہلوں کا عقیدہ چھوڑا بلکہ گھر بار چھوڑا حتیٰ کہ جان بھی نچھاور کر دی مگر تعلقات پر آنچ نہ آنے دی۔ ان پر اللہ کی جنتیں نچھاور ہو رہی ہیں۔ جنہوں نے باپ دادا کی رسُومات عزیز رکھیں، رواجات عزیز رکھے، ان پر جان دی، اب ان کی فریاد سُننے والا کوئی نہیں جن کی فریاد اللہ نہیں سُنتا، ان کی بات سُننے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

یہ فاصلے تعلقات کے ہیں، معاملات کے ہیں، واسطوں کے ہیں۔ تو کیا ہم

جانیں نچھاور کردیں۔ کٹے ہوئے سینے، پھٹے ہوئے جسم اور خون آلود لباس میں سونے والے یہ لوگ کیا ہیں؟ عظمتوں کے نشان ہیں۔ اسلام کی بُنیاد ہیں۔ یہی وہ قیمتی پتھر ہیں جن پر دین کی عمارت کھڑی ہے۔

بظاہر تو قبروں کے نشان مٹا دیئے گئے ہیں مگر دل کی آنکھ کو دیکھنے سے کون روک سکتا ہے۔ یہ روشنی حکومتوں کے اختیار میں نہیں۔ اِن بادشاہوں کا بس نہیں چلتا یہ خداداد نعمت ہے جسے اللہ کریم دے دیں، اُس سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ سو ہم بھی چاردیواری کے پاس کھڑے دیکھتے گئے۔ ہمارے ڈرائیور صاحب نظر تھے۔ کہنے لگے،

"جہاں جہاں کوئی شہید دفن ہے وہاں یوں نظر آتا ہے جیسے نور کا فوارہ اُبل رہا ہو یا نور کا درخت ہو۔ مگر عجیب بات ہے سب درخت ایک برابر نہیں ہیں چھوٹے بڑے ہیں۔"

اور پھر میں نے ہی اس کی توجہ قلیب بدر کی طرف مبذول کروائی۔ یہ ایک گڑھا تھا جو وہاں قدرتی طور پر بنا ہوا تھا۔ کفار کی نعشیں وہاں پھنکوا دی گئیں اور اُوپر مٹی ڈال دی گئی کہ تعفن پھیل رہا تھا۔ یہی وہ گڑھا ہے جس کے اوپر کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے فرمایا تھا،

"ہم نے اللہ کا وعدہ سچ پایا تو کیا تم نے بھی سچ پالیا یا نہیں؟"

تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا،

"یارسُول اللہ! کیا یہ سُن رہے ہیں؟"

فرمایا، "تم سے زیادہ، مگر جواب نہیں دے سکتے۔"

اس سے مُراد بھی یہ ہے کہ طریقِ عادی پر جواب نہیں دے سکتے کہ ہر کوئی ظاہر کے کانوں سے نہیں سُن سکتا۔ اور مرنے والے وہ بات بھی سُن سکتے ہیں جو قبر پہ بطور

بھی اپنے تعلقات پر نظرِ ثانی نہ کرلیں؟ کیا ہم نے آپ ﷺ کے لئے رسومات کو چھوڑا ہے؟ توہمات کو چھوڑا ہے؟ ناپسندیدہ عادات کو چھوڑا ہے؟ اگر ایسا نہیں تو کہیں یہ فاصلہ ہمارے تعلقات میں نہ آجائے اور خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر کوئی دوسری ہستی ہمارے لئے بھی امداد کا باعث نہ بن سکے گی۔

سو ہمیں عقائد میں، اعمال میں، سوچ میں، کردار میں، فاصلوں کو کم ہی نہیں کرنا مٹانا ہوگا۔

اللہ کریم ہمیں اس کی توفیق ارزاں فرمائیں!

مکہ مکرمہ، ۱۰ اپریل ۱۹۸۸ء

انجام

کل صُبح مسجدِ نبوی شریف میں حاضری دی اور سلام عرض کرنے کے لئے روضہ اطہر کی طرف بڑھا مگر یہ سوچ کر کہ بھیڑ ذرا کم ہولے، بیٹھ گیا۔ احباب بھی ساتھ تھے آدھ پون گھنٹہ بیٹھے ہوں گے کہ رش تقریباً ختم ہوگیا ہم آگے بڑھے تو روضہ اطہر کے سامنے اصحاب صُفہ کے چبوترے کے قریب پہلے محراب کے اندر ایک آدمی فوت ہو چکا تھا۔ لوگ جمع تھے جنہیں شُرطے منتشر کر رہے تھے۔ شوق پیدا ہُوا کہ اُس خوش نصیب کی زیارت ہی ہوجائے جس نے درِ رسُول اللہ ﷺ پر جان دی ہے پہلے سُن

رکھا تھا کہ شہیدی نے یہ شعر کہا تھا ؎

تمنا ہے درختوں پر تیرے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

تو اس کا یہ شعر اس درجہ مقبول ہُوا کہ زیارتِ نبوی کو حاضر ہُوا تو جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ سُبحان اللہ! کہنے والے نے کس درد سے کہا ہوگا مگر سُننے والے کے کرم کی بھی انتہا نہیں۔ سو ہم شرطوں کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھے مگر یہ کیا؟ مرنے والا اس رُخ پہ پڑا تھا کہ دونوں پاؤں اصحابِ صُفہ کے چبوترے کی طرف تھے خالی ہاتھ دونوں اطراف کو پھیلے ہوئے تھے اور مُنہ بائیں طرف مُڑا ہوا تھا۔ حالانکہ قبلہ اس کے دائیں رُخ تھا۔ مرنے سے پہلے گوراچِٹا تھا مگر اب چند لمحوں میں چہرہ سیاہ سے سیاہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ دل دہل گیا، خُدایا! یہ کیسا انجام ہے؟ یہ کس حال کے آثار ہیں اور کس راستے کے نشان ہیں۔

ہم آگے بڑھ گئے: ریاض الجنۃ سے گزر کر جالی مُبارک کے سامنے گئے عبدالرب ساتھ تھا، وہ بھی اپنی بساط کے مطابق انوارات کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے مگر کمسن ہے فرق سمجھنا اُس کے بس کی بات نہیں۔ ہاں! یہ ضرور جان رہا تھا کہ مسجدِ نبوی آپ ﷺ کی کہاں تک تھی اور بعد میں کہاں سے بڑھائی گئی، حضور اکرم ﷺ کا محراب کونسا تھا۔ حنانہ ستون کے بارے خاص طور پر پوچھ رہا تھا۔ پھر ہم چلتے چلتے جالی مبارک کے سامنے پہنچے تو عجیب بات ہوئی بتایا کہ یہاں آپ ﷺ تشریف رکھتے ہیں، تو کہنے لگا، ابو! مجھے دونوں قدم مبارک نظر آ رہے ہیں بہت سفید ہیں، جیسے روشنی کے بنے ہوتے ہوں۔" یہ بھی ان کا کرم ہے ورنہ اس کی عُمر ہی کیا ہے ابھی پورے سات سال کا بھی شاید نہ ہوگا۔ بھلا رُخِ انور کی تاب کہاں لا سکتا ہے۔

ایسے ہی شیخین رحمہم اللہ تعالےٰ کی خدمت میں سلام عرض کیا اجازت چاہی اور واپسی کا سفر شروع ہوا۔ تو جدہ تک جہاز سے تھا۔ جدہ آرام کیا، عصر کے بعد روانہ ہوئے شام تک عمرہ سے فارغ ہو سکے پھر احباب کے ساتھ ذکر نصیب ہوا۔ الحمدللہ! ہر جگہ ایسے ہی لوگ مہیا فرما دیتے ہیں جو صرف اللہ کے لئے دوستی رکھتے ہیں اور بس رات آرام کیا۔ صُبح ذکر کے بعد کچھ دیر حرم شریف میں بیٹھے کہ بچوں کا اصرار تھا حجرِ اسود کو بوسہ دیں گے۔ سو جب کچھ بھیڑ کم ہوئی، لوگ ناشتے وغیرہ کے لئے چلے گئے تو ہم نے طواف کیا اور حجرِ اسود کو بوسہ دینا بھی نصیب ہوا، بچوں کو بھی۔ اور مُلتزم پہ دعا مانگنے کی جگہ بھی مل گئی بشیر بھائی بھی بچوں سمیت آئے ہیں سو اہلیہ کو ساتھ مل گیا۔

واپس آئے، ناشتہ کیا اور زیارات کے لئے چلے گئے۔ اصل میں یہ عمرہ تھا ہی زیارات کے لئے کہ اہلیہ حج پر تو زیارات کر نہ سکی تھیں۔ نہ اس وقت ایسا کرنا ممکن ہی ہوتا ہے۔ سو پھر اس کے لئے عمرہ کی سعادت نصیب ہو گئی۔

الحمدللہ! ہم آج صُبح کار پہ نکلے ساتھی ساتھ دوسری گاڑی پہ تھے۔ سب سے پہلے غارِ ثور کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے تقریباً ایک تہائی پہاڑ تک موٹر چلی جاتی ہے اس لئے یہیں کہ زائرین کی سہولت کے لئے سڑک بن گئی ہے۔ وہاں بجلی کے بڑے بڑے پول نصب کئے جا رہے ہیں جہاں تک کمپنی کی گاڑیوں کو بہر حال جانا ہوتا ہے۔ سو ہماری کاریں بھی اس کھمبے تک چلی گئیں وہ ایسی جگہ تھی جہاں سے وہ بڑا پتھر بھی نظر آ رہا تھا جس کے نیچے غارِ ثور ہے اور دوسری طرف کا وہ پہاڑی سلسلہ بھی جس طرف نبی اکرم ﷺ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کاندھوں پہ سوار ہو کر وہاں تک پہنچے۔ کچھ تو احباب نے پوچھا، گھر والوں نے سوال پُوچھے اور کچھ خود میرے دل، میرے ضمیر کے سوالات تھے۔ گھر والوں اور دوستوں کو سوالات کے جوابات تو میں

نے دیئے، اُنھیں بتایا، اُنھیں سمجھایا مگر اے میرے دل! مجھے کون بتائے گا؟ میرے سوال کا جواب کہاں سے آئے گا؟ میں پاگل ہوں یا ہو رہا ہوں کہ ابھی اتنا ہوش باقی ہے جس سے اپنے پاگل پن کا احساس ہے۔

دوستوں نے گھر والوں نے وہ حالات اور واقعات پوچھے جو تاریخ کا حصہ ہیں جو آپ سب جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے کیسے ہجرت کی؟ کعبہ شریف تشریف لائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ آپؓ کی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ستو وغیرہ اپنا دوپٹہ پھاڑ کر باندھ دیئے اور شہر سے اس پہاڑ کے ساتھ ساتھ تشریف لائے جو اس چھوٹے سے ریت کے میدان سے گزرگاہ کو ہلا دیتا ہے یہاں تک کہ پاؤں مبارک زخمی ہو گئے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کاندھوں پر اُٹھایا اور پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا پھر اگلی چوٹی پھر اگلی چوٹی پھر اگلی چوٹی اور پھر غالباً آخری بلند ترین چوٹی جس پر غارِ ثور تھا تک پہنچے۔ پہلے غار کو صاف کیا جہاں جہاں کوئی سوراخ نظر آیا اپنی قبا مبارک پھاڑ کر اس کو بند کر دیا، اندر جگہ درست کی اور حضور اکرم ﷺ کو اندر بلا لیا گود میں سر مبارک رکھ لیا آپ ﷺ نے آرام فرمایا۔

اسی جگہ آپ رضی اللہ عنہ کا غلام بکریاں لاتا اور دودھ دھو کر پیش کرتا، نیز مکہ کی خبریں عرض کرتا۔ پھر اسی جگہ تلاش کرنے والے بھی پہنچے، غضب کے کھوجی تھے، غار کے مُنہ تک لے گئے مگر حفاظت کرنے والے کی بے نیازی دیکھئے، مکڑی کو فرمایا، مُنہ پر جالا تن دو یعنی یہ اتنے کمزور اور حقیر ہیں کہ انھیں روکنے کے لئے کسی فوج کی ضرورت نہیں کوئی شیر بٹھانے کی ضرورت نہیں کسی اژدھے کی ڈیوٹی لگانے کی حاجت نہیں، نہ فرشتوں کو کھڑا کرنا ضروری ہے۔ بس اُن کے لئے مکڑی کا جالا کافی ہے۔ واہ میرے مالک! تیری شان۔ کائنات کی عظیم ترین نعمت کی حفاظت اس کے بدترین دُشمن

سے کس طرح فرمائی۔ یہ تو وہ باتیں تھیں یا ان باتوں کا خلاصہ جو میں نے احباب سے عرض کیں۔ اب میرا سوال خود اپنے سے بھی اور آپ سے بھی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قبل بعثت بھی بہت زیادہ عزت تھی، خاندانی وجاہت کو اس میں ضروری دخل تھا۔ اور آپ کے ذاتی اوصاف اس کا بہت بڑا سبب تھے حتیٰ کہ اہلِ مکہ آپ ﷺ کو صادق، امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ جھگڑوں کے فیصلے آپ ﷺ سے کرواتے، حجرِ اسود کے نصب کرنے پر بہت بڑے فتنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ مگر آپ ﷺ کی دانشمندی اور پیغمبرانہ بصیرت ہی کام آئی تو پھر آپ ﷺ سے اس قدر برہم کیوں ہوئے، اتنے بگڑے کیوں؟ اس قدر دشمنی کس لئے کہ ہجرت پہ مجبور ہونا پڑا، پتھر کھانے پڑے، طعنے سُننا پڑے، ایذا برداشت کرنا پڑی، جنگیں لڑنا پڑیں، رُخِ انور زخمی ہُوا، دندان مبارک شہید ہوئے، خدام نے قدموں میں جانیں دیں۔

آخر یہ سب کس لئے؟ ایسا کیوں ہوا؟

صرف اس لئے کہ آپ ﷺ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا، اللہ کی کتاب پیش فرمائی۔ ان کی رسومات، ان کے عقائد، ان کے اعمال کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ بتوں کی خدائی کا نہ صرف انکار فرمایا بلکہ اسے چیلنج فرمایا اور اس پر اہلِ مکہ کی آپ ﷺ سے ٹھن گئی۔

مگر ٹھہریئے! کیا مکہ والوں نے صلح کی کوشش بھی کی یا صرف جنگ کی باتیں کرتے رہے۔ نہیں! صلح کی بہت کوشش کی، اس حد تک کہ نہ آپ ہمارے خداؤں کا انکار کریں نہ ہم آپ سے چھیڑ کرتے ہیں بلکہ اس حد تک گئے کہ اگر چاہو تو عرب کی حسین ترین عورت آپ کو پیش کر دیں۔ دولت چاہو تو ہم اتنی جمع کر دیں کہ عرب میں کسی کے

پاس نہ ہو۔ حکومت چاہو تو ہم آپ کو بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔ مگر جانتے ہو آپ ﷺ نے کیا جواب اِرشاد فرمایا، فرمایا تم زمین کی نعمتوں کی باتیں کرتے ہو، اگر تم میرے ہاتھ پر چاند اور دوسرے ہاتھ پر سُورج لا کر رکھ دو تو بھی اپنے ربّ کا پیغام ضرور پہنچاؤں گا۔ تب بات جنگ تک پہنچی پھر جو ایذا آپ ﷺ نے برداشت فرمائی، اس کے لِئے آپ ﷺ کا یہی ارشاد کافی ہے کہ جس قدر ایذا مجھے دی گئی، کسی نبی اور رسُول کو نہیں دی گئی۔ آپ ﷺ کے ساتھ ایمان لانے والے آپ ﷺ کے جاں نثاروں نے جو تکالیف برداشت کیں بیان سے باہر ہیں۔ اور پھر اندھیری رات میں ہر قبیلے کے جوان نے آپ ﷺ کے مکان کو گھیر لیا کہ قتل کئے بغیر نہ ٹلیں گے۔ بنو ہاشم کس کس سے انتقام لیں گے۔ آپ ﷺ نکلے کعبۃ اللہ سے ملاقات فرمائی، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیا۔ رات کی تاریکی، دشمن کا خوف اور کائنات کی نعمت کاندھوں پہ ہے۔ حتیٰ کہ غار میں ہیں تو دشمن دروازے تک پہنچے۔ یہ سب کچھ آپ ﷺ نے اس اسلام کے لِئے برداشت فرمایا، جس پر عمل ہمارے لِئے مشکل ہو رہا ہے۔

آج ہم مغربی تہذیب سے مرعوب انگریز بن کر طواف کرنے بھی آتے ہیں، نماز کے لِئے اُٹھنا دوبھر ہے، زکوٰۃ کا ہم اہتمام نہیں کرتے، رمضان سے ہمیں لگاؤ نہیں وضع میں نصاریٰ، معیشت میں یہود اور رسُومات میں ہندو ہمارے پیشوا ہیں۔

میرا دل، میرا ضمیر مجھ سے پُوچھ رہا ہے کیا تم اس حال میں مرو گے تو کہاں جاؤ گے؟ کس کے پاس پہنچو گے؟ تمہارا انجام کیا ہوگا؟ اور میرے پاس کوئی جواب نہیں حیلے ہیں، بہانے ہیں، باتیں ہیں مگر جواب نہیں۔ آپ کے پاس ہے تو بتا دیں کہ میں دل کو ضمیر کو خاموش کر سکوں، اسے سمجھا سکوں۔ کاش! کوئی بتا سکے ہمارا انجام

کیا ہے؟ کیا ہماری سمت بدل جائے گی؟ رُخ مڑ جائے گا۔ رنگت سیاہ ہو جائے گی اور جدھر سر نثار ہوتے ہیں، اُدھر پاؤں ہوں گے۔

اللہ کریم ہمیں اس انجام بد سے بچالے، تجھے سب توفیق ہے۔ ہمارے گناہ معاف فرما اور اپنے نبی ﷺ کی اطاعت نصیب فرما، آمین۔

ایک دوسرے سے متنفر کرتے ہیں۔ اور مساجد کے اندر ایک دوسرے کو ختم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں مساجد میں لڑائی ہوتی ہے ایک دوسرے کی ڈاڑھیاں نوچی جاتی ہیں، ڈنڈوں سے سر کھل جاتے ہیں تب برطانوی پولیس مداخلت کرتی ہے اور بیچ بچاؤ کراتی ہے تو کئی بزرگوں کے سر سے خون ٹپک رہا ہوتا ہے۔ ہاتھ میں دوسرے مسلمان کی ڈاڑھی کے بال ہوتے ہیں اور احتجاج کر رہے ہوتے ہیں کہ پولیس جوتے پہن کر مسجد میں داخل ہوگئی اور مسجد کی توہین کر رہی ہے۔

بیچارے کس قدر سادہ ہیں کوئی ان سے پوچھے کہ جو داڑھی آپ نے نوچی ہے۔ بھلا کس کی سنت تھی۔ کیا یہ توہین نہیں، اور پولیس کو مسجد میں کون لایا؟ نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کا مفہوم ہے والدین کو گالی مت دو۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ کوئی بدبخت والدین کو گالی بھی دے گا؟ فرمایا جو کسی کو گالی دیتا ہے اور جواباً وہ اس کے والدین کو گالی دیتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ خود اس نے گالی دی۔ اب سوچئے اس حدیثِ پاک سے صاف واضح ہے کہ لڑائی کرنے والے پولیس کو مسجد میں لانے کے ذمہ دار ہیں یا نہیں مگر وُہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک مولانا خود کو موحد اور دوسروں کو مشرک قرار دے کر اپنے معتقدین یا اپنے مقتدیوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان مشرکوں کو مسجد سے نکال دو اللہ تم سے تب راضی ہوگا۔ ورنہ تمہاری عبادت" قبول نہ ہوگی ادھر دوسری طرف کے مولانا کا فتویٰ ہوتا ہے کہ یہ گستاخانِ رسالت ہیں۔ ظاہر ہے ایسا شخص مسلمان تو نہ رہے گا پھر حکم ہوتا ہے جب تک ان کو مساجد سے نکال باہر نہیں کرتے ہو تمہارا صلاۃ و سلام بھی قبولیت سے مشرف نہ ہوگا۔ بس جھڑپ ہو جاتی ہے مساجد کو تالے لگتے ہیں۔ مقدمہ عدالت میں جاتا ہے اور جو پارٹی جیت جاتی ہے۔ اس کا مولوی فاتح کہلاتا ہے۔

مَیں یہاں ایک فاتح اعظم صاحب کی ادھوری داستان ضرور عرض کرنا چاہوں گا جو کبھی سرگودھا میں ہوا کرتے تھے اور ایک بہت بڑی مسجد کی بنیاد رکھی تھی جو آج بھی بفضل اللہ

شہنشاہوں اور فاتحین کی جولانگاہیں

یہ چند سطور میرے ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں اور خالصتاً میری ذاتی رائے کی عکاسی کرتی ہیں۔ لہٰذا قاری ماننے پہ مجبور نہیں کہ ہر انسان کو آزاد رائے رکھنے کا حق ہے۔

عنوان سے تو پتہ چلتا ہے کہ مَیں کسی عہدِ رفتہ کی کہانی لکھنے چلا ہوں۔ مگر ایسا ہرگز نہیں میرا مقصد آپ کو دَورِ حاضر کے فاتحین اور شہنشاہوں، نیز داتاؤں اور مشکل کشاؤں کے اِن حالات سے روشناس کرانا ہے جن کا تجربہ ناچیز کو برطانیہ، امریکہ، کینیڈا، ڈنمارک اور ناروے وغیرہ ممالک میں ہوا۔ میرے اندازے کے مطابق ملک میں بہت کم لوگ ان حقائق سے واقف ہوں گے۔ بغیر کسی پر طنز کئے اور بلا تنقید جو دیکھا وہ عرض کروں گا اور یہ اجازت چاہوں گا کہ اس صورتِ حال کے بارے اپنی رائے بھی پیش کروں، وما توفیقی الا باللہ۔

مَیں گزشتہ ماہ یعنی جولائی ۱۹۸۸ء کی پانچ تاریخ کو لندن پہنچا وہاں سے بریڈفورڈ گیا آسٹرانڈرلین جمعہ پڑھایا۔ گلاسکو جانا ہوا اور پھر لندن سے نیویارک چلا گیا۔ میرا مختصر قیام ۵ سے ۱۳ جولائی تک تھا۔ وہاں علماء و پیرانِ عظام سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے اور مسلمانوں کو کس قسم کی تربیت یا برکات حاصل ہو رہی ہیں۔ یہ بڑی دردناک کہانی ہے اکثر و بیشتر علماء نے برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بانٹ رکھا ہے جن میں کچھ تو اسلام کے نام پر سیاسی کام بھی کرتے ہیں اور کچھ بغیر سیاست کے صرف مذہب کے نام پر لوگوں کو

پوری شان و شوکت سے ایستادہ ہے۔ جہاں بھی کمپنی باغ ہوا کرتا تھا۔ لاکھوں روپے جمع ہوئے، بنیادیں بھری گئیں۔ چند فٹ دیواریں بھی اٹھیں اور پھر لڑائی ہو گئی کس کس میں ہوئی؟ مولانا اور ان کی کمیٹی کے ارکان میں غالباً، چندے پہ ہی بات بڑھی تھی جو اس وقت لاکھوں میں تھا جب پاکستان میں لاکھوں کی بات کرنا آسان نہ تھا۔ مسجد بند ہو گئی مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت رہا۔ مدتوں کیس چلا مگر وہ چندہ پھر مسجد کو نہیں ملا جس کے پاس تھا اسی کا ہو گیا۔ مسجد محکمۂ اوقاف نے لے لی کہ ساتھ دکانیں بہت تھیں مولوی صاحب برطانیہ چلے گئے۔ خوش الحان بھی تھے، شعر بھی اچھے سے اچھے ازبر، لوگوں کو پسند آئے، ٹھہرا لیے گئے۔ اب سوال اٹھا کہ بچے منگوائے جائیں۔ ویزہ لینا چاہا تو حکومتِ برطانیہ نے شرط عائد کر دی کہ آمدن کم از کم ایک ۱۷۰ صد پونڈ ہونی چاہیے تا کہ اپنے کنبے کی کفالت کر سکے اور غالباً وہاں آمدن ہفتہ وار شمار ہوتی ہے۔ یہ کوئی پانچ ہزار کے قریب روپے بنتے ہیں۔ اتنی تنخواہ مولوی صاحب کو کون دے سکتا تھا۔ آخر طے پایا کہ مسجد کمیٹی لکھ کر دیدے کہ ۱۷۰ پونڈ تنخواہ دے گی۔ چاہے دیتی وہی رہے جو پہلے سے مقرر ہے، جو بہت کم تھی مگر قانونی تقاضے پورے ہو جائیں۔ لہٰذا یہ سب کچھ ہو گیا اور حضرت کے بچے بھی چلے گئے۔ اگلا قدم گیارہویں شریف سے شروع ہوا جن لوگوں نے چندے میں پونڈ نہ دیئے وہ وہابی کر کے نکالے گئے اور یوں پہلی مرتبہ اس قصبے میں مسلمانوں میں باہم جھگڑے کی بنیاد پڑی جو اب تک بدستور چل رہی ہے اب سولہ سال بعد مولوی صاحب نے جی بھر کر لوٹنے کے بعد مسجد کمیٹی پر دعویٰ کر دیا ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھ کر دیا تھا اس کے مطابق تنخواہ نہیں دی بلکہ پچاس ساٹھ پونڈ دیتے رہے مجھے سولہ سال کا بقایا دلوایا جائے اور خود امریکہ تشریف لے گئے نیو جرسی کی مسجد میں تشریف فرما تھے کہ راقم کو حاضری نصیب ہوئی تو آٹھ یا دس مسلمان جمع ہوئے ہوں گے جنھیں مولانا خطاب فرما رہے تھے۔ "او! نبی کو اپنے جیسا بشر سمجھنے والو"۔ اور اشتہار لگا ہوا تھا "شہنشاہِ خطابت فاتح اعظم"۔ واقعی بہت بڑے فاتح ہیں کہ پاکستان سے شروع ہو کر امریکہ تک سینکڑوں مسجدیں فتح کر لیں۔ یہاں آ کر پتہ چلانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ سرگودھا والی مسجد کے پہلو میں اوقاف کی ملی بھگت سے جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور فتح کے مالِ غنیمت سے بہت شاندار مارکیٹ بنا رہے ہیں۔

یہ ایک نمونہ ہے ورنہ ہر فاتح کسی نہ کسی مسجد کا فاتح ہے اور شہنشاہ باتوں کا شہنشاہ ہے۔ رہی سہی کسر پیرانِ عظام پوری فرما رہے ہیں صرف دولت پر بس نہیں کرتے بلکہ عزت و آبرو بھی ان کا کھلونا ہے گلاسکو سے ایک پیر صاحب مرید کی بیوی لیکر پاکستان چلے آئے تو سادہ لوح مسلمان نے لکھا۔ مجھے پتہ ہے آپ نے یہ حیلہ اس لیے کیا ہے کہ ہم آپ کا دامن چھوڑ دیں، مگر ہم نہ چھوڑیں گے ورنہ پھر ہماری مشکلات کا حل کہاں سے آئے گا اور مصائب میں کس کی پناہ لیں گے آپ اگلے سال بھی حسبِ سابق ضرور آیئے" چنانچہ سال بعد تشریف لے گئے اور عقیدت مند کی اہلیہ محترمہ کو بھی واپس ساتھ لے گئے۔

یہ ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو ان لوگوں کا ہے جو دیندار ہیں۔ نیک ہیں مگر یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا بھی اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹائے غالباً انانیت کا شکار ہو چکے ہیں اور سادہ ہیں۔ نہ حالات کی خبر ہے نہ تجزیہ کرنے کا شعور۔ راقم کو مین ہیٹن میں ایک مسجد کے خطیب نے دعوت دی وہاں تبلیغی جماعت کے اکثر دوست تشریف لے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مولوی صاحب گئے ہوئے تھے وہ بروک لین میں مقیم تھے۔ انہیں پتہ چلا تو فوراً پہنچے مگر انگریزی سے نابلد تھے لہٰذا کوئنز سے مترجم منگوایا اور جیسے نماز ختم ہوئی نوافل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے، عشا تک دم نہ لیا، مقصد صرف یہ تھا کہ کوئی اور نہ بیان نہ کر سکے۔ اپنا کیا ہے ہم تو انہیں کو سنتے رہے مگر دکھ ضرور ہوا اس بات کا نہیں کہ مجھے بولنے کا موقع کیوں نہیں دیا بلکہ اس بات کا کہ انہیں بولنا نہ آتا تھا۔

وہاں سامنے وال سٹریٹ ہے جہاں دنیا کی معیشت کنٹرول ہوتی ہے۔ وہاں مولانا صحابہ کی عظمت یوں بیان کر رہے تھے کہ اصحاب صُفّہ میں سے ایک صحابی صلوٰۃ حاجت کے لیے جنگل کو گئے تو دو چوہے لڑ رہے تھے انہوں نے چادر پھینکی ایک چوہا بھاگ گیا مگر ایک نیچے آگیا اور پکڑا گیا دوسرا بل سے باہر آیا اور منت سماجت کرنے لگا کہ میرے بھائی کو چھوڑ دیں۔ پہلے لڑ رہا تھا اب غمخوار بن گیا مولوی صاحب نے ہاتھ باندھ کر دکھائے کہ اس طرح ہاتھ باندھ کر عرض کر رہا تھا مگر صحابی نہ مانے وُہ بِل میں چلا گیا اور ایک اشرفی لے آیا وُہ پھر نہ مانے، وُہ چوہا پھر گیا ایک اور اشرفی لے آیا۔ وہ نہ مانے۔ مترجم انگریزی میں بتاتا جا رہا تھا مگر یہاں پہنچ کر وُہ بھی کہنے لگا۔ کہ یہ بھلا کہتا ہے چوہا پھر گیا یعنی مجھے اس بات کا ذمہ دار نہ بنا لینا یہ کہتا ہے لہٰذا سترہ یا اٹھارہ اشرفیاں لایا تب بھی وُہ نہ مانے، پھر گیا اور خالی گتھی لے آیا کہ اب ختم ہو چکی ہیں تب جا کر انہوں نے چھوڑا۔ ایک طرف تو دنیا د مافیہا کو چھوڑ کر صُفّہ میں رہائش پذیر تھے دوسری جانب چوہوں پر اتنی سختی فرمائی پھر انہوں نے یہ قصّہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا تو فرمایا یہ اللہ کا رزق تھا۔

یہ معاشی حل تجویز کیا جا رہا تھا اور یہ صحابہ کا کردار بیان ہو رہا تھا جنھوں نے بڑی بڑی سلطنتیں تہہ و بالا کر کے عدل و انصاف قائم کر دیا۔ روم و ایران کے فاتحین کو چوہوں سے رزق چھینتے دکھایا جا رہا تھا اور ہم یہ سب کچھ سُن رہے تھے اللّٰہم سب کو معاف فرمائے اور ان سادہ لوح لوگوں کو مسلمانوں کی ہدایت کا سبب بنائے۔

اچھے لوگ بھی ملے، سرگودھا کے کچھ لوگ تبلیغی دورہ پر تھے پڑھے لکھے اور جہاں دیدہ اگر ایسے ہی لوگ ان ملکوں میں جائیں تو بہت فائدہ ہو سکتا ہے مگر تبلیغ کے اکابرین کی اپنی پالیسی ہے کہ سندھی جاننے والے سرحد اور پشتو بولنے والے کو سندھ روانہ فرما دیتے ہیں۔ شاید یہ ان کا طریق تربیت ہو۔ بہر حال یہی حال کینیڈا میں نظر آیا۔ عید پر تفریق رمضان پر جھگڑا یا رسول اللہ کہنا ہے۔ ہم نہیں کہنے دیں گے اور ساتھ پیر صاحب کا بوجھ فالتو اٹھانا پڑ گیا۔ یہ کیوں؟ یہ صرف مشکلات کا حل ہے اگرچہ بجائے خود ایک بہت بڑی مشکل ہے۔ ڈنمارک میں چند مسلمان شراب بیچتے ہیں۔ بھئی یہ کیوں؟ جی یہ ہمارے حضرت نے فرمایا ہے تم بوتل بیچ سکتے ہو۔ اس کے اندر خواہ کچھ بھی بند ہو تمہیں کیا ہاں کھول کر مت بیچنا کہ شراب حرام ہے۔ "لوکر لوگل" مسلمان کا ایک بہت پڑھا لکھا طبقہ ان حرکات سے متنفر ہو کر مذہب ہی سے بغاوت کر چکا ہے۔ آئندہ نسل ویسے ہی مغرب میں جذب ہونے کو ہے کہ تعلیم ان کی، غذا ان کی، معاشرہ ان کا وہ سارے عمل سے نکل کر مشرقی اقدار کے حامل بنیں گے؟ یہ خود فریبی ہے ہاں بعض جگہوں پر نیک دل مسلمانوں نے کچھ تنظیمی کام کیا ہے۔ جس میں مساجد کا اہتمام درسِ قرآن اتوار کو بچوں کو دینی تعلیم اور یہ سارا کام رضا کارانہ طور پر ہوتا ہے لوگ اپنا اپنا کام کرتے ہیں تنخواہ وہاں سے لیتے ہیں وقت مساجد کو بھی دیتے ہیں۔ شاید اس طرح کوئی بہتری کی سبیل پیدا ہو جائے۔

ساتھ ہی ساتھ مختلف جماعتیں بھی سرگرم کار ہیں جن کے اپنے مخصوص سیاسی نظریات ہیں اور انہیں اپنے سیاسی نظریات کی تبلیغ کے لیے ان مسلمانوں سے پاؤنڈ اور ڈالر چاہئیں۔ اس سے زیادہ ان کو مسلمانوں کی بھلائی سے کوئی دلچسپی نہیں ہاں لوگوں کو بانٹنے اور تقسیم کرنے میں ان کا بھی ایک خاص کردار ہے۔

آپ حیران ہوں گے میرے پاس ناروے کے کچھ لوگ ٹھہرے جو پاکستان کی سیاحت پر تھے اللہ نے انہیں اسلام سے نوازا وہ شمالی ناروے سے تعلق رکھتے تھے وہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے ان کا خیال تھا کہ ناروے میں

وہ پہلے مسلمان ہیں انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی اسلام کا نام نہیں سنا چنانچہ اب
بھی وہ یہاں سے مسائل کا حل طلب کیا کرتے ہیں اس بار ناروے سے پتہ کروایا
تو اپنے پیرانِ عظام میں سے ایک بہت بڑی شخصیت تشریف فرما تھی اور سرکاری
اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کے علماء و مشائخ نے اٹھانوے تنظیمیں وہاں رجسٹرڈ
کروا رکھی ہیں جنہیں وہاں کی حکومت سالانہ امداد مہیا کرتی ہے جن میں سے ایک
مولوی صاحب جو ذرا کم حصہ پاتے ہیں پاکستانی سکے کے اعتبار سے چار لاکھ روپے
سالانہ وصول کرتے ہیں مگر نہ وہاں اللہ کا نام لیتے ہیں اور نہ یہاں کسی چیز پر ظاہر
ہونے دیتے ہیں۔ مَیں تو یہ سوچتا رہا کہ جب یہ بوڑھے مرجائیں گے تو لوگ مغرب
کی تہذیب میں جذب ہو جائیں گے تو ان کی خدمت کون کرے گا اللہ کے لیے
نہ سہی دین کے لیے نہ سہی کچھ اپنی ضرورت کے لیے سہی مگر ان حضرات کو بھی سوچنا
چاہیے ہیں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ میرا یہ یقین ہی نہیں عقیدہ ہے
کہ علماء و مشائخ میں ہی ایسے عالی ہمت، عالی نسب لوگ موجود ہیں اور رہیں گے
جو تعلیماتِ نبوی اور برکاتِ نبوی کے امین ہیں اور وہی ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں
لیکن میدان میں اکثریت ان احباب کی ہے جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے جو بار بار صرف
مساجد کو فتح کرتے ہیں۔ جو دوسروں کو گیارہویں شریف دینے کے فضائل بتلاتے ہیں
مگر خود صرف لیتے ہیں۔ زندگی بھر دینے کی نیکی کبھی نہیں کرتے جو کوئی کام کیے بغیر
ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ لوگوں کو رزقِ حلال کی تلقین کے ساتھ خود بھی حلال کمانے
کا تکلف نہیں کرتے۔

اسلام ایک عالمگیر حقیقت کا نام ہے جو ہر مسلمان کی پوری زندگی کا نصاب عطا
فرماتا ہے ہمیں خود اسلام کو پڑھنا اور سمجھنا ہو گا۔ ہمیں خود اس کو اپنانا ہو گا کہ یہ صرف
مولوی کا مذہب نہیں، صرف پیر کا مذہب نہیں، یہ میرا، آپکا اور ہم سب کا مذہب ہے

اور ہم سب پر اس کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

علماء کی فضیلت مسلّم مگر اس وقت جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات سے
ہمیں بہرہ ور فرمائیں مشائخ کی عظمت بسر و چشم قبول مگر اس وقت جب وہ برکاتِ نبوی سے
ہمارے سینے روشن کریں۔

اگر ان حضرات سے یہ فیوضات حاصل نہ ہوں تو دوسرا کوئی فائدہ ان کی ذات
سے وابستہ کرنا اسلام نہ ہو گا بلکہ عین ممکن ہے خلافِ اسلام کوئی قدم یا عقیدہ قرار پا لے
ہماری بدقسمتی یہ بھی ہے کہ نیک اور دیندار طبقہ نے معاشرے کی بے راہ روی
سے منہ موڑ کر عزلت کی زندگی اختیار کر لی ہے۔ مگر کیا یہ معاشرے کی خرابی کا علاج ہے؟
یا اسے مزید کھل کھیلنے کا موقع دینے کے مترادف ہے؟ لہٰذا عام مسلمانوں سے میری
دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ صرف اسلام کو اپنائیں، خالص اور کھرا اسلام، تمام رسومات
اور اوہام سے پاک اسلام ایسے لوگوں کی مجلس اختیار کریں جہاں سے علم کا نور میسر ہو
قلبی روشنی حاصل ہو۔ اگر کہیں سے یہ دونوں نعمتیں یکجا ملیں تو بقول عارفِ رومی

ع چنیں مردے کہ یابی خاکِ او شو
اسیرِ حلقۂ فتراکِ او شو

اللہ کریم ہماری عاجزانہ کوششوں کو قبول فرمائے،
(آمین)

فقیر محمد اکرم عفی عنہ
دارالعرفان۔ ۸۸،۱۰،۱۱

لندن سے ایک خط

لندن
۶-۶-۸۸

عزیزم صدیق صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ! آپ کا فون دوبئی میں ملا تھا، جواب لندن سے دے رہا ہوں۔ کہ اس وقت میں روانگی کے لئے تیار کھڑا تھا اور کچھ لکھنے کا وقت نہ تھا۔ آپ نے بعنوان "ذکر الٰہی" چند سطور لکھنے کو کہا ہے جو تعارف کا کام دے سکیں۔ آپ کے فون کے جواب میں حاضر ہیں۔ اگر "جنگ" کو دے دیں۔ تو مجھے خوشی ہوگی، اس میں ہر ہفتہ امارات کا صفحہ مختص ہوتا ہے۔

جہاں تک ذکر الٰہی کی فضیلت و اہمیت اور اس کی ضرورت کا تعلق ہے، اس کے لئے قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد جو ان کی معروف تفسیر "تفسیر مظہری" میں ہے، کافی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ذکر الٰہی ہر مسلمان مرد و عورت پر واجب ہے۔ اُن کے اس ارشاد کی بنیاد قرآن حکیم کے وہ متعدد ارشادات ہیں جو ذکر الٰہی کے متعلق عبارات

قرآنی میں ہیروں کی طرح جڑے ہوئے ہیں اور اس کثرت سے ہیں کہ دورِ اول میں تو کسی کا ذکر الٰہی سے بے رُخی برتنا قرینِ قیاس ہی نہ تھا اس کے باوجود قرآن حکیم، حدیث شریف اور اقوالِ صحابہ کے بعد سلفِ صالحین کے ارشادات ذکر کی فضیلت اور اس کی اہمیت و ضرورت کی وضاحت فرماتے رہے۔ اس لئے نہیں کہ ذکر الٰہی دوسرے فرائض یا عبادات کا متبادل تھا بلکہ اس لئے کہ ذکر الٰہی سے دل میں وہ روشنی، وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جو عبادات میں خلوص اور گہرائی عطا کرتا ہے جسے آپ اصطلاحِ شریعت میں خشوع و خضوع کا نام دیتے ہیں اور جس کے بغیر عبادت شرفِ قبولیت نہیں پا سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ ذکر الٰہی کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو ایسے مقدس وجود تھے جن کی مقدس زبانوں کے ساتھ ان کے وجود بھی ذاکر تھے، بلکہ کھال سے لے کر دل کی گہرائیوں تک ذکر الٰہی کی چھاپ لگی ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں قرآن گواہ ہے "ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ" کہ نگاہ نبوت اور صحبت نبوی سے ان کی کھالوں یعنی جسم کے باہر کے ذرات سے لے کر دل کی گہرائیوں تک ہر ذرہ ذکر الٰہی کرتا تھا۔ لیکن جہاں ادبارِ زمانہ سے اور بہت سی نعمتیں ہم سے چھن گئیں، وہاں یہ بھی ایک نعمتِ عظمیٰ تھی جسے من حیث القوم تو ہم نے کھو دیا، مگر قابلِ ستائش ہیں اللہ کے وہ بندے جنہیں نہ زمانے کی بے رُخی بد دل کر سکی، نہ نادانوں کے فتوے، نہ دُنیا کی آسائشوں کا لالچ ان کے راستے کی دیوار بنا اور نہ اقتدار و وقار، بلکہ سب کچھ قربان کر کے انھوں نے اپنی ذاتی حیثیت میں اللہ کی اس امانت کا بوجھ اٹھایا، اور اسے بعد والوں تک پہنچا کر اس کا حق ادا کر گئے۔ اس طرح یہ نعمت باقی ہے اور جب تک اللہ چاہے گا باقی رہے گی کہ یہی اس کائنات کی رُوح ہے جب یہ فنا ہو گی تو پھر

دُنیا کی عمر بھی تمام ہو چکی ہوگی۔

جن لوگوں نے یہ دولت کھو دی یا اس کی اہمیت کو نہ جان سکے، اس کا انکار کرنا تو ان کے بس میں بھی نہ تھا کہ جب قرآن میں، حدیث میں اور سلف صالحین کے اقوال و ارشادات میں اس کا حکم موجود ہے تو آج کوئی انکار کی جرأت کیسے کرے۔ ہاں! انھوں نے اس کی تاویل کی جو ان کے خیال کے مطابق بڑی ذہنی بات تھی اور عام آدمی کے لئے بھی، لیکن اگر اسے کتاب اللہ پر پیش کیا جائے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں رہتی بلکہ بیت عنکبوت ثابت ہوتی ہے۔ اور وہ بات یہ ہے کہ جناب یہ نماز، روزہ حج و زکوٰۃ کیا ذکر نہیں ہے؟ پھر اس کے علاوہ آدمی بہت سے نیک اعمال کرتا ہے، والدین کی خدمت، اولاد کی تربیت، حقوق العباد کی نگہداشت، تلاوت، تسبیحات وغیرہ ذالک۔ حتےٰ کہ تبلیغ جیسا اہم کام کرتا ہے یعنی دُوسروں تک اللہ کی دعوت پہنچاتا ہے اور اس راہ میں سفر کی صعوبتوں کے ساتھ وقت، دولت اور محنت لگاتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ ذکرِ الٰہی کیا ہوگا؟ نیز یہ دَور بہت مصرُوفیت کا ہے، لوگوں کو اُن متذکرہ امور کے لئے وقت نکالنا دُشوار ہو رہا ہے، ذکر پر کیسے لگائیں؟ اور دُنیا کے کام کب انجام دیں؟

اس سوال کے دو حصے ہیں پہلے کا جواب "ارشاد السالکین" جلد ۲ میں دیا جا چکا ہے مگر یہاں مختصراً پھر جائزہ پیش کر دیتا ہوں آپ سمجھ لیں، تو عرض ہے کہ یہ سب اعمال بھی ذکرِ الٰہی ہیں مگر ان کے علاوہ ذکر کرنے کا حکم موجود ہے۔ سب سے پہلے آپ نماز کو لیں، تو اسے ذکر کہا گیا ہے کہ جمعہ کے روز جب نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف تیزی سے آؤ! "فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ" یہاں نماز کو ذکر کہا ہے مگر ساتھ ارشاد ہوتا ہے، جب نماز ختم ہو تو زمین پر پھیل جاؤ اور اپنی روزی

تلاش کرو۔ یعنی اپنے کام کاج میں لگ جاؤ۔ "وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا" مگر اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو۔ یعنی نماز بھی ذکر ہے مگر اس کے بعد کام کاج یا امورِ دُنیا میں بھی ذکرِ مسلسل کا حکم موجود ہے۔

یہی حال جہاد کا ہے کہ ارشاد ہوتا ہے جہاد میں جم کر مقابلہ کرو۔ اب سر کٹ رہے ہیں، جسموں کے پرخچے اُڑ رہے ہیں، خون کی ندیاں بہہ رہی ہے، مجاہد اللہ کی راہ میں سربکف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ "فَاثْبُتُوْا وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا" کہ جم کر مقابلہ کرو اور کثرت سے اللہ کا ذکر بھی کرتے رہو۔

ایسے ہی حج اور رمضان میں ذکر کی کثرت کے ارشادات موجود ہیں، حتیٰ کہ تبلیغ کے بارے میں دیکھ لیں کہ انسانیت میں اپنے زمانے کی سب سے بگڑے ہوئے اور متکبر شخص کے پاس اس عہد کی مثالی ہستیاں تشریف لے جاتی ہیں، یعنی فرعون کے دربار میں موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام جہاں ان کے لئے اور بہت سی ہدایات فرمائی گئیں کہ جانا کیسے ہے؟ کہنا کیا ہے؟ بات کا انداز کیا ہوگا؟ وہاں یہ بھی فرما دیا کہ "وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِکْرِیْ" میرے ذکر میں توجہ کی کمی نہ ہونے پائے۔

اب آپ خود اندازہ کر لیں کہ کس کو تبلیغ ہو رہی ہے، کون کر رہا ہے، اور یہ بھی یاد رہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے قلوب کبھی غفلت کا شکار نہیں ہوتے یعنی ذکر سے رُکتے نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ یہ بھی نہ ہو کہ توجہ ہی کم ہو جائے۔ تو آپ ہی کہئے کہ اعمال ذکر کیسے بن سکتے ہیں؟ اگرچہ خود ذکر ہیں مگر ان کے علاوہ ذکرِ الٰہی کا حکم موجود ہے۔

اچھا! ایک آخری بات! آپ کوئی بھی نیک عمل لے لیں اس کے نیکی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ سے ثابت ہو اور حضور اکرم ﷺ کی عبادات مثالی، مجاہدہ مثالی، قربانیاں اور ایثار مثالی، مقام و مرتبہ مثالی، تبلیغ مثالی، اس

سب کے باوجود نبی اکرم ﷺ کو ارشاد ہوتا ہے۔ "وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا" کہ اپنے اللہ کے نام کی تکرار فرمائیں اور اس حد تک اللہ، اللہ، اللہ کہتے چلے جائیں کہ کائنات معدوم ہو جائے۔

تفصیل کا موقع نہیں، مگر اتنا عرض کر دوں کہ سورۃ مزمل کی یہ آیات نزولِ قرآن کے ابتدائی زمانہ کی ہیں اور وصال تک آپ ﷺ کا عمل اس حکم پر پوری شدت سے تھا۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر حال میں ذکر کیا کرتے تھے۔ اب فرمایئے کہ ایسا باعمل اور باکردار کون ہے جسے ذکرِ الٰہی کی ضرورت نہیں؟ ضرورت سب کو ہے، ہر مسلمان کو ہے، خواہ مرد ہے یا خاتون۔ ہاں! اکثریت احساسِ ضرورت کھو چکی ہے۔

اب سوال کا دوسرا حصہ، کہ لوگوں کے پاس فرصت نہیں۔ یہ اس لئے غلط ہے کہ یہ بات وہ لوگ کہتے ہیں جو خود اس لذّت سے ناآشنا ہیں جن کو یہ دولت ملی ہے، انھیں علم ہے کہ قرآن پاک کی خبر کے مطابق ذکرِ الٰہی سے دل کو سکون نصیب ہوتا ہے، اور بے سکون دل سے جو کام دنوں میں نہیں ہو سکتا، ایک پُرسکون دل اسے گھنٹوں میں کر لیتا ہے۔ آپ اہل اللہ کی سوانح پر نگاہ ڈالیں تو اُن کے سفر، تصنیفات، بیانات، امورِ دُنیا اور عبادات عقل کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں کہ اتنا بڑا کام وہ کیسے کر گزرے؟ صرف اس لئے کہ ان کے دل ذاکر تھے، وہ خود ذاکر تھے ان کے وجود، ان کی ارواح ذاکر تھیں۔

یہ کر کے دیکھنے کا کام ہے آخر اللہ کا نام تو لینا ہے، کوئی ایسی چیز نہیں، جس کے نقصان کا اندیشہ ہو، نفع ہی نفع ہے۔ رہا اس کا کرنا، اور طریقہ ذکر یا پھر اس کا ثبوت کیا ہے اور اس طرح کی باتیں اگر چاہیں تو مجھے گھر کے پتہ پر خط لکھ دیں۔ اپنے سوال صاف اور مختصر کر کے لکھیں۔ انشاء اللہ تب تک میں بھی واپس پہنچ چکا ہوں گا اور

جو کچھ رب کریم کی طرف سے عطا ہوا، لکھ کر عرض کر دوں گا۔

والسلام

فقیر محمد اکرم اعوان

بنتِ حوّا اور دیارِ مغرب

۱۳ جون، لندن سے نیویارک آنا ہوا۔ TWA کا جہاز تھا اور غالباً انسانوں کا ایک شہر ہوا کے دوش پر ہوتا ہے کم و بیش سات صد انسان خواتین و حضرات اس میں سوار مسلسل سات گھنٹے فضا میں سفر کر کے یہاں پہنچتے ہیں۔

پہلا تجربہ تو جہاز میں بھی حیران کن تھا کہ متذکرہ تعداد میں ہم پانچ آدمی کلمہ گو تھے اور باقی سب خالقِ کائنات کے تصوّر تک سے محروم۔ حلال و حرام کی تمیز تک سے بے بہرہ شرم و حیا کی قیوُد سے ناآشنا۔ محض خواتین یا صرف حضرات اختلافِ جنس کے علاوہ تمام عادات خصائل میں ایک ہی جیسے اور پھر اس جنسی اختلاف کے اختلاط یا یکجائی سے پیدا ہونے والے حیا سوز مناظر، جس کی کمی وہ فلمیں پوری کر رہی تھیں جو جہاز کے اندر پردۂ سیمیں پر رقصاں تھیں۔

جہاز کے ہَوا میں بلند ہونے سے لے کر واپس زمین پر اُترنے تک ہزاروں بوتلیں مختلف قسم کی شرابیں اُن کے حلق سے اُتر چکی تھیں کھانے میں سرِفہرست خنزیر تھا اور اس کے علاوہ جس قسم کا گوشت بھی تھا بغیر ذبحہ کے تھا، اگر اس میں چاول یا اُبلی ہوئی سبزی تھی تو ہر ٹرے میں حرام گوشت کے نیچے دَبی ہوئی تھی لے دے کر گرم

پانی اور چا۔ کی پُڑیا تھی جو ہم استعمال کر سکتے تھے یا پھر چند بسکٹ جو ہم نے ساتھ رکھ لئے تھے علاوہ ازیں کوک وغیرہ کے بند ڈبّے اور بس۔

جہاز میں کھانا تقسیم ہوا تو اس قدر بدبُو پھیلی کہ جی چاہتا تھا اِنسان چھلانگ لگا کر باہر نکل جاتے۔ شاید یہ لوگ اس الم غلم کو کھانے کے عادی ہو چکے ہیں ورنہ سادہ لفظوں میں صرف غلاظت کھائی جا رہی تھی اور یہی کچھ پینے کو بھی تھا۔

اِس اخلاقی اعتبار سے بے لگام رُوحانی اعتبار سے مُردار اور محض حیوانی انبوہ کو دیکھ کر بے اختیار ربّ کریم کے احسانات سے گردن جُھکی جا رہی تھی۔ اور ایک موقع تھا کہ اِنسان اندازہ کر سکے، آقائے نامدار ﷺ کی اُن محنتوں، اُن مشقتوں اور مجاہدوں کا، کہ رُوئے زمین پر اس سے بہت ہی بدتر حال تھا۔ جب آپ ﷺ نے اللہ کے بھروسے پر اللہ کی توحید کا عَلم بلند فرمایا۔ جہاز میں کم از کم کوئی جھگڑا تو نہ تھا، اور تعداد چند سو تھی مگر رُوئے زمین پر کس قدر فساد تھا اور تعداد اربوں میں تھی ہمیں صرف چند گھنٹے گزارنے تھے جبکہ آپ ﷺ نے اِسی معاشرے کی اِصلاح فرمائی۔ عقائد میں، اعمال میں، اخلاق و کردار اور ایک پُورا معاشرہ تشکیل فرما دیا جو اپنی نظیر آپ ہی تھا ﷺ۔ یہ بھی آپ ﷺ ہی کی تقسیم کردہ اور عطا فرمودہ قوتِ ایمانی تھی، جو ہمیں جمِ غفیر میں حرام سے بچائے ہوئے تھی اور اللہ کی یاد سے ہمارے دل بھی رَوشن تھے۔

نیویارک پہنچے تو عجیب اتفاق ہے کہ کل بھی شہر جانا پڑا اور آج بھی۔ سڑکوں، دکانوں، بازاروں میں ایک ہجوم ہے ایک بھیڑ ہے لوگوں کی، مردوں کی، عورتوں کی، جس میں دو باتیں سرِفہرست ہیں ایک تو آپ اکثریت کو کھاتے پیتے ہوئے دیکھیں گے چل رہے ہیں، کھڑے ہیں، بات کر رہے ہیں مگر کچھ کھا پی بھی ضرور رہے ہیں۔ موٹر چلا رہے ہیں مگر ساتھ ساتھ مُنہ بھی چل رہا ہے بلکہ موڑ کاٹنے کے لِئے اگر دونوں ہاتھ سٹیئرنگ

پر ہیں تو برگر منہ میں دبا ہوا ہے۔ یا کم از کم سگریٹ تو ضرور ہوگا اور دوسرے جنسی
خرمستیاں، اگر کھا نہیں رہے تو اکثریت جوڑا جوڑا ہوگی اور سرِ راہ، سرِ بازار چل بھی رہے ہیں
اور خرمستیاں بھی جاری ہیں۔ لباس سے یہ لوگ ویسے ہی آزاد ہوتے ہیں۔ سردی میں
کپڑا سردی سے بچنے کے لئے پہنتے ہیں اور گرمیوں میں تیلی سی نیکر اور بنیان مرد وزن کا
لباس ہے۔ گورے کالے بچے بوڑھے سب ایک ہی حال میں مست ہیں۔ جیسے جنگلی
جانوروں کا ایک بہت بڑا ریوڑ ہو جس میں مختلف عمروں اور مختلف قد و قامت کے نر
ماداؤں کو کہیں سونگھ رہے ہیں، کوئی چاٹ رہا ہے یا پھر کبھی ہری بھری گھاس پر منہ
مارنے لگ جاتے اور بس یہ یہاں زندگی کی بہار ہے اور اس معاشرے کی ہلکی سی جھلک
جس کو اپنانے کے لئے پاکستان میں خواتین نے اپنا نام ترقی پسند رکھ لیا ہے اور جہاں
تک پہنچنے کے لئے کبھی جلوس نکالے جاتے ہیں کبھی حقوقِ نسواں کی آڑ لے کر آگے بڑھنے
کی کوشش کی جاتی ہے۔

کاش! وہ یہ دیکھ سکیں کہ یہاں عورت نام کی کوئی ہستی تلاش کرنے سے بھی
نہیں ملتی یہاں تو جنسی کھلونے ہیں۔ جو اپنی رغبت تک کھو چکے ہیں اور اب معاشرے
میں بات ہم جنس پرستی سے بھی کہیں آگے بڑھ چکی ہے۔

عزت و حیا جیسی باتیں اُن کی لغت سے مٹ چکی ہیں۔ اگر کسی کو آخرت پر
ایمان نصیب نہ ہو تو بھی دُنیا میں ایک وقار، ایک قدر کی تمنا تو رکھتا ہے۔ مگر یہاں اقدار
اُلٹ چکی ہیں، پیار و محبت اپنے معانی سے محروم ہو چکے ہیں اور جو صورتِ حال روزِ قیامت
سخت پریشان کن ہوگی، کوئی کسی دوسرے کو نہیں پوچھے گا بلکہ اپنی ذاتی مصیبتوں میں
گھرا ہوا ہوگا وہ اُن لوگوں پر پوری طرح سے اپنے اثرات ڈال رہی ہے کہ ہر گناہ سے
آخرت میں ایک عذاب تو تیار ہوتا ہے اور یہی عذاب منعکس ہو کر گناہ گار کی زندگی کو

تلخ کر دیتا ہے، جیسے ہر نیکی پر مرتب ہونے والے ثواب اُخروی کے اثرات نیک آدمی
کے دل کو دُنیا میں بھی سکون فراہم کرتے ہیں۔ یہ معاشرہ آخرت کے انتہائی عذابوں کی
انعکاسی کیفیت کا مظہر ہے۔ اور یہ دُکھ اس وقت دوچند ہو جاتا ہے جب انسان یہ
سوچتا ہے کہ برہنہ پھرنے والے یہ جسم بنتِ حوا کے ہیں، ان کا ہمارے ساتھ انسانی رشتہ
تو بہر حال ہے۔ آقائے نامدار ﷺ ان کی طرف بھی مبعوث ہوتے ہیں، اور
ان تک بھی وہ مژدہ جانفزا پہنچایا جانا ضروری ہے۔ جیسے ہم دینِ اسلام اور دینِ حق
مانتے ہیں کیا لوگ آدم علیہ السلام کے بیٹے نہیں ہیں کیا یہ خواتین و حضرات "الناس"
کے مخاطب نہیں ہیں تو پھر ہم ان کے لئے کیا کر پاتے ہیں؟

یہاں مسلمان، ہندو، سکھ جو بھی باہر سے آیا، ان میں اکثریت ایسے ہی لوگوں
کی ہے جو اسی معاشرے کا حصہ بن چکے ہیں جو عمر کے آخری حصے میں یہاں لاکھوں
ڈالر کما کر بیٹھے ہیں مگر اُن کے لڑکے اور لڑکیاں اسی ماحول میں گم ہو چکے ہیں اور یہ
معاشرہ ان پر قہقہہ لگاتا ہے کہ یہ یہاں سے کچھ لینے آتے تھے جو اپنی نسل بھی دے
کر جا رہے ہیں۔

اب بعض شہروں میں اگرچہ مسلم تنظیمیں بننا شروع ہوئی ہیں مگر وہ اصلاحِ احوال
کے لئے کافی نہیں، تبلیغی جماعت نے کام شروع کیا۔ جس سے مسلمانوں کو ایک گونہ ڈھارس
ملی۔ مگر یہ بھی تو ان لوگوں کے لئے ہے جو ان کی بات سُننے کے لئے کسی جگہ موجود تو
ہیں۔ جو اس ہجوم میں کھو گئے ان کا فی الحال کوئی مداوا نہیں ہو پا رہا۔ پھر تبلیغی مشنوں
کے ساتھ یہاں ایسے علماء بھی تشریف لے آتے ہیں جن کی زندگی کا مشن تبلیغ کی مخالفت
کرنا ہے۔ انھوں نے کمال شفقت سے ایسے لوگوں کو جو اس ظالم و بدکار معاشرے سے
بچ کر اسلام کے دامن میں پناہ لینے آتے تھے، خبردار کیا کہ یہ وہابی ہیں۔ کافر ہیں کوئی

حرج نہیں. مگر وہابی مت بن جاؤ، اور اس سے بچنا ہے تو ہمیں ڈالر دو. گیارھویں
شریف کے لئے، عُرس شریف کے لئے. اور اس حد تک آگے چلے گئے کہ امسال پاکستان
کے ایک مشہور عالم ممتاز قاری صاحب اور بے شمار شریفوں سے صفِ اوّل کے داعی
نے یہاں نیویارک میں وقت سے پہلے رمضان ختم کرا دیا. عید پڑھائی، ڈالر لئے اور جہاز
پر بیٹھ کر لندن چلے گئے کہ انھیں وہاں بھی عید پڑھانا تھی اور دین کی خدمت کے لئے
پاؤنڈ جمع کرنے تھے اور واقعی وہاں بھی جا کر عید کی امامت فرمائی، تقریر شریف فرمائی
نعت شریف پڑھی اور پاؤنڈ شریف حاصل فرمائے اور بھلا ایسے علماء کو کیا فکر ہو گی کہ کون
کس تباہی سے دوچار ہو رہا ہے بلکہ یہی وہ کردار ہیں جنہیں بدکردار کہنا زیادہ موزوں
لگتا ہے اور جو دین اور اس کی عظمت بیچ کر فانی دُنیا کے چند سکّے جمع کرنے کے لئے
ہر چیز داؤ پر لگائے ہوئے ہیں۔

کاش کوئی مشرق کی خاتون کو بنتِ حوّا کی وہ حالتِ زار بتا سکے جو اس معاشرے
میں اس کی قسمت بن چکی ہے اور کاش اُن جیسا بننے کی بجائے ساری محنت اُن جیسا
بننے پر لگا دیں جو آپ ﷺ نے بنایا تھا، جن جیسا بننے کا حکم اللہ نے اپنی آخری
کتاب میں دیا ہے تاکہ ہم ان کو بھی اپنے جیسا بنانے کے لئے کام کر سکیں۔

اے کاش! جو کچھ یہاں ہوتا ہے میں لکھ سکتا یا جو میں نے یہاں دیکھا ہے
بیان کر سکتا. اے کاش! ایسا ہو سکتا مگر یہ سب کچھ ممکن نہیں. کافی نہیں کہ اتنا کچھ
لکھنے کے باوجود میں نے کچھ بھی تو نہیں لکھا۔

ابھی مشرق کے پاس بہت کچھ ہے. اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم نہ صرف اس
کی حفاظت کریں بلکہ اپنی زندگیوں کو عین سُنّت کے مطابق ڈھال سکیں اور اللہ کی
دی ہوئی توفیق سے تباہی کے غار میں ڈوبے ہوتے اس جمِ غفیر سے کچھ تو بچا لیں۔

حرام مگر نوحام

قدرت کی منصوبہ بندیاں بھی عجیب ہیں، انسان اگر سمجھنا چاہے تو ہر چھوٹی
بات بھی بڑی بات ہے اور ایک تازیانۂ عبرت، لیکن دل شرط ہے ورنہ ہر بڑی بات
بھی معمول کی کارروائی دکھائی دیتی ہے. بظاہر یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جسے حادثہ بھی
کہا جا سکتا ہے اور یہی معمولی حادثہ ایک بہت بڑا وعظ بھی ہے جس میں نصیحت کا دریا
بند ہے صرف نگاہ اپنی اپنی ہے۔

پاکستان سے ایک مولانا یہاں نیویارک تشریف لائے امسال رمضان المبارک
میں انھوں نے ایسا مزیدار پروگرام ترتیب دیا کہ یہاں وقت سے پہلے رمضان المبارک
کے خاتمے کا اعلان کر دیا ان کی دلیل یہ تھی کہ انھوں نے تقویم سے حساب لگا لیا ہے
چنانچہ نیویارک میں بھی رمضان المبارک کے بعد دو عیدیں ہوئیں ایک اُن لوگوں نے کی
جنھوں نے مولوی صاحب کی بات مان لی اور دوسری نہ ماننے والوں نے بعد میں کی۔
روزے پورے کر کے. مولوی صاحب کو کیا ملا؟ انھوں نے عید پڑھائی ڈالر شریف
لئے اور شام جہاز میں بیٹھے صبح برطانیہ میں تھے۔
مزے کی بات یہ ہے کہ وہاں جا کر عید پڑھائی اور پاؤنڈ شریف جمع فرمائے.

اور پاکستان چلے گئے عیدیں وہاں بھی دو منائی گئیں کہ یہ اب قبل از وقت تھے چنانچہ آپ نے عید لاہور جا کر اپنے بچوں میں منائی اور اس کی راہ میں رمضان شریف میں سفر کیا روزے قضا کئے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر ڈالر اور پاؤنڈ لے کر چلے گئے۔ اُمید ہے لاہور بھی عید کی امامت فرمائی ہوگی۔ اگر دو بار کر سکتے ہیں تو تیسری بار آخر حرج ہی کیا ہے، چلو ڈالر یا پاؤنڈ نہ سہی روپے تو ملیں گے اور یہ کونسی اصلی والی پڑھا رہے ہیں۔

اب یہ سب کچھ فوراً تو نہ ہوا ہوگا مولانا کی منصوبہ بندی کا کمال تھا کہ انھوں نے راستے میں حساب لگا کر سب کاموں کا وقت معلوم کر لیا اور جہاز پر بیٹھ گئے۔ اُدھر کارکنانِ قضا و قدر بھی اپنا کام کر رہے تھے انھیں بتانا تھا کہ یہ راستہ درست نہیں مگر کیسے؟ دل تو ان کا اندھا تھا مادّی کان اُن کی آواز سے نا آشنا چنانچہ انھوں نے منصوبہ بندی کی اور اپنے منصوبے پر عمل کرنے سے پہلے مولوی صاحب تک اُن کا پیغام پہنچ چکا تھا مگر صد افسوس وہ پھر بھی نہ سمجھے اور توبہ کی توفیق نہ ہوئی ہوگی۔

ہوا یہ کہ یہ صاحب اٹالین ایئر لائن پہ سفر کر رہے تھے راستہ میں کھانا تقسیم ہوا مغرب میں حلال کا تو سوال ہی فضول ہے ہاں! آپ کئی روز پہلے کہہ دیں تو آپ کو دیں گے جس میں خنزیر کا گوشت نہیں ہوگا باقی تو سب کچھ وہی ہوتا ہے۔ ہاں شراب بھی نہیں ہوتی اس لئے ان جہازوں کا کھانا نہ ہی کھایا جائے تو ٹھیک ہے۔ مگر مولانا نے تو یہ اہتمام نہ کیا تھا اور نہ جانتے تھے لہٰذا عین رمضان میں وہی سب کچھ جو انگریز اور امریکن غیر مسلم کھاتے ہیں اُن کے سامنے بھی آ گیا۔

یہ واقعہ خود انھوں نے بیان کیا کہ میں نے اس لڑکی سے پوچھا،

"حرام تو نہیں؟"

اُس نے کہا، "نو حام" اور میں نے کھا لیا بہت بھوک لگ رہی تھی، وہ

یہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ جاہل قوم "حرام" نہیں کہہ سکتی اور "حام" کہتی ہے۔ انھیں بتایا گیا کہ جناب وہ تو خنزیر کا گوشت اور سارا حرام کھانا تھا لڑکی نہ اردو جانتی تھی نہ حلال و حرام۔ اُس نے تو انگریزی میں جواب دیا "NO HARM!" کہ کوئی حرج نہیں یعنی یہ کھانا طبّی لحاظ سے ٹھیک ہے اور یہ "ر" تو لکھتے ہیں درمیان یا اخیر میں ہو تو بولتے نہیں اس لئے حارم کو حام کہہ دیا۔

تو کہنے لگے، پھر میں نے تو پیٹ بھر کر کھا لیا بڑی بھوک تھی۔ مگر یہ نہ سمجھے کہ فطرت کا یہ کتنا نازک اشارہ تھا کہ لوگوں کا رمضان برباد کر کے جو دولت لوگے وہ تو ایسی ہی ہے جیسے جہاز کا کھانا۔ حیرت ہوتی ہے کہ بدبخت کو بدبو بھی نہیں آئی ورنہ جب جہاز میں کھانا تقسیم ہوتا ہے بدبو سے سر پھٹنے لگتا ہے شاید اللہ نے سارے احساسات ہی چھین لئے تھے کہ مولوی صاحب نے بھی ہر کام میں یہی رویّہ اختیار کیا، یعنی "NO HARM"۔

اُمید ہے کبھی یہ سطور اگر اُن کی نگاہ سے بھی گزریں تو بے شک خفا ہو لیں مگر اپنے کردار پر بھی نظر ثانی فرما لیں کہ یہاں نیویارک میں لوگ ابھی مسئلہ پوچھتے پھرتے ہیں کہ "ہمارا جو اعتکاف ٹوٹا تھا اس کا کیا کیا جائے؟" کم از کم ان نو مسلموں کی حالتِ زار پر رحم کریں۔

اللہ آپ پر رحم فرمائے!

مکہ مکرمہ ۲ جنوری ۱۹۸۹ء جمعۃ المبارک

موت سے زندگی تک

زندگی اور موت کس قدر قریب قریب بستی ہیں، شاید یہ بات اس آدمی کو سمجھ نہ آئے جو زندگی بھر موت سے بھاگتا ہی پھرا ہو اور اپنے اب تک زندہ رہنے کو اپنی اس کوشش ہی کا ثمر شمار کیے بیٹھا ہو۔ مگر کچھ لوگوں کو ایسے حالات سے گزرنا پڑتا ہے کہ وہ زندگی اور موت کو بہت ہی قریب قریب بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ دیکھتے ہیں۔ مثلاً جنگِ عظیم میں جن لوگوں نے عملاً حصہ لیا تھا۔ اُن کی اکثریت تاحال بقیدِ حیات ہے کبھی کسی سے ملاقات ہو تو ذرا ان دنوں کی کوئی داستان سُنیئے گا۔ کس طرح ہر قدم موت کے سینے پر پڑتا تھا۔ پھر کچھ لوگوں کو وہ نگل لیتی کچھ بچ جاتے، گولیوں کا مینہ برستا، ساتھی ستاروں کی مانند ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے اور بچنے والے ان کی مدد تو کیا کرتے ہاں! ان کے بے جان جسموں کو بھی بعض اوقات ڈھال بنا کر پیچھے لیٹ جاتے۔

ہمارے وہ سکول کے دن تھے اور علاقہ فوجی۔ چنانچہ متعدد گھروں میں موت کی اطلاعات آنا روزانہ کی بات تھی اور آہ و بکا کی آواز کسی نہ کسی سمت سے ضرور سُنائی دیتی تھی۔

پھر ملک تقسیم ہوا اور مملکتِ خداداد پاکستان کو اللہ نے وجود بخشا مگر یہ طلوعِ سحر

بھی صد ہزار انجم خون سے تر تھی جس طرح مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی اور خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ ان تمام مناظر کے نہ صرف چشم دید گواہ موجود ہیں بلکہ ان مظلوم خاندانوں کی یادگاریں یعنی جو ایک آدھ فرد گھر کی لاشوں میں دبا ہوا نیم مُردہ رہ گیا اور پھر زندگی سے ہمکنار ہوا، ابھی تک باقی ہیں۔

اس موضوع پر بھی بے شمار لوگوں نے لکھا اور تاحال ناول، مضامین اور افسانے کے رُوپ میں لکھتے رہتے ہیں کبھی نسیم حجازی صاحب کی تصنیف "خاک اور خون" نظر سے گزری ہو تو آپ نے اندازہ فرمایا ہوگا۔

پھر ملک سے ایک اور ملک بنا۔ بنگلہ دیش آپ نے دیکھا نہ ہوگا تو وہاں کا حال سُنا ضرور ہوگا ایسے ہی افغانستان کا گزشتہ عشرہ۔ فلسطین و لبنان کا حال، ایران کا انقلاب۔ یہ سب تو جنگ کی باتیں ہیں، پُرامن شہروں اور پُرسکون آبادیوں میں بھی زندگی اور موت کا کھیل مسلسل عمل پذیر ہے۔ کسی تن مُردہ کو زندگی نصیب ہوتی ہے تو کوئی زندگی سے لبریز پیمانہ چھلک کر گر جاتا ہے۔

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ۔ (القرآن)

قدرت کی یہ کرشمہ سازیاں ہر آن اور ہر جگہ جاری ہے۔ ہاں! جب بظاہر حالات بھی زیر و زبر ہو جائیں تو ذرا پردہ زیادہ سرک جاتا ہے اور عام آدمی بھی محسوس کرنے لگتا ہے کہ واقعی موت بھی زندگی کے ساتھ ہے ورنہ صرف اللہ کے خاص بندوں کی نگاہ اس پر رہتی ہے۔ جیسے ایک بزرگ کے بھائی کی وفات پر کوئی دوست افسوس کے لئے گیا تو باتوں باتوں میں پوچھ لیا ان کی موت کا سبب کیا تھا؟ غالباً مرض جاننا چاہتا ہوگا مگر انھوں نے اس کی زندگی! اور موت کا بنیادی سبب ارشاد فرمایا کہ انسانی زندگی ہی انسانی موت کا سبب اس عالم میں تو ہے اس سب کے باوجود

یہ یقین رکھنا کہ موت ہے اور مجھے بھی آئے گی۔ ہم سب کی مجبوری ہے، یقیناً اکثریت اس حقیقت کو فراموش کئے رکھتی ہے۔ دُنیا اور اس کی لذتیں انسان کو اس قدر اُلجھا لیتی ہیں کہ صرف موت کی تلخی ہی اسے ہوش میں لاتی ہے مگر تب تک پُل کے نیچے سے پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ ہاں! کچھ خوش نصیب ایسے ضرور ہوتے ہیں جو دُنیا میں رہتے ہوتے بھی موت سے غافل نہیں ہوتے۔ موت کو نہ صرف یاد رکھتے ہیں بلکہ اس کی تیاری میں لگے رہتے ہیں۔ یہ ان لوگوں پہ اللہ کریم کا خاص کرم ہوتا ہے۔

اس سے آگے بھی ایک بات اور ہے وہ ہے کسی حد تک عملی تجربہ۔ جی ہاں! موت کا عملی تجربہ، یہ کشفاً مشاہدے سے آگے ہے اور چند قطرے میں نے بھی چکھے ہیں جبھی تو یہ کہانی لے بیٹھا کہ کہاں وہ موت کی گہری وادیاں اور کہاں پھر سے حیاتِ نو کے ساتھ بیت اللہ شریف کے طواف، جو کبھی نگاہیں کرتی ہیں اور کبھی میرے لڑکھڑاتے قدم۔ ان سب کا ایک تاثر تو یہ ہے کہ میں قلم لے کر لکھنے بیٹھ گیا۔ میرا دل چاہا کہ ان لوگوں کو ضرور شریکِ سفر رکھوں جن کی دعاؤں نے مجھے پھر دیارِ حرم اور درِ حبیب ﷺ پر حاضری کی سعادت بخشی۔ تو سُنیئے! ہم نے موت کو کہاں اور کیسے دیکھا؟ اور ہمیں کیسی لگی؟

آیئے! بات شروع سے کریں۔

گزشتہ برس گرمیوں میں صحت بہت خراب رہی اور بہت سے پروگرام ملتوی ہو گئے۔ جب سفر کے قابل ہوا تو کوشش یہ تھی کہ تمام پروگراموں کو تاخیر سے سہی، مگر عملی جامہ ضرور پہنایا جائے۔ لہٰذا مسلسل سفر ہی درپیش رہا۔ اس کے باوجود گلگت اور کوئٹہ دو جگہوں پر حاضری نہ دے سکا۔ انشاء اللہ امسال ضرور حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ بہر حال ۲۹، دسمبر کو فارغ ہوا اور شام کو گھر پہنچا۔ ۳۱، دسمبر کی رات پنڈی جا کر ٹھہرا۔ ڈاکٹر عظمت کو بھی آنا تھا، وہ دیر سے پہنچے۔ بہر حال یہ سرد رات ۸۸ء

کی آخری شب تھی اور صبح ۸۹ء کا تازہ دم سورج دیکھنے کی اُمید میں سو گئے۔

صُبح یکم جنوری جیپ کے ذریعے پشاور جانا تھا، رات جیپ کا اہتمام کرتے اور دوستوں سے رابطہ کرتے کافی دیر ہو گئی گھر سے ڈاک اُٹھا لایا تھا۔ احباب کو جوابات لکھے اور یوں دیر سے سویا۔ خیالوں میں وہاں سے بہت دُور کسی اگلی منزل پر جو خوبصورت بھی تھی اور پُر خطر بھی۔ مگر حُسن تو ہمیشہ خطرات میں ہی نظر آتا ہے۔ ہر پھول کانٹوں میں گھرا ہوتا ہے اور جن پھولوں پر کانٹوں کا پہرہ نہ ہو عموماً خوشبو سے خالی اور نظر کا دھوکا ہی ثابت ہوتے ہیں کچھ بات مزاج کی بھی ہے کہ میرا مزاج بھی خطر آشنا سا ہے۔

بہر حال رات ڈاکٹر صاحب آ گئے اور علی الصُبح تہجد اور ذکر کے بعد لیٹنے والے احباب بھی نماز سے فارغ ہو کر چائے کا کپ پیا اور اللہ پر بھروسہ کر کے نکل کھڑے ہوئے، پشاور روڈ سے دوسری گاڑی لینا تھی۔ وہاں ایک بار پھر چائے کا کپ پینا پڑا۔ اور بہت خوبصورت مضبوط، نئی اور قیمتی جیپ اپنے تجربہ کار ڈرائیور کے ساتھ ہماری راہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہمیں اپنے دامن میں سمیٹا اور یوں سپیدۂ سحر پھیل رہا تھا جب ہم عازمِ پشاور ہوئے۔

یکم جنوری ۱۹۸۹ء

جہاں کل چھوڑی تھی، بات وہاں سے شروع کرتے ہیں تو ڈرائیور نے۔ بڑی سڑک پر گھومتے ہی رفتار بڑھا دی اور جیپ بہت تیز دوڑنے لگی۔ میں پیچھے گھوم کر عظمت سے بات کرنے لگا کہ ہمارے سامنے جاتی ہوئی اربن ٹرانسپورٹ کی بہت بڑی بس ایک دم دائیں مُڑ گئی، حالانکہ یہ جگہ اس کے مڑنے کے لئے نہ تھی پھر اُس نے کوئی اشارہ بھی نہ دیا، غالباً وہ ان تکلفات سے پاک تھی اور اشارے وغیرہ اس میں تھے ہی نہیں۔

حادثات تو دُنیا بھر میں ہوتے ہیں۔ مگر وطنِ عزیز کے حادثات عموماً لاپرواہی کے باعث ہوا کرتے ہیں اور ہم بھی ایک بس ڈرائیور صاحب کی لاپرواہی کی بھینٹ

چڑھ چکے تھے۔ داد دیجئے ہمارے مُشّاق ڈرائیور کو بھی؛ جس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اور بریک وغیرہ لگانے کے تکلف سے بے نیاز، پوری رفتار پر جیپ اس کے ساتھ دے ماری۔ آخر یہ صاحب بھی ڈرائیور تھے انھیں تکلفات میں پڑنے کی کیا ضرورت۔ میں سامنے متوجہ ہونے لگا تو بس اور جیپ میں چند گز کا فاصلہ تھا جس نے مجھے بھرنے کا موقع بھی نہ دیا۔ کہتے ہیں بڑے زور کا دھماکہ ہوا تھا۔ روایت کہتی ہے دھماکہ یاد نہیں۔ ہاں! درد اُٹھا تو نیم باز آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی جن میں سے بائیں آنکھ پر تو خون کا پردہ سا تھا۔ دائیں آنکھ سے معمولی سمجھ آئی کہ میں سیٹ اور گاڑی کے ڈیش بورڈ کے درمیان بُری طرح پھنس چکا تھا۔

عظمت کی آواز پہچانی تو بتایا کہ مَیں سانس نہیں لے سکتا، اگر سیٹ پیچھے کھینچ سکو تو شاید۔ اور اس نے کوشش کی مگر یہ اتنا آسان نہ تھا جیسا کہ بعد میں پتہ چلا۔ ہُوا یہ کہ پچھلا آدمی میری سیٹ کی پُشت سے اِس زور سے ٹکرایا کہ یہ آگے ٹیڑھی ہوگئی اور اس آدمی کی ریڑھ کی ہڈی کا مہرہ کریک ہوگیا۔ سامنے سے اس زور کا دھکا لگا کہ بس کی باڈی بھی پھٹی اور جیپ کے سامنے وینچ لگا ہوا تھا۔ سامنے کا بمپر ٹوٹا، وینچ ٹوٹ کر پیچھے ہٹا۔ ریڈی ایٹر کو پھاڑ کر انجن کو متاثر کیا چیسی تک ٹیڑھی ہوگئی۔ میرا سر سامنے بڑے شیشے سے اس زور سے ٹکرایا کہ شیشہ اور سر دونوں پھٹ گئے۔ ماتھا شق ہُوا ابرو پھٹا اور پلکوں کے پیچھے پپوٹا پھٹ گیا۔ مگر اللہ کی شان! آنکھ محفوظ رہی۔ سینے کو ایک طرف سے ڈیش بورڈ اور دوسری طرف سے سیٹ نے اس طرح دبایا کہ دائیں طرف کی چار پسلیاں کریک ہوئیں مگر ٹوٹی نہیں۔ سینے کے درمیان والی نرم ہڈی میں بال آگیا۔ پیٹھ کی ہڈی متاثر ہوئی۔

عظمت نے جلدی سے دروازہ کھولا اور میں باہر جھول گیا۔ حُسنِ اتفاق ایک

میاں بیوی ڈاکٹر اپنی گاڑی میں گزر رہے تھے۔ وہ رُک گئے کچھ ساتھ والے لوگ بچ گئے تھے سب نے مل کر مجھے باہر کھینچ لیا اور ان کی کار کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ اور ہسپتال کو بھاگے۔

یہ تو ظاہر کی کہانی تھی، میں خود کہاں تھا؟ تو سُنیئے!

ایک بہت خوبصورت اور حسین وادی، جہاں واقعی صُبح پھیلی ہوئی تھی مگر ابھی سُورج سامنے نہ تھا۔ حدِ نگاہ تک سبزہ بچھا ہوا تھا جس میں ننھے مُنّے پھولوں سے گل کاری کی ہوئی لگتی تھی۔ بہت ہی پیاری ہوا جو نہایت سکون سے چل رہی تھی۔ خوبصُورت پانی بہہ رہا تھا جو نہ دریا لگتا تھا کہ اتنا پھیلاؤ نہیں تھا کہ اس سے بڑا تھا اور تھوڑا تھوڑا کناروں سے باہر دُور تک پھیل رہا تھا۔ اِتنا شفاف کہ تہہ میں بچھے ہُوئے پتھر نظر آرہے تھے جو رنگ برنگے تھے اور مختلف روشنیاں بکھیر رہے تھے۔

حدِ نظر تک ٹیلوں کی اپنی بہار تھی۔ آسمان کی سمت انوکھی روشنیوں کی بہار تھی۔ درخت اور جھاڑیاں اپنے طور پر مست۔ غرض ہر شے جھوم رہی تھی، وقت کا احساس نہ تھا اور دُنیا سے تعلق درد کا تھا کہ ہر حرکت پر اُٹھنے والی ٹیسیں مجھے واپس بُلانے کی کوشش کرتی تھیں آنکھ کھولتا تو اردگرد کے دُھندلے سے نقوش ضرور نظر آتے اور لوگوں کی آواز بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تو کم از کم لفظوں میں جواب دینے کی کوشش کرتا۔

فوجی ہسپتال میں پہنچے انھوں نے فوراً ایکسرے وغیرہ لئے ٹیکے لگائے ماتھے پہ پٹی کی، ہاتھ پہ پٹی باندھی اور گاڑی میں ڈال دیا۔ کاش! میں کبھی اُن ڈاکٹر صاحبان سے ملوں جو مجھے یہاں لائے تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر جا چکے تھے۔ اور یہ ایک لمبا عمل تھا جس کے دوران مجھے مختلف کمروں، میزوں اور مشینوں کے سامنے سے گزرنا

پڑا۔ مگر میں کہاں تھا؟ اُس خوبصورت وادی میں جو مجھے نظر آرہی تھی محسوس ہو رہی تھی جہاں کوئی بھی نہ تھا حتّٰی کہ میں خود بھی نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ روح تو ابھی جسم میں ہی مقید تھی اور اسی ٹوٹے ہوئے پنجرے میں سے اس چمن کی بہار دیکھ رہی تھی مگر وہاں اکیلے پن کا احساس بھی نہ تھا شاید یہ برزخ کا کوئی گوشہ تھا اور واقعی ایسی جگہ تھی، جہاں صدیاں بیت جائیں مگر خبر نہ ہو اور میں ابھی داخل کہاں ہوا تھا جب ہسپتال کی گاڑی میں لادا گیا تو مکمل واپس آچکا تھا۔

شاید آگے کس قدر حسن بکھرا ہو، یہ تو مالک ہی جانے۔ ویسے موت کا حسن بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے بشرطیکہ اللہ کرے اس کے حسین رُخ سے تعلق ہو ورنہ دوسرا رُخ بھی رکھتی ہے جو بہت بھیانک ہے جس کے بارے پڑھا بھی ہے بحمد للہ! کشفاً دیکھا بھی۔ اور کشفاً دیکھے تو اس رُخ کو رُبع صدی سے زیادہ عرصہ بیت گیا۔ مگر یہ عملی مشاہدہ اپنی الگ حیثیت رکھتا ہے۔

بات لمحوں کی تھی مگر عملاً موت کے جبڑوں میں جا کر ہی بات بنی۔ اب ہوش میں آیا تو جسم کچلا ہوا تھا، سر پھٹا ہوا، سینہ چاک، بائیں کولہے پر باہر سے چوٹ پڑی تو اندر تک پٹھے، رگیں، ٹانگوں کے سارے مسل، ہر چیز بُری طرح کچلی گئی تھی اور ہر شے اپنی الگ سُر نکال رہا تھا۔ سارا جسم بج رہا تھا۔ آفیسرز وارڈ میں جگہ ملی، ایک ایک کمرے میں تین تین مریض تھے۔ جس کمرے میں، مَیں تھا وہاں ایک بزرگ تھے ان کا گُردہ نکال دیا گیا تھا اور ایک جوان افسر، جس کی دونوں ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں۔ کسی حادثے نے ایک خوبصورت جوان سے دونوں پاؤں چھین لئے تھے۔

باقاعدہ پٹی کروا کر اجازت لی اور رات پنڈی گھر پہ آگئے۔ ہسپتال کے ماحول میں اسقدر درد تھا، ایسی سوگواری چھائی ہوئی تھی کہ قوتِ برداشت جواب دے گئی۔

حال یہ تھا کہ دو آدمی پاؤں سنبھالتے، ایک کمر اور ایک سینے اور گردن کے پیچھے ہاتھ دیتا تب میں اُٹھ کر دوائی کھاتا۔ سرجن صاحب کا خیال تھا کہ کم از کم چھ مہینے واپسی میں لگیں گے۔ ادھر مجھے تو ۱۲ جنوری کو عمرہ کے لئے جانا تھا۔ لوگ مڈل ایسٹ سے، برطانیہ سے، اور امریکہ تک سے اس میں شمولیت کے لئے تیار تھے۔

اُسی شام کرنل مطلوب لاہور سے تشریف لائے، حالت دیکھی، پروگرام کے بارے پوچھا۔ کیا بتاتا میں لہٰذا مشائخ عظام کی طرف متوجّہ ہوا فرمایا، ہفتہ تاخیر سے چلے جاؤ! انشاءاللہ جاسکو گے۔ ہم نے ایک ہفتہ مؤخر کر دیا۔

احباب کی آمد شروع ہو گئی۔ جو سُنتا چل پڑتا۔ بہرحال تیسرے روز شام میں لاٹھی کے سہارے کھڑا ہونے لگا تو گاڑی میں بیٹھ کر گھر چلا گیا اور ۱۹ جنوری کو گھر سے پنڈی اور شام چل کر رات جدّہ پہنچ گیا، اہلیہ اور دو چھوٹے بچے ہمراہ تھے۔ عمرہ پر آنے والے لگ بھگ اٹھارہ ساتھی بھی ساتھ تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ پھر سے حرم شریف کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی اور کل ۲۰ جنوری کو پہلا عمرہ کیا، طواف کیا اور سعی کے تین چکر بھی لاٹھی کے سہارے لگائے باقی چار چکر کے لئے کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ مگر آج اللہ کریم سے اُمید ہے طواف اور سعی کر لوں گا انشاءاللہ۔

۱۸ جنوری کو پچھلے پہر بہت تکلیف ہوئی، اس لئے کہ دوا ختم ہو گئی تھی، اور ۱۹ جنوری کو پنڈی جانا تھا، سوچا وہاں جا کر لے لوں گا مگر یہ قاعدہ نقصان دہ ثابت ہوا اور بہت درد سہنا پڑا۔ غرض صبح ہوئی علی الصبح روانہ ہوئے۔ پنڈی عظمت بھی آ گئے اور ڈاکٹر سے فون پر رابطہ کر کے دوا پوچھی، احباب ملاقات کے لئے جمع تھے ہسپتال جانا پڑا حفاظتی ٹیکوں کے لئے۔ اور یوں چھ بجے شام ہم سخت سرد ہوا کو چیرتے ہوئے جہاز تک پہنچے اندر درجہ حرارت نارمل تھا۔ عمرہ پر رفاقت کے طالب سبھی لوگ ہمراہ تھے

جہاز روانہ ہوا اور یوں سمندِ خیال درِ حبیب ﷺ پر بوسہ زن تھا کہ ہوائی میزبانوں کی آواز نے چونکایا۔ اعلان کا آخری حصہ سنا کہ ہم پانچ گھنٹے پرواز کر کے ریاض جا اُتریں گے پھر کھانا سرو ہونے سے پہلے بچوں نے پانی مانگا۔ ایک دوست کو پیچھے کے ساتھ بھیجا تو جواب آیا کہ کولڈ ڈرنک تقسیم کیا جائے گا ویسے ہم نہیں دیتے حالانکہ بین الاقوامی پروازوں میں تو تقریباً کوئی پابندی نہیں ہوتی جب کوئی چاہے مانگ لے۔ ہاں! یاد آیا امریکہ کی ہوائی کمپنی TWA والے بھی ایسے ہی فیاض ہیں۔ پھر تقسیم ہونا شروع ہوا تو ہوائی میزبان ایک ڈبے کو دو دو گلاسوں میں بانٹ کر حاتم کی قبر پر لات مار رہی تھی۔ بڑی حیرت ہوئی کہ ہزاروں روپے ادا کر کے ٹکٹ حاصل کرنے والا مسافر غریب کولڈ ڈرنک کو بھی ترسے گا۔

پھر کھانا تقسیم ہوا مرغ تھا اور سلاد دہی اور پہلی بار جہاز میں جلیبیاں دیکھیں۔ چند چمچ چاول کھائے۔ دہی اور سلاد اور بدقسمتی سے گوشت کے چھوٹے چھوٹے تین چار ٹکڑے بھی کھا لئے جنہوں نے رات بھر تنگ کیا طبیعت خراب۔ اہلیہ نے کہا پیٹ میں درد ہے۔ بچے کا دل گھبرا گیا، بچی نے باقاعدہ قے کر دی۔ کچھ سمجھ نہ آئی کہ ماجرا کیا ہے؟ رات تو خیر ہوش کسے تھا دوسرے دن صبح خیال آیا کہ یہ مرغ تو مشینی ذبح ہوتے ہیں جو درآمد کئے جاتے ہیں اور سعودیہ میں تو فتویٰ ان کے حلال ہونے کا ہے تو لاہور کی ایک دعوت بھی یاد آئی۔ ایک بار وہاں بھی مرغ کھایا تھا جو بعد میں بہت مہنگا ثابت ہوا۔ پاکستانی وقت کے مطابق ریاض پہنچے۔ وہاں نیچے اُترنا اور امیگریشن وغیرہ کرانا تھا جو واقعی بڑا تھکا دینے والا کام ہوتا ہے اور دُنیا کے جس ملک میں آپ جائیں یہ سب کچھ ضرور بھگتنا پڑتا ہے پھر یہاں تو ایک خاص ادائے بے نیازی بھی ہوتی ہے بادشاہت ہے اور ہر سپاہی بادشاہت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ مگر تماشہ یہ ہوا کہ کچھ ہی لوگ فارغ

ہوتے تھے کہ ڈیوٹی تبدیل ہونے کے اوقات آ گئے حضور! سب نے قلم، مہر وغیرہ رکھا ہاتھ جھاڑے اور چلے گئے۔ ظاہر ہے نئے لوگوں کو سیٹ پر بیٹھنے میں کچھ تو وقت لگتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو جہاز کا عملہ بڑی پھرتی دکھا رہا تھا چلیں، بھئی جلدی چلیں! عرض کیا، بندۂ خدا! ابھی تو وضو کریں گے عشاء پڑھیں گے اور احباب احرام باندھیں گے اس لئے کہ ابھی بہت لوگ باقی ہیں۔

یہ بھی عجیب بات ہے جہاز مکہ مکرمہ سے ایک طرف سے ہو کر گزرتا ہے مگر حدِ حرم کے ایک کونے کو عبور کرتا ہے اور جہاز والے ضرور بتاتے ہیں کہ احرام باندھنے والے لوگ باندھ کر گزریں۔ مگر علماء کا مسلک یہ ہے کہ فضا میں نماز ادا نہیں ہوتی اس لئے کہ جہاز کا تعلق بیت اللہ شریف سے نہیں ہوتا۔ ہاں! بحری جہاز یا ریل وغیرہ کی بات دوسری ہے۔ تو پھر حدِ حرم سے جہاز کا فضا میں کیا تعلق! رہے سعودی، تو اُن کا مسلک یہ ہے کہ فضا میں بھی نماز ہو سکتی ہے لہٰذا اس مسلک کے حضرات کو ضرور احرام باندھ لینا چاہیئے۔

چنانچہ نماز ادا کی، کچھ احباب نے احرام باندھا، کچھ نے جدہ پہنچ کر باندھنے پہ چھوڑا اور یوں بس میں بیٹھے۔ پتہ چلا جہاز تبدیل ہو چکا ہے لہٰذا ہم رات کو ایک بجے سعودی وقت کے مطابق جدہ پہنچے۔ جہاں کسٹم کا مسئلہ درپیش تھا۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستانیوں کی عزت نہیں کرتے یا ان سے نامناسب سلوک کیا جاتا ہے۔ مگر جب بھی حاضری نصیب ہوئی دیکھا یہی ہے کہ پاکستانی انہیں تنگ کرتے ہیں اور یہ اللہ کریم کا احسان ہے کہ تین چار بار سال میں یہ سعادت نصیب ہو جاتی ہے۔ ذرا اب کی بار جو دیکھا، وہی سُن لیں کہ متعدد لائنیں بنا دی گئیں اور کئی کاؤنٹر کام کرنے لگے پہلے تو دُور تھا جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک صاحب خواہ مخواہ ایئر سٹاف

کی وردی پہنے ہوتے تھے، مقصد صرف رعایت حاصل کرنا تھا انھوں نے اپنی بات کی، ساتھ ایک اور شریف آدمی کی بھی سفارش کر دی۔ کسٹم افسر نے بڑی عزت کی، ہنس ہنس کر بولا مگر ایک ایک چیز کو دیکھا او بہت وقت لگایا۔ پھر ایک مولانا صاحب کی باری آئی انھوں نے عربی میں باتیں کیں، اُس نے کہا، سامان لائیے! سمجھے شاید جان چھوٹی، تین چار ساتھیوں کا بھی کہہ دیا۔ اس نے سب کا سامان منگوا لیا اور ایک ایک کپڑا الگ کر دیا۔ کافی دیر سمیٹتے رہے۔ پھر دو سرحدی جوان تھے۔ اُن کے بورے جو کھلے تو جوتے کئی جوڑے خشک فروٹ کی متعدد گٹھیاں، مٹھائیاں، بھنے ہوئے مکی کے دانے نیچے اخروٹ اور نہ جانے کیا کچھ۔ کسٹم والے نے بھی چاقو منگوا کر سب کو پھاڑا جوتوں کو دُہرا کر کے دیکھا، پھر ایک جوتے کے تلوے اُدھیڑنے کا کہا۔ غرض رہی کسر انھوں نے پُوری کر دی۔ میری طرف دیکھا، پوچھا "کیا ہے؟"

کہا، "یہ بیگ ہے مگر یہ ریاض چیک ہوا ہے اور یہ بکس!"

کہنے لگا، "بس جی بس! بیگ اٹھا لیں۔"

بکس کا ڈھکن اُٹھا کر دیکھا ہنس کر کہا "کچھ ہے؟"

میں نے کہا "سامنے ہے جو کچھ ہے!"

کہنے لگا، "لے جائیں!"

تو سمجھ آئی کہ قصور اُن لوگوں کا کم، اپنا زیادہ ہوتا ہے۔ بہر حال ایک سے تین بج گئے۔ ابھی لوگ باقی تھے باہر نکلے ساتھی منتظر تھے۔ زاہد کے ساتھ گھر چلے گئے۔ احباب سیدھے مکہ مکرمہ قیام گاہ پر چلے گئے اور ہم کل صبح جدہ سے چل کر پہنچے۔ سب نے مل کر عمرہ ادا کیا۔ اگرچہ درد تھا مگر طواف اور سعی میں اللہ نے ہمت دی اور آدھی سعی کرسی پر کی۔ یوں کل کا دن تمام ہوا۔

آج علی الصبح درس ہوا۔ سورۃ انفال کی دوسری، تیسری اور چوتھی آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ اور کچھ حسبِ توفیق تشریح عرض کی۔ ماحصل یہ ہے کہ اسلام اور مذاہبِ باطلہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام اللہ کی معرفت عطا فرما کر تمام امور اس وحدہٗ لاشریک کے سپرد کرنے کی تلقین کرتا ہے اور ہر کام کو آخرت کے لئے کرنے کا حکم دیتا ہے جبکہ تمام دیگر مذاہب امورِ دنیا کو عبادات کا حاصل قرار دیتے ہیں۔

یہ سوال، کہ اگر سب کچھ اللہ کی طرف سے ملتا ہے تو کام کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ تو اسلام کام کرنے کا حکم حصولِ رزق کی بنیاد کے طور پر نہیں۔ بلکہ عالمِ اسباب میں اسباب و ذرائع کو اختیار کرنے کو عبادت قرار دیتا ہے اور طلبِ رزقِ حلال کو فرض، مگر نتیجہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ مومن کی دُنیا بھی دین ہے اور یہی توکل کا مفہوم بھی ہے مگر اصل طلب قربِ الٰہی اور رضائے باری کی پیدا فرماتا ہے حتیٰ کہ مومن کی نشانی یہ بتاتا ہے کہ جب اللہ کریم کا ذکر ہو تو اس کا دل روشن ہو جاتا ہے، باغ باغ ہو جاتا ہے اور جب اللہ کریم کی آیات سُنتا ہے تو اُس کے ایمان یعنی یقین کی کیفیت میں اور زیادتی ہوتی ہے اور اُسے اپنے ربّ پر جو اس کے ہر حال سے واقف ہر ضرورت پوری کرنے پہ قادر اور سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا اور مہربان ہے بھروسہ نصیب ہوتا ہے۔ نہ یہ کہ وہ کام کاج چھوڑ کر گوشہ گیری اپنا لیتا ہے بلکہ کام کو عبادت سمجھ کر مزید حُسن و خوبی سے کرتا ہے اور اصل نگاہ اللہ کی رضا مندی پہ رکھتا ہے۔ اگر زندگی میں کوئی دُکھ تکلیف یا تنگی ترشی بھی آئے تو یہ جانتا ہے کہ میرا ربّ میرے حال سے آگاہ ہے اور جو کچھ مجھ پر وارد ہوا ہے یہی میرے حق میں بہتر صورت تھی۔ ورنہ یقیناً دُوسری صورت میں زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا۔ ممکن ہے کوئی دنیا کا فائدہ، کسی دینی نقصان کا سبب اور عارضی خوشی، دائمی راحت میں خلل کا باعث بنتی کیونکہ انسان

خواہش کرسکتا ہے اسے مانگنے کا حکم ہے اور مالک اتنا کریم ہے کہ زیادہ مانگنے والے پہ
زیادہ خوش ہوتا ہے لیکن دُعا بہر حال دعا ہے اِسے حکم کا درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

اللہ کریم کا علم بھی وسیع ہے اور اس کی قدرت بھی کامل۔ وہ خوب جانتا ہے کہ
کس کو کونسی شے مناسب ہے اگر بظاہر تکلیف بھی آئے تو مثال ایسی ہی ہوتی ہے،
جیسے ڈاکٹر اپریشن کرتا ہے کہ بلاضرورت چیر پھاڑ نہیں کرتا اور فاسد مادوں کو خارج
کرکے زخم کا علاج بھی کرتا ہے پھر اس کی قدرت ایسی کامل کہ انسان سمجھ ہی نہیں پاتا
بھلا دیکھیں ! اور شب ہجرت پر غور کریں۔ ساری مخلوق میں اپنا پیارا بندہ اور بے مثل
تخلیق، غار کے اندر تشریف فرما ہے۔ بدترین دُشمن دہانے پر پہنچ چکے ہیں اسے حفاظت
منظور ہے تو کیسا عجیب سبب پیدا فرما دیا۔ اگر انسان سوچے تو کوئی آسمانی بجلی گرانی
چاہیئے۔ کسی بہت بڑے اژدھے یا شیر ببر کو حکم ہو کہ مکہ والوں کو بھگا دو۔ مگر اس کی
شان ملاحظہ ہو، مکڑی سے فرمایا، "جالا تن دو !"

سُبحان اللہ وبحمدہٖ سُبحان اللہ العظیم۔

کیسی شانِ کبریائی کا اظہار فرمایا کہ دو عالم میں برگزیدہ ہستی کو بدترین دشمنوں سے
محفوظ رکھنے کے لئے رُوئے زمین کا کمزور ترین سبب استعمال فرمایا۔ اور مُشرکین مکہ ناکام و
نامراد خاک چھانتے پھرتے۔

بھلا انسانی عقل ان امور کو کیسے پا سکتی ہے۔ ہاں ! اس کی ذات سے ربط
نصیب ہو، اس کے ذکر سے فرحت حاصل ہو تو پھر اس پر بھروسہ نصیب ہوتا ہے۔ اور
انسان ہمہ تن اس کی عبادت میں مصروف ہو جاتا ہے کہ امورِ دُنیا بھی اطاعتِ الٰہی کا
رُوپ اختیار کرکے درجۂ عبادت کو پا لیتے ہیں۔

درس تو طویل تھا مگر کسی حد تک خلاصہ عرض کر دیا ہے۔ پھر دن بھر آرام کیا۔

رات امریکہ سے چھ ساتھی آئے تھے۔ دمام والے آج رخصت ہوئے۔ بس یہ آنا جانا ہے
گا۔ عصر کے بعد عمرہ کیا بالکل حج کا سماں تھا۔ وہی بھیڑ بھاڑ، وہی رونق اور انسانوں
کا سمندر، ہر طرح اور ہر ملک، ہر رنگ اور ہر زبان کے لوگ، مگر اللہ کے طالب، ایک
نبی کی اُمت اور ایک دین کے پیروکار یہ لاکھوں ایک ہی ہیں۔ اللہ مسلمانوں کی عملی
سیاسی اور مدنی زندگی میں بھی اتفاق اور ایسا اتفاق جو نیکی پہ ہو نصیب فرمائے۔

آج اگرچہ درد ہوا مشکل لگا مگر اللہ کریم کی عطا سے عمرہ پیدل چل کر ہی پورا کر
لیا ہے۔ طواف اور سعی بھی سب کچھ، الحمدللہ !

رات لندن سے آنے والے احباب میں سے ایک ڈاکٹر صاحب نے کچھ دوائیاں
کھانے کو دیں ایک ٹیکہ بھی کیا۔ مرہم بھی لائے تھے۔ بہرحال اُمید ہے کہ اللہ کریم ان
چیزوں کو مزید صحت یابی کا سبب بنا دیں گے۔ آج فجر کی نماز درست طریقے سے ادا
کی۔ پہلے تو کرسی پر بیٹھ کر اشارے سے پڑھتا تھا۔ پھر جب افاقہ ہوا تو کل کا دن فرش
پر بیٹھ کر بائیں ٹانگ آگے لمبی کرکے اشارے سے پڑھی اور آج بفضل اللہ تعالیٰ درست
طریقے سے ادا کرلی۔

رات کرنل صاحب جدہ چلے گئے تھے۔ صبح کینیا کے سفارتخانے جائیں گے
اگر ویزے لگ گئے تو ٹھیک ورنہ پھر شاید سب کو جانا ہو گا۔

آج ابھی دن شروع ہوا ہے صبح کے ذکر کے بعد نماز فجر اور ابھی ابھی درس
سے فارغ ہوا ہوں۔ آج کا موضوع "رحمتِ الٰہی" تھا جس میں ربوبیت پر کچھ بات ہوئی
کہ کس انداز سے ایک ایک ذرہ مائع گیس اور مختلف رُوپ دھارتا ہوا کبھی پھل پھول
اور کبھی غذا بن کر اس جسم انسانی تک پہنچتا ہے جہاں اس کی ضرورت ہے یا جس
جگہ پہنچانے کے لئے اسے پیدا فرمایا گیا، یہ اس قدر مربوط اور درست نظام ہے کہ نہ

کوئی تنکا فالتو پیدا ہوتا ہے نہ کسی کی کمی کا اندیشہ اور یہاں کی ہر ٹوٹ پھوٹ کسی نئی تعمیر کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ یہ ہماری کوتاہ بینی ہے کہ اپنے جیسے انسان کو توڑ پھوڑ کرتے دیکھیں، بشرطیکہ وہ کاریگر ہو تو جان لیتے ہیں کہ لکڑی کے ٹکڑوں کو کاٹنے والا فرنیچر بنائے گا، یا کپڑے کو بے دردی سے کاٹنے والا اسے لباس کا رُوپ دے گا مگر جب اللہ کی طرف سے خزاں آتی ہے تو اسے بہار کے آنے کی دلیل کیوں نہیں سمجھ پاتے دراصل اس میں ایک وجہ خود ہماری دست درازیاں بھی ہیں۔ اور جو ٹوٹ پھوٹ ہمارے گناہوں کے نتیجے میں واقع ہوتی ہے وہ نری توڑ پھوڑ ہی ہے۔

قرآن حکیم نے اسے فساد کے الفاظ سے ارشاد فرمایا ہے۔ کہیں فساد سے روکا ہے تو دوسری جگہ فساد کو انسانی اعمالِ بد کا ثمر قرار دیا ہے ورنہ اللہ تو اتنا کریم ہے کہ فرعون جیسے ظالم، متکبر، بدکار اور بُرائی کے نمونے کے پاس انبیاء کو تاکید فرما کر بھیجا کہ اس سے بات نرم لہجے میں کیجئے گا اور اسے بھی موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو تیرا تزکیہ کر دوں کہ تجھے واصل باللہ کر دوں، اللہ کے اس قدر قریب کر دوں کہ تجھے اُس سے حیا آنے لگے۔ یہاں نبی مبعوث فرمایا تو پیکرِ رحمت ﷺ جس کی بعثت ہی ساری انسانیت کے لئے تھی۔ صرف ایک پہلو پر غور فرمایئے کہ جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے تو ذرائع نقل و حمل آج کی طرح نہ تھے۔ صدیوں بعد موٹر اور پھر جہاز کا دَور آیا مگر اس تبدیلی نے زمین سمیٹ دی اور ساری انسانیت ایک کنبہ بن گئی ہے۔ آدمی صبح ایک ملک میں کرتا ہے تو شام دوسرے ملک میں۔ اگر آج یورپ میں نبی اور ہوتا اور ایشیا میں کوئی دوسرا تو آدمی کس کس سے دین کے ارکان کی تعلیم حاصل کرتا اور کیسے عمل کرتا مگر ضرورت بہت بعد میں آئی تکمیل کا سامان پہلے مہیا فرما دیا۔ اگر غور کریں گے تو یہی شفقت ہر سمت لُٹتی نظر آئے گی۔ اپنے نبی ﷺ کو وہ قلبِ اطہر بخشا کہ کافر

کے لئے بے چین ہوتا ہے اور یہ خیال فرماتے ہیں کہ میرے مبعوث ہونے کے بعد بھی یہ بے نصیب بخشش سے محروم چلا جائے گا۔ ایذا دینے والوں کو دعا سے نوازتے ہیں اور دشمنوں تک کو اپنے احسانات سے محروم نہیں فرماتے ؎

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دُشمناں نظر داری

پھر کوئی مشکل کام یا انہونی بات کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ جو کام کسی کے بس کا نہیں وہ اس کا ذمہ دار بھی نہیں۔ ہاں! جو کچھ کرنا چاہتا ہے وہ اس طریقے سے کرے جو اللہ کریم نے بتایا ہے اس لئے کہ وہ صحیح طریقہ ہے اور ہمیشہ صحیح طریقہ ہی سہل بھی ہوتا ہے پھر اس پر دائمی اور ابدی رضامندی بطور انعام بھی ہے لیکن اگر کوئی غلط روش اپنائے گا تو دُنیا میں بھی مشکلات کا سامنا کرے گا اور ابدی زندگی بھی تباہ کرے گا۔ اسلام نے دُنیا سے منع نہیں فرمایا بلکہ جس طرح ہر چیز کا موجد اس کے ساتھ طریقہ استعمال بتاتا ہے اور ہم زندگی بھر اس کی پابندی کرتے ہیں۔

اس جہان کے خالق نے بھی اس کا طریقۂ استعمال ارشاد فرمایا ہے اور یوں اپنی رحمتیں لُٹائی ہیں اور دین جسے نادانی سے ہم نے بوجھ سمجھ رکھا ہے ہماری انتہائی ضرورت ہے مگر اس کا احساس تب ہی ممکن ہے جب کوئی ذرّہ معرفتِ باری کا نصیب ہو آدمی اپنے خالق کو اپنی حیثیت کے مطابق سہی، پہچانے تو۔ اگر یہ دولت نصیب ہو تو اللہ کریم سے محبت نصیب ہو جاتی ہے اور اس کی اطاعت اور یاد کے بغیر زندگی کا کوئی تصوّر نہیں رہتا۔ ایک عجیب بات کہ اللہ کریم سے ڈرنے کا حکم ہے اور نبی رحمت ﷺ بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے بھی ہیں۔ تو میری ناقص رائے میں اُردو کا لفظ ڈر مفہوم کو ادا نہیں کر پا رہا۔ دراصل اللہ سے ڈر اس بات کا کہ رابطہ خراب نہ ہو بھی

محبت کی اک ادا ہے اور آپ کا مقام عالی کہ آدمی جو کچھ آج کر رہا ہے اس کے نتیجے میں جو نقصان قیامت کے روز اس کے سامنے آئے گا، سے مطلع فرماتے ہیں، یہ ادا بھی شفقت بھری ہے۔ اللہ کریم اپنی اور اپنے حبیب ﷺ کی محبت و اطاعت کی توفیق عطا فرمائے! آمین۔

آج ظہر کے بعد عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ رب جلیل کا شکر ہے کہ آسانی سے کر لیا۔ حرمِ پاک میں بدستور بھیڑ ہے۔ کہتے ہیں آجکل سکول بند ہو جاتے ہیں اور ملک بھر سے عرب یہاں جمع ہو کر عمرے بھی کرتے ہیں، خرید و فروخت بھی اور یہاں کے مزیدار موسم کا لطف بھی اٹھاتے ہیں، دوسرے علاقوں میں سردی شدید ہے تو میں سوچ رہا تھا کہ چلو! پکنک ہی سہی مگر بیت اللہ کی زیارت، نماز کی باقاعدگی اور طواف و سعی کے مزے بھی تو لوٹ رہے ہیں۔ اگر یہ پکنک ہی ہے تو بہت مبارک ہے۔

۲۳ جنوری ۱۹۸۹ء

کرنل صاحب کل جدہ تشریف لے گئے۔ کینیا کا ویزہ نہیں لگا تھا کہ پتہ کریں۔ وہاں سے اطلاع لائے کہ ان کا سفارت خانہ ریاض میں ہے لہٰذا پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑی کہ ہم پہلے ابوظبی جائیں۔ وہاں سے ویزا لے کر کینیا اور کینیا سے سیدھے کراچی۔ چنانچہ از سرِ نو پروازوں کا جائزہ لیا گیا اور اس کے مطابق پروگرام طے ہوا۔ اب دعا یہ ہے کہ اللہ کرے اس کے مطابق جہازوں میں جگہ مل جائے۔

آج زیارات کا پروگرام تھا۔ تقریباً نو بجے گھر سے احرام باندھ کر نکلے، کچھ کاریں احباب کے پاس تھیں اور باقیوں کے لئے کرائے کی گاڑیاں حاصل کی گئیں یوں یہ قافلہ شوق جبلِ ثور کے دامن میں جا ٹھہرا۔ نیچے سڑک سے اس چوٹی کی زیارت

کی جس کی ظاہری بلندی بھی آسمان کو چھو رہی تھی اور مقام و مرتبہ جو اللہ نے اسے بخشا ہے اس میں بھی کوئی دوسرا شریک نہیں۔

شاید اس موضوع پر پہلے کئی بار لکھ چکا ہوں بس اپنی حالت پہلی سی نہیں کبھی غارِ ثور تک جایا کرتے تھے پھر آدھی پہاڑی چڑھ کر دعا کر لیا کرتے تھے اور آج سڑک پر کھڑے کھڑے دامن پھیلا دیا۔ وہاں سے روانہ ہوئے تو باہر سے ہوتے ہوئے مسجد نمرہ، عرفات میں پہنچ گئے۔ سعودیہ نے سڑکوں کا جال بچھا دیا ہے اور ایک دوسری کو پلوں کے ذریعے اوپر نیچے سے اس طرح گزارا ہے کہ لاکھوں موٹروں کو بھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ وہاں سے نکل کر جبلِ رحمت پر پہنچے، دعا کی، نیچے مسجد نمرہ تک میدانِ عرفات اب ہرے بھرے درختوں سے بھر چکا ہے۔ پھر مشعر الحرام آکر رکے اور منیٰ سے ہوتے ہوئے کوہ حرا کے دامن میں دعا کی۔

یہ سب کچھ، یہاں پہ کئے جانے والے اعمال کی تفصیل امریکن نو مسلموں کے لئے باعث حیرت تھی جو پہلے ہی بیت اللہ شریف کی عظمت اور مسلمانانِ عالم کے اجتماع سے حیران تھے۔ غرض ظہر کی اذان ہوئی تو ہم عمرہ ادا کر چکے تھے۔ نماز ادا کر کے مکان پر آ گئے۔ آج صبح کے درسِ قرآن کا خلاصہ بھی عرض ہے تو ہمارا آج کا موضوع ذکرِ الٰہی تھا۔ آیہ کریمہ جس کا مفہوم اس طرح سے ہے کہ،

"اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو اور صبح و شام اس کی پاکی بیان کیا کرو، وہ تم پر رحمت نازل فرماتا رہتا ہے اور اس کے فرشتے تمہارے لئے طلبِ رحمت کرتے ہیں تاکہ تمہیں ظلمت سے نور کی طرف نکالے اور مومنوں سے بہت رحم کرنے والا ہے اور جس دن اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ انہیں سلام تحفہ میں ملے گا

اور اُن کے لیے بہت بڑا اجر و انعام ہے۔"

دو باتیں ہر معاشرے کی بُنیاد ہوتی ہیں، اوّل معاشی نظام اور دوسری نظریاتی اساس۔ اسلام کا معاشی ڈھانچہ اس بات پر اُستوار ہے کہ طلبِ رزقِ حلال اور کسبِ حلال فرض ہے مگر یہ فرض صرف کتابوں میں پڑھا، پڑھایا جاتا ہے کسی تقریر میں بھی سُننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اور فکری بنیاد ہے یادِ الٰہی، کہ مومن ہر آن اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، اللہ کی یاد سے دِل کو روشن رکھے۔ ہماری بدقسمتی کہ ہم اسے بھی بڑی حد تک کھو چکے ہیں اور نماز، روزہ یا تسبیحات یا تلاوت جو کبھی نصیب ہو جائے اُسے ہی ذکر جان کر کافی سمجھ بیٹھے ہیں۔

اِس حد تک یہ بات درُست ہے کہ یہ سب بھی ذکرِ الٰہی ہے مگر اِس سب کے ذکرِ الٰہی بنانے کے لیے زبانی ذکر کو اور ذکرِ الٰہی بنانے کے لیے دِل کا ذکر ہونا شرط ہے۔ اگر دل ذاکر ہے تو پھر یہ سب ہی نہیں۔ ہر عمل جو ہم شریعت کے مطابق کرتے ہیں ذکر ہے اور ہر کام جس سے شریعت روک دے، نہ کرنا ذکر ہے۔ اور اگر دل ذاکر نہ ہو تو یہ محض ضابطے کی کارروائی رہ جاتی ہے اس پر وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا جو واقعی ہونا چاہیئے مثلاً قرآن میں ارشاد ہے کہ نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ عجیب بات ہے آج کے نمازی کا تو یہ حال نہیں اور یہی صُورت حج اور رمضان یا تلاوت کی ہے اس لیے کہ ان سب کی رُوح ذکرِ قلبی ہے جس کا حکم خود رسُول اللہ ﷺ کے لیے موجود ہے کہ اپنے رب کے نام کی تکرار فرمایئے اور سیرتِ پاک میں وارد ہے کہ آپ ﷺ ہر حال میں اللہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔

آج کا مسلمان پوچھتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ذکر کرتے تھے؛ جن کے بارے میں اللہ کریم کی شہادت کتاب اللہ میں موجُود ہے کہ ان کی کھالیں اور

دل اللہ کا ذکر کرنے والے بن گئے۔ یعنی کھال سے لے کر نہاں خانۂ دل تک ہر بال ہر ہڈی ہر قطرۂ خون تک ذاکر تھا۔

افسوس! کہ آج ہم اس عظیم دولت سے خالی رسُومات پر لڑ جھگڑ رہے ہیں۔

اللہ کریم ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ارشاد ہے کثرت سے اللہ کا ذکر کرو، یعنی زندگی بھر جتنے کام کرو اُن میں سب سے زیادہ جو کام کیا ہو وہ ذکرِ الٰہی ہونا چاہیئے اور ہر آن، صُبح و شام ROUND THE CLOCK دن رات کرتے رہو، اس لیے کہ اس کی طرف سے رحمت کی بارش برستی رہتی ہے اور اس کے فرشتے بھی مومنوں کے لیے طلبِ مغفرت کرتے ہی رہتے ہیں تاکہ تمہیں تاریکی سے خواہ وہ عقیدے یا نظریے کی ہو یا عمل کی بچا کر روشنی اور نُور کی طرف لے جائے یعنی اُدھر سے کمی نہیں ہوتی تم غافل ہو جاتے ہو۔ یعنی تمہارے قلوُب ذکر سے خالی ہو جائیں تو قبولیت کی استعداد کھو بیٹھتے ہیں لہٰذا ہر آن اس کی یاد سے دِل آباد رکھو کہ وہ تم پر بہت مہربان ہے اتنا مہربان! کہ نہ صرف دُنیا بلکہ حادثۂ قیامت اور حضورِی بارگاہ کے وقت جب سب لرزاں و ترساں ہوں گے، مومنین کو سلامتی کے تحفے نصیب ہوں گے اور انعامات سے نوازے جائیں گے۔ اللہ کریم ہمیں ذکرِ قلبی اور دوامِ ذکر کی دولت نصیب فرمائے! آمین۔

آج کا دن بھی گیا۔ رات کچھ ساتھی پاکستان سے اور بھی آ گئے تھے۔ آج سب عُمرے کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔ اب باقی کل انشاء اللہ۔

۲۴ جنوری ۱۹۸۹ء

آج صُبح کچھ احباب دوبئی سے پہنچے اور شام لندن سے امیر حلقۂ ذکر کی آمد

ہے۔ مگر ہمارے قیام کا آج مکہ مکرمہ میں آخری دن ہے۔ کل بعد فجر طوافِ وداع کر کے جدہ جائیں گے اور دوپہر کی پرواز سے مدینہ منورہ انشاءاللہ العزیز۔

آج کا درسِ قرآن بھی مکہ مکرمہ کے موجودہ قیام کا آخری درس تھا۔ اللہ کریم کی عطا سے سورۃ حٰم سجدہ کی شروع کی آیات سے تلاوت کی سعادت حاصل کی۔ جس کا مفہوم ہے کہ رحمٰن اور رحیم کی طرف سے نازل کی گئی کتاب ہے جس کی آیات باتیں کھول کر بیان کر دیتی ہیں۔ رحمٰن اور رحیم دونوں صفاتی نام ہیں اور دونوں کا مادہ رحمت ہے مگر مفہوم کے اعتبار سے فرق ہے۔

رحمٰن کے وزن پر جو اوصاف بیان ہوتے ہیں، اُن میں دوام نہیں ہوتا، جیسے غضبان، غصّے سے بھرا ہوا یا عطشان، پیاسا۔ تو کوئی ہمیشہ غصے میں یا ہمیشہ پیاسا نہیں رہتا۔ اللہ کریم بھی کائنات کے خالق اور ربّ ہیں۔ لہٰذا دُنیا میں ظہورِ رحمانیت عام ہے جس کے طفیل کافر بھی بے حساب نعمتیں پاتا ہے، زندگی، وجود، اعضا، فضا غذا، اولاد اور مال غرض شمار سے باہر ہیں۔ اور فلاسفہ کا ایک قانون ہے کہ اگر ہم فرض کریں کہ دُنیا میں مَیں اکیلا ہوں۔ کوئی دُوسرا انسان موجود نہیں تو یہ سارا نظام، موسموں کا آنا جانا، سورج کا طلوع و غروب، بادل، بارش اور ہوا، سبزہ اور کھیتی، پھل اور پھول۔ ایک وسیع نظام صرف ایک بندے کے لئے اتنا بڑا نظام روبہ عمل ہے مگر یہ مظہرِ رحمانیت ہے۔ جس کا اظہار اس عالم میں تو ہے مگر جب دُنیا کی زندگی ختم ہوتی ہے تو رحمانیت کا پہنچنا یا اس کے طفیل مختلف فوائد کا پہنچنا ختم ہو جاتا ہے۔

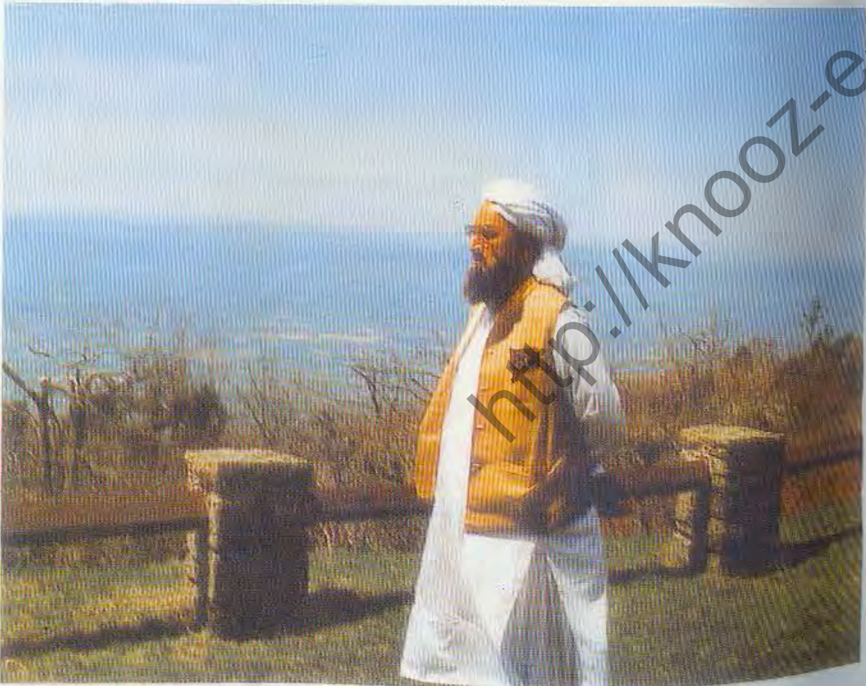
آخرت کی زندگی میں اظہارِ رحیمیت ہوگا۔ یہ ایسی صفت ہے کہ جب دوام ہو تو اس وزن پر بولا جاتا ہے جیسے حکیم یا کریم وغیرہ دائمی اوصاف ہیں۔ اسی طرح دُنیا میں بھی رحیمیت صرف مومن کا حصّہ ہے اور آخرت میں صرف رحیمیت کا اظہار ہوگا

جس سے کافر یکسر محروم رہے گا تو یہ کتاب جو جامع ہے۔ انسانی ضرورت کے تمام سوالات کو جو انسانی ارواح کی تربیت کا بُنیادی نقطہ اور سبب ہے۔ اُس ذاتِ کریم نے نازل فرمائی ہے جو انسانی اجسام کی پرورش کے لئے اس بہت بڑے نظام کو چلا رہا ہے۔ حالانکہ جسم مادی ہے اور اس کی غذا، دوا، لباس سب مادّی ہے مگر مادّے کو بھی سنوار سنوار کر اس کے لئے بناتا ہے اور پھل پھول اور اجناس بنا کر انسانی اجسام تک پہنچاتا ہے۔ اسی نے ارواح کی غذا اور دوا اس کتاب کو نازل فرما دیا ہے۔ ظاہر ہے روح تو جسم لطیف ہے تو اس کی غذا بہت ہی لطیف تر ہوگی۔ لہٰذا اپنا ذاتی کلام نازل فرمایا جس کا کمال یہ ہے کہ مظہرِ رحمانیت بھی ہے کافر کے لئے بھی دعوت ہے اور اگر قبول کرے تو رحیمیت کو پا سکتا ہے اور مومن کے لئے مظہرِ رحیمیت بھی ہے۔ ایسا واضح کہ اس کی آیات کھول کھول کر باتیں بیان کرتی ہیں اور یہ قرآن عربی زبان میں ہے اصل تو اللہ کا ذاتی کلام ہے جس کا اظہار عربی زبان میں ہوتا ہے لہٰذا اگر کسی اور زبان میں ہوگا تو وہ ترجمہ کہلائے گا، قرآن نہیں! یہی وجہ ہے کہ نماز کسی اور زبان میں نہیں ہوتی۔ دوسری زبانوں میں تراجم پڑھنا اور سمجھنا اگرچہ ہماری ضرورت ہے مگر تلاوتِ قرآن عربی متن ہی کے پڑھنے کو کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب حُسنِ عمل پہ بشارت سُناتی ہے تو بدعملی کے خوفناک نتائج سے بروقت مطلع اور خبردار بھی کرتی ہے۔ انذار کا یہ مفہوم بھی شفقت ہی کا ایک پہلو ہے۔ مگر انسانوں کی بدنصیبی کہ اتنی بڑی نعمت سے ان کی اکثریت محروم رہتی ہے اور کہتے ہیں کہ آپ ﷺ جو دعوت دیتے ہیں وہ ہمارے اوپر اثر نہیں کرتی کہ ہمارے دلوں پہ پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور آپ ﷺ کی آواز سے ہمارے کان بھی بند ہیں بلکہ ہم سے آپ کے اور ہمارے درمیان ایک دیوار سی حائل ہے۔ لہٰذا ہم اپنا کام کرتے ہیں



میری لینڈ

میدان عرفات



ہیں، آپ اپنے کام سے کام رکھیں اور یہی ان کی بدنصیبی کی انتہا ہے کہ روحانی موت مر چکے ہیں۔ ارواح سماعت اور بصارت سے محروم، غذا، دوا سے بے نیاز ہو چکی ہیں۔ گناہوں کی سیاہی اور کفر و شرک کی تاریکی نے دلوں کو اندھا کر دیا ہے لہٰذا اپنے اعمال اپنی ذمہ داری پہ کرتے ہیں۔

یہ حال تو کفّار و مشرکین کا تھا لیکن جو لوگ باوجودیکہ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، ضروریاتِ دین کو مانتے ہیں مگر عملی زندگی میں اپنے اعمال اپنی پسند سے کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ میرے خیال میں تو شاید وہ نفع جو قلوب حاصل کرتے ہیں اور رابطہ جو دِل کو نصیب ہوتا ہے اس میں کمی ہے ورنہ کسی مسلمان کا آپ ﷺ کی اطاعت نہ کرنا کوئی سمجھ میں نہ آنے والی بات نہیں۔

اگلی آیہ کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے، "اے میرے نبی! فرما دیجئے کہ میں بھی تمھاری طرح بشر ہوں"۔ یہ ایسی بات ہے جس پر نہ صرف ملکِ عزیز میں، بلکہ پوری دُنیا میں مسلمان دست و گریبان رہتے ہیں۔ کچھ یہاں سے ثابت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ ہماری طرح بشر ہیں۔ دوسرے کہتے ہیں، نہیں! آپ ﷺ نورُ ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ آپ نے میدانِ سیاست میں دیکھا ہوگا کہ ذرا سی بات کو سیاستدان اُچھالنا شروع کر دیتے ہیں اور مخالف کو بدنام کرتے ہیں۔ خود جان رہے ہوتے ہیں کہ اندر کوئی بڑی بات نہیں۔ یہی حال دونوں فریقوں کے علماء کا ہے۔ اصل مسئلہ پیشہ ورانہ رقابت ہے اور جن کو یہ لالچ نہیں وہ کوئی جھگڑا نہیں کرتے۔ بہرحال مَیں نے ایک مضمون اس موضوع پر سپردِ قلم کیا تھا۔ مُدّت ہوئی، چھپ چکا ہے "نور و بشر"۔ آج کا موضوع دُوسرا ہے۔ اس آیہ کریمہ کو اس پسِ منظر میں دیکھیں کہ جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے تو دُنیا میں کوئی بھی اللہ کے نام

سے واقف نہ تھا اور اقوامِ عالم کسی نہ کسی رُوپ میں اجسام کی پُوجا کرتی تھی، وہ بُت ہوں، درخت ہوں، پہاڑ ہوں یا جانور، آگ ہو یا سُورج چاند۔ بہرحال رُوئے زمین پر بسنے والے انسان مجسم خداؤں کو پُوجنے کے عادی تھے۔

جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے تو اس قدر عجائبات آپ سے ظاہر ہوئے کہ دیکھنے والے بس دیکھتے رہ گئے۔ زبان دان خاموش، شاعر گنگ اور ادیب سربگریباں، آپ ﷺ کا بچپن، لڑکپن، جوانی حیران کن اور آپ ﷺ کے معجزات نے عقولِ انسانی کو عاجز کر دیا۔ شبِ معراج کے واقعات، مکّہ مکرّمہ بیٹھ کر بیت المقدس اور قافلوں کی صحیح صحیح صُورتِ حال کا بیان، چاند کا انگلی مبارک کے اشارے سے دو ٹکڑے ہو جانا اور بے شمار معجزات جو پڑھتے بھی ہیں سُنتے بھی ہیں۔ یہ سب ثابت کر رہے تھے کہ آپ ﷺ کوئی عام انسان نہیں ہیں بلکہ آپ شاید مافوق الفطرت ہستی ہیں۔ اور یہ ایک ایسا تصوّر تھا جو پہلے معاشرے میں موجود تھا اور انسان کو ہی مافوق الفطرت سمجھ کر ان کے بُت تک پُوجے جا چکے تھے۔ اگر حضور ﷺ بھی فرماتے کہ میرے سامنے جُھکو تو اُس دور کا انسان یہ بات بہت جلد پا لیتا کہ باپ دادا سے اُسے یہی رسم بطور دین ملی تھی شاید کوئی آواز بھی خلاف نہ اُٹھتی یا اُٹھتی بھی تو حامیوں کی کثرت میں دب جاتی مگر عجیب بات تو یہی ہے کہ یہ سب کچھ ثابت فرما کر ارشاد ہوتا ہے،

"لوگو! میں تمھارے جیسا ایک انسان ہوں، پُوجا میری نہیں ہو گی عبادت نہیں کرو گے بلکہ خالقِ حقیقی جو میرا تمھارا سب کا رب ہے اکیلا مستحقِ عبادت ہے۔ آؤ! میرا سر بھی اس چوکھٹ پہ دھرا ہے تم بھی جُھک جاؤ!"

زمانے کو آپ ﷺ کی اس دعوت نے ہلا کر رکھ دیا جو آپ ﷺ
کی صداقت کی بھی بہت بڑی دلیل ہے تو پھر اگر یہ بات ہے تو یہ اتنا بڑا فرق
کیوں ہے کہ آپ ﷺ بے شک مخلوق ہونے میں برابر ہیں یعنی اللہ کی مخلوق
ہیں، بشر ہیں مگر آپ جیسا کوئی دُوسرا بشر ہے نہ کوئی دوسری تخلیق۔ آپ ﷺ تو
فخرِ بشریت ہیں، اس کی وجہ۔ فرمایا، مجھ پر وحی آتی ہے۔ اللہ کا کلام نازل ہوتا ہے،
مَیں اللہ کی رحمت کا چشمہ صافی ہوں، تم پیاسے ہو مَیں تمہاری ضرورت ہوں اور
وحی الٰہی کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کی ذات جیسی کوئی ذات
نہیں۔ اس کے اوصاف میں بھی کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ اگر کوئی شرک کرے گا تو
خود تباہی سے دوچار ہوگا۔

یہاں ایک بات صاف ہوگئی کہ انسان تو انسان ہی ہوتا ہے۔ عطائے الٰہی
اُسے سرفراز کردیتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی کو حال نصیب ہے۔ مراقبات و مقامات نصیب
ہیں تو اس لئے نہیں کہ وہ کوئی بہت برگزیدہ ہستی ہے یا اس جیسا کوئی دوسرا نہیں،
بلکہ یہ اللہ کا احسان ہے جس نے ایک عام آدمی پر لُطف و کرم کی بارش کردی۔ اور
اسے اپنی خلق کی رُوحانی سیرابی کا سبب بنادیا۔ بہت سے عابد و زاہد اس دھوکے
میں مارے گئے کہ شاید ہم نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے لیا ہے۔ یہ ہمارا بڑا
کمال ہے۔ ؎

دریں ورطہ کشتی فرو شُد ہزار
کہ پیدا نہ شُد تختہ بر کنار

اس سمندر میں لاکھوں کشتیاں ایسے غرق ہوئیں کہ مُڑ کر کوئی تختہ بھی کنارے
نہ پہنچ سکا۔ لہٰذا جس قدر توفیقِ عبادت نصیب ہو، ذکر اذکار نصیب ہوں، مجاہدہ

کرسکیں یا مراقبات و مقامات نصیب ہوں، اس قدر زیادہ شکر کرنا ضروری ہے نہ کہ
اپنی بڑائی میں گرفتار ہوجاتے۔ جب آقائے دوجہاں ﷺ فرماتے ہیں، مَیں تو
تمہاری طرح بشر ہوں۔ سارے کمالات میرے ربّ کی عطا ہے جس نے مجھے وحی سے
سرفراز فرمایا ہے، تو دُوسرے کسی کے اکڑنے کی تو کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اللہ کریم
دین کی سمجھ عطا فرمائیں اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائیں! آمین۔

آج ناشتہ کے بعد ہی عمرے کے لئے چلے گئے اور دوپہر تک فارغ ہو
گئے۔ بحمد للہ! آج بہت اچھی طرح چل کر عمرہ پورا کرلیا اور اللہ کریم کا شکر ادا کرتا ہوں
جس نے اس قدر جلد توانائی بحال فرماکر یہ توفیق بخشی۔ پھر دن بھر قیام گاہ پر رہا۔
بچے اہلیہ اور ساتھی تو حرم شریف گئے ہیں۔ اب مغرب قریب ہے۔ سب لوگ آجائیں
گے پھر ذکر ہوگا اور صبح انشاء اللہ نماز حرم شریف میں ادا کرکے طواف وداع کریں
گے اور ناشتہ کرکے جدہ چلے جائیں گے۔ دوپہر کی پرواز سے مدینہ منورہ حاضری ہے
احباب سڑک کے راستہ تشریف لے جائیں گے۔

اللہ کریم قبولیت سے نوازیں! آمین۔

۲۶ جنوری ۱۹۸۹ء

کل تو کچھ لکھا نہ تھا کہ صبح درس تو ہوا نہ تھا، لوگوں نے ناشتہ کرکے مدینہ منورہ
کے لئے روانہ ہونا تھا اور ہمیں بھی جدہ پہنچنا تھا چنانچہ فجر کے بعد طواف وداع کیا۔
اشراق حرم میں ادا کرکے نکلے اور ناشتہ جدہ آکر کیا۔ تھوڑی دیر آرام بھی کرلیا، غسل
وغیرہ کیا اور پھر ائرپورٹ چلے آئے چنانچہ ۴۵-۱۱ پر پرواز کرکے ایک بجے بعد دوپہر
ہم مدینہ منورہ کے ہوائی اڈے پر تھے۔ یہاں کے احباب منتظر تھے۔ گاڑی میں بیٹھے

اور قصرِ نجد پہنچے۔ جس کی آخری منزل کے سب کمرے احباب کے لئے بُک تھے، ظہر ادا کی جو لوگ علی الصبح سڑک کے راستے نکلے تھے۔ وہ ہم سے گھنٹہ بھر پہلے پہنچ چکے تھے تھوڑی دیر آرام کر کے عصر حرم نبوی میں ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور روضہ اطہر پر سلام کے لئے حاضر ہوئے۔ پھر مغرب ادا کر کے وہاں سے اُٹھے اور ذکر قیام گاہ پر کیا۔

آج علی الصبح یہاں کا پہلا درس ہوا۔ پندرھویں پارے کی پہلی آیہ کریمہ تلاوت کرنے کا شرف نصیب ہُوا جس کے ایک خاص پہلو پہ کچھ عرض کیا کہ واقعہ معراج شریف اس قدر معرُوف ہے اِتنا بیان ہوتا ہے۔ اس موضوع پر اِتنا لکھا جا چکا ہے کہ لوگ پڑھ یا سُن کر ضرور جانتے ہیں۔

میرے پیشِ نظر اس کا یہ پہلو ہے کہ جب یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا تو صورتِ حال یہ تھی کہ سارا کُفر اور سارے مُشرک آتش زیر پا تھے۔ صدیوں کے مذاہب اُن کے باپ دادا کی رسُومات، اُن کے تراشے ہوئے بُت، اُن کی تہذیب، اُن کی سیاست، ان کا عدالتی نظام، غرض کچھ بھی تو نہیں بچا تھا اور آپ ﷺ نے لا اِلٰہ کی تلوار سے سب کے پرخچے اُڑا دیئے تھے اور سب کے لئے صرف ایک دروازہ کھلا چھوڑا تھا، اِلّا اللہ کا۔ سارا معاشرہ جس میں ابھی صرف چند لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے خلاف غم و غصہ سے بھرا ہوا تھا۔ ایذا رسانی کی ہر صورت اختیار کی جا رہی تھی۔ مارنے سے نہ چُوکتے، طعنے دینے سے باز نہ آتے۔ ہر طرح کی مصیبت کھڑی کرنے کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے کہ اللہ کریم نے اپنے حبیب ﷺ کو معراج سے نوازا۔ یہ ایسی عجیب بات تھی کہ ربِّ جلیل نے اپنی پاکی سے بات شروع کی کہ اللہ جو چاہے کر سکتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں نہ اسے کسی سے اجازت

حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مدد۔ اس کے باوجود آج بھی لوگ موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ معراج شریف خواب کا واقعہ ہے۔

آج جبکہ چاند تک تو انسانی ایجاد کردہ راکٹ پہنچ چکا ہے لوگوں کو معراجِ نبوی پہ جو قدرتِ الٰہی کا مظہر ہے یقین کرنا مشکل لگ رہا ہے تو اُس زمانے میں جب پہیّہ ہی نہ تھا نہ موٹر، نہ جہاز۔ یہ کہنا کہ میں جسمانی طور پر بہت دُور بیت المقدس گیا وہاں انبیاء کو نماز پڑھائی پھر پہلے آسمان پر، پھر دوسرے حتیٰ کہ ساتویں آسمان تک گیا پھر سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچا، اُس سے آگے تشریف لے گیا۔ جنّت کا ملاحظہ فرمایا، دوزخ کو دیکھا۔ برزخ سے گزرا۔ لوگوں کو اِن اِن حالات سے دوچار دیکھا۔

یہ سب اتنا عجیب تھا۔ اُس دَور میں اسے بیان کرنا اور ان حالات میں جو آپ ﷺ کو درپیش تھے، یہ صرف آپ ﷺ ہی کا حوصلہ تھا اسے دیکھنے کا شرف اگر آپ کو نصیب ہوا تو بیان کے لئے آپ ﷺ ہی کی ضرورت تھی کوئی بھی دُوسرا اتنی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اُن دِنوں بیت اللہ شریف کے گرداگرد چبوتروں پہ سارا دِن لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ تشریف لائے تو سب سے پہلے جس نے یہ واقعہ سُنا وہ ابوجہل تھا وہ اس قدر بوکھلا اُٹھا کہ باوجود اس کے کہ جانتا تھا آپ ﷺ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، کہنے لگا اگر میں کچھ لوگوں کو بلالوں تو سب کے سامنے یہ بات دُہرا دیں گے؟

وہ اسے اس قدر ناقابلِ یقین سمجھتا تھا کہ اسے ڈر پیدا ہو گیا شاید میں لوگوں سے کہوں ایسا کہتے ہیں تو کہیں یہ انکار نہ کریں۔ مگر آپ نے سب کے سامنے دُہرا دیا تو کہنے لگا، ہم اونٹ کو خوب پالتے ہیں پھر اسے بھگا بھگا کر اس کا جگر کباب کر دیتے ہیں تو بھی آنے جانے میں مہینوں صرف ہوتے ہیں۔ یہ عجیب بات

ہے کہ راتوں رات ہو کر آ گئے۔ وہ آگے کی بات نہیں کرتا تھا، صرف بیت المقدس تک آنا جانا ہی حیران کن تھا۔

دوڑتا ہوا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا اور کہا،

"سنا کچھ آپ کے صاحب یہ کہتے ہیں۔"

انھوں نے فرمایا، "ہم تو اس سے بھی بہت بڑی بات پر ایمان لا چکے ہیں کہ آپ پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے، اب اگر انھوں نے یہ فرمایا تو سچ فرمایا۔"

حضور اکرم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا، "ابوبکر صدیق ہے!"

تب سے انہیں یہ لقب نصیب ہوا۔ یہ نبی برحق ﷺ کے اعتقاد علی اللہ کا کرشمہ تھا کہ کوئی کیا کہے گا کیا سوچے گا؟ اس کی پرواہ نہ کی۔ اللہ کا حکم کیا ہے صرف یہی پیش نظر رہا۔

آج کے مادی ترقی کے دور میں بجلی کے استعمال نے دنیا سمیٹ دی اور زمین کی تو بات ہی کیا، کیمرے چاند کی سطح کے فوٹو لمحوں میں زمین پر پہنچا دیتے ہیں یہ صرف بجلی کی لطافت کے کرشمے ہیں۔ تو روح، جو عالم امر سے متعلق ہے۔ اور فرشتے سے بھی لطیف تر ہے اس کے لئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اللہ قادر ہے کہ روح کا تعلق جسم سے بھی اور علیین یا سجین سے بھی قائم فرما دیتا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہاں! اس جسم اطہر کی لطافتیں دیکھو جو انسانی جسم ہونے کے باوجود ان بلندیوں پر جلوہ فگن ہوا جہاں کا تصور بھی ہر روح نہیں کر سکتی۔

حضور اکرم ﷺ جسد اطہر کے ساتھ مکہ مکرمہ سے بیت المقدس پھر آسمان پر اور آگے جہاں تک رب نے چاہا تشریف لے گئے۔

بہرحال، میرا مدعا اس واقعہ کی عظمت بیان کرنا نہیں۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ میرے پیش نظر یہ بات ہے کہ اس پس منظر اور ان حالات میں یہ واقعہ بیان کرنا مشکل کام تھا، مگر آپ ﷺ نے کیا۔ مشرکین و کفار نے طوفان کھڑا کر دیا۔ پھر سوال کیے گئے کہ مسجد کے دروازے کھڑکیاں بتلایئے! کتنے ہیں؟ کیسی ہے؟ وغیرہ۔ بھلا آپ نے کتنے عمرے اور حج کیے، کبھی مسجد حرم کی کی کھڑکیاں شمار کی ہیں۔ آپ ﷺ نے تو رات وہاں دو رکعت کی امامت فرمائی۔ جس کی سعادت اللہ نے تمام انبیاء کو نصیب فرمائی تھی۔

یہاں بھی یاد رہے انبیاء جمع ہوتے تھے۔ ارواح انبیاء کا ذکر نہیں، آپ نے برزخ کا مشاہدہ فرمایا۔ دوزخ کو دیکھا، جنت کو ملاحظہ فرمایا۔ ہر جا کے حالات بیان فرماتے ہیں۔ اب اللہ کی قدرت دیکھئے! مشرکین نے جس قدر شور کیا۔ بات اتنے زور سے پھیلی اور کتنے ایسے خوش نصیبوں تک پہنچی، جن کی قسمت میں ہدایت پانا لکھا تھا۔ اب دیکھیں قرآن حکیم میں ذکر کرنے کا حکم موجود، تعامل امت میں موجود بلکہ امت کے بہترین حضرات، سب ذاکر اور منور القلوب تھے۔ پھر اس پر معذرت خواہانہ رویہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ ضرورت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر کو، اس کی تلقین کو، طریقے کو، دوسروں تک پہنچایا جائے۔ اگر کوئی مخالفت کرے گا تو اللہ کریم خود کارساز ہے۔ آپ بات خلوص سے کریں تو مخالف کا رد بھی آپ کے مشن کو فائدہ پہنچائے گا۔ اور یہ بات کہ اسے دوسروں سے چھپایا جائے درست نہیں۔ اگر تو یہ دین ہے تو اسے بیان کیا جائے یا خدانخواستہ دین نہیں ہے تو پھر چھپ کر کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ لہٰذا پہلے یقین کامل حاصل کرنا ضروری ہے اور یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ اس سے دل میں سکون، عمل میں نیکی اور یقین میں قوت

پیدا ہو رہی ہے تو پھر اس کو آدھے دل سے نہیں، صمیمِ قلب سے اور جم کر کرنا اور
دوسروں تک پہنچانا ہی زندگی کا بہترین مصرف ہے۔

اس کے بعد، آج تھوڑی دیر بازار تک گیا اور ہاتھ کی چھڑی کے بغیر گیا۔
اگرچہ تھوڑا ہی پیدل چلا زیادہ آنا جانا تو کار میں ہوا مگر اس کے باوجود ابھی ٹانگ
پوری طرح بوجھ برداشت نہیں کرتی۔ دن بھر درد رہا۔ اب شام ہے اور ٹانگوں میں
درد بدستور ہے۔ اللہ کریم رحم فرمائیں تو انشاء اللہ درست ہو جائے گا۔ دونوں چھوٹے
بچے ساتھ تھے۔ چند چھوٹی چھوٹی چیزیں انھوں نے خریدیں اور واپس آ گئے۔

۲۷ جنوری ۱۹۸۹ء

آج جمعۃ المبارک تھا، رات کافی لوگ آئے۔ چھٹی تھی، حرم شریف میں بھی
بھیڑ حج کی طرح ہو گئی، علی الصبح درسِ قرآن ہوا آج سورہ کہف کی چوتھی آیت نمبر ۲۷
بیان کی جس کا مفہوم اس طرح سے ہے کہ آپ خود کو ان لوگوں کے ساتھ رکھیے
جو صبح و شام یا رات دن اللہ کو اس کی رضا کے لیے یاد کرتے ہیں اور کسی بھی
دنیاوی فائدے کے لیے ان کی طرف توجہ کم نہ کیجیے۔ نیز جن لوگوں کے قلوب
کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اُن کی پرواہ مت کیجیے کہ ان کی بات تو
بگڑ چکی۔

اس آیہ مبارکہ میں نبی کریم ﷺ کو خطاب فرما کر فرمایا جا رہا ہے کہ
آپ اپنے آپ کو بالالتزام ایسے لوگوں کے ساتھ رکھیے" واصبر "صبر سے مراد ہوتا
ہے باگ کھینچ کر روک لینا یعنی پوری کوشش کر کے کوئی کام کرنا، اگرچہ ہمارے
ہاں تو صرف ایک معنی اکثر لیا جاتا ہے کہ موت یا نقصان پر شور نہ کرے تو کہتے

ہیں صبر کیا، مگر شرعاً اطاعتِ الٰہی پر کاربند رہنے کو صبر کرنا کہا جاتا ہے اور یہاں
یہ معنی نہایت موزوں ہے کہ اپنے آپ کو بالالتزام ایسے لوگوں کے ساتھ رکھیے جو
رات دن یعنی ہر آن اللہ کی یاد میں مصروف رہتے ہیں اور یہ اہتمام محض اللہ کی
رضا کے لیے کرتے ہیں۔

یہ آیہ کریمہ حجرہ مبارک میں نازل ہوئی یعنی حجرہ مبارک جس پر سبز گنبد بنا ہوا
ہے۔ یہ سیدہ عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ مبارکہ تھا۔ آپ ﷺ حجرہ
مبارک سے مسجد میں تشریف لائے تو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بیٹھے ذکر کر
رہے تھے تو فرمایا — اللہ کا شکر ہے، مجھے جیسے لوگوں کے ساتھ رہنے کا حکم
دیا ویسے لوگ بھی عطا فرما دیئے۔

آج جو لوگ ذکر کرنا نہیں چاہتے، اُن کا سوال ہوتا ہے کہ کیا صحابہ کرام
ذکر کرتے تھے؟ کیا آپ ﷺ ذکر کیا کرتے تھے؟ حالانکہ یہ سب کچھ ثابت
ہے اور کتابِ الٰہی میں حکم موجود ہے۔ سُنت میں عمل موجود، محض نہ کرنے کے بہانے
ہیں ورنہ علمائے ربانی نے تو ذکرِ قلبی کو مسلمان مردوں اور خواتین کے لیے واجب لکھا
ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب اللہ کا مطالبہ ہی یہی ہے۔ رات دن ہر وقت
سوائے اس کے کہ قلب ذاکر ہو ذکر ممکن ہی نہیں۔

بہرحال اس موضوع پر بہت دفعہ بات ہو چکی ہے۔ یہاں تو بات ہو رہی
ہے کہ آقائے نامدار ﷺ تو رحمت للعالمین ہیں۔ آپ کا قلب اطہر تو
کفار کے لیے پریشان ہو جایا کرتا تھا۔ اور مومنین کے لیے تو آپ ﷺ تھے
ہی رؤف و رحیم، اس کے باوجود ذاکرین کے لیے بطورِ خاص ارشاد ہو رہا ہے
کہ آپ ان میں تشریف فرما ہوا کریں۔ اور اس کے لیے دنیا کا بڑے سے بڑا فائدہ

قربان کرنا پڑے تو کر گزریں۔ سُبحان اللہ! یہاں کوئی بھی ذاکر اپنی حیثیت، اپنا ذکر اور اپنی محنت دیکھے اور پھر آپ ﷺ کی عظمت، شان، رفعت مقامات کا تصوّر کرے اور اللہ کی عطا دیکھے کہ کس عظیم انعام سے نوازا جا رہا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ اتنی بڑی بات ہے جس کا احاطہ کرنا ہماری عقول کا کام ہے نہ ہمارے علوم کے بس میں۔ اور نہ ہی یہاں عقل و خرد دم مار سکتی ہے۔

اب رہی یہ بات، کہ کوئی کہے یہاں مطلق ذکر کی بات ہے آپ خواہ مخواہ اسے ذکرِ قلبی کی طرف لے گئے۔ تو اگلی بات پہ توجّہ کرنے سے بات کُھل جاتی ہے کہ ارشاد ہُوا جن کے دِلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے ان کی پرواہ نہ کریں تو ایک بات تو یہ متعیّن ہو گئی کہ بات قلبی ذکر ہی کی ہو رہی ہے۔ دوسرے یہ پتہ چلا کہ قلبی ذکر کا نصیب نہ ہونا اللہ کی طرف سے بعض گناہوں کی سزا کے طور پر مسلط فرمایا جاتا ہے کہ یہاں غفلت عن الذکر کو اپنی طرف منسوب فرماتے ہوئے فرمایا کہ،

"جن کے قلوب کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا آپ ان کی بات پر کاہ اہمیت نہ دیں کہ ان کی بات بگڑ چکی ہے"۔

اللہ کریم اپنی یاد میں زندہ رکھے اور خطاؤں سے درگزر فرماتے! آمین

آج دس بجے حرم شریف چلے گئے، جُمعہ تک وہیں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ بہت بھیڑ اور بڑی رونق تھی۔ اللہ ان گھروں کو ہمیشہ آباد رکھے! اب عشاء کی اذان ہو رہی ہے اور کمرے کی کھڑکی سے حرمِ نبوی اور گنبدِ خضرا کا بہت خوبصورت منظر سامنے ہے۔

آج بہت سے لوگ عشاء کے بعد رخصت ہو رہے ہیں کچھ کل جائیں گے اور پھر اپنی باری بھی چلنے کی آجائے گی یہی اس عالم کا نظام ہے۔

۲۸، جنوری ۱۹۸۹ء

الحمدُللہ! نیا دِن آیا اور نئی مصروفیات بھی لایا۔ یہاں کی راتیں بھی اور دن بھی ہمیشہ یادگار ہوتے ہیں۔ مسجدِ نبوی کی توسیع کے سِلسلے میں دُور دُور تک عمارتیں صاف کر دی گئی ہیں اور اب دُور دُور سے گنبدِ خضرا کے نظارے نصیب ہوتے ہیں۔ ہم یہاں چھٹی منزل پہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ رات کو روشنیوں کا شہر ہوتا ہے اور سبز گنبد کی الگ بہار نظر آتی ہے۔ دن کو سورج نِکلتا ہے تو اس کے حُسن پہ نچھاور ہونے لگتا ہے۔ رات دِن اُٹھتے بیٹھتے نظر قربان ہو ہو جاتی ہے اور بے اختیار صلوٰۃ و سلام زبان پہ جاری ہو جاتا ہے۔

آج ایک امریکی دوست نے گھر فون پر بات کی۔ بیوی نے بتایا کہ یہاں بہت برف پڑ رہی ہے تو کہتا ہے،

"I AM IN PARADISE, I AM NOT COMING BACK."

بھئی! میں جنّت سے بول رہا ہوں اور وہاں واپس آنا نہیں چاہتا۔

اُس نے سو فیصد سچ کہا کہ یہی شہرِ خُوباں ہے جہاں جنّت کے باغوں میں سے باغ بھی ہے اور جہاں جنّت کے باسی ہی نہیں جنّت بانٹنے والے بھی تشریف رکھتے ہیں۔ ﷺ

بچّے والدہ کے ساتھ حرم شریف گئے ہیں۔ روضۂ اطہر پہ ہدیۂ سلام نچھاور کرنے اور میں آج کے درس کی چند سطور نقل کرنے چلا ہوں، اللہ ہی کی طرف سے سب توفیق ہے اور وہی کارسازِ حقیقی ہے۔ آج سورہ حج کی گیارھویں آیہ مبارکہ تلاوت کی جس کا مفہوم کچھ ایسے ہے کہ،

"کچھ لوگ اللہ کی عبادت مشروط انداز میں کرتے ہیں، اگر تو کام بن گیا

کوئی مقصد پورا ہو گیا یا کسی خواہش کی تکمیل ہو گئی تو مطمئن ہو گئے
اور اگر کسی امتحان و آزمائش میں پڑ گئے تو سب کچھ چھوڑ بیٹھے ایسے
لوگ دُنیا و آخرت دونوں جہانوں میں خسارہ پاتے ہیں، جو بہت
بڑا نقصان ہے۔"

عبادت دراصل اس اطاعت کا نام ہے جو کسی سے نفع کی اُمید پر یا
اس سے ڈر کر کی جاتی ہے۔ اسی لئے اگر ہم کسی کی اطاعت کرتے ہیں اور اللہ کے
حکم کے خلاف کرتے ہیں تو یہ اس کی عبادت قرار پائے گی۔ حتیٰ کہ اللہ کے حکم کے
خلاف اپنی خواہشات کی اطاعت کو خواہشات کی عبادت قرار دیا گیا، تو گویا اطاعت
کرنے والا اپنے محتاج ہونے کا اقرار کرتا ہے اور جس کی عبادت کرتا ہے اُسے حاکم
تسلیم کرتا ہے تو پھر یہ مطالبہ درست نہیں ٹھہرتا کہ عبادت کے بعد توقع رکھے اب
اللہ کریم ایسا ہی کریں گے جیسا میں کہوں گا۔ یہ تو معاملہ ہی اُلٹ گیا گویا پہلے اُس
نے عبادت کی تھی اب اللہ اس کی عبادت کرے تو یہ باطل ہے اور تمام مذاہب
باطلہ کی بُنیاد ہی اسی فلسفے پر ہے کہ ہر عبادت کے ساتھ کوئی نہ کوئی دُنیا کا معاملہ
ہی جوڑ رکھا ہے اسلام اس سے بہت آگے لے جاتا ہے۔ اور عبادت کا حکم
اس لئے دیتا ہے کہ اللہ کریم عبادت کا مستحق ہے۔ اس کی شان ایسی ہے اُس کی
ذات ہی ایسی ہے، اس کے احسان ہی اتنے ہیں کہ اس کی عبادت کی جائے،
اس کی اطاعت کی جائے لہٰذا ہر عبادت اطاعت ہو گی یعنی از خود بنانا درست
نہیں جس طرح کرنے کا حکم ملے، ویسے کی جائے گی اور ہر اطاعت عبادت قرار
پائے گی۔ دُعا بھی اطاعت و عبادت دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے اس لئے کثرت
سے دُعا کرنے کا حکم ہے۔ مگر ان تمام عبادات، اطاعات اور دُعاؤں سے کیا

ملتا ہے؟ جب کرنا تو اللہ نے وہی ہے جو وہ چاہتا ہے۔ تو نہیں! اس کا صلہ
قربِ الٰہی، رضائے الٰہی اور وہ حوصلہ ہے جو ان عبادات کے طفیل ملتا ہے اور جو
کچھ اللہ کی طرف سے آئے اُسے برداشت کرنے کی قوت نصیب ہوتی ہے، اگر
غریبی و مفلسی ہو یا بیماری اور سفر تو بھی، امارت اور شان و شوکت یا حکومت و سلطنت
ہو تو بھی انسان اسی خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں سجدوں کی لذت سمیٹتا
رہتا ہے، جیسے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو قرآن حکیم کے مثالی مسلمان ہیں
مکہ مکرمہ کی مشکل ترین زندگی میں اور ہجرت کے کٹھن سفر میں بھی مدینہ منورہ کی شروع
کی پُرخطر حیات میں بھی اور پھر بہت بڑی سلطنت کے مالک و مختار بن کر بھی اسی
خشوع و خضوع سے سجدہ ریز رہے جو قربِ الٰہی کا ثمر اور عبادت کا پھل کہا جا سکتا
ہے کبھی مکہ کا مہاجر اسی مسجد نبوی میں بیٹھ کر چین سے ہسپانیہ تک اور افریقہ سے
سائبیریا تک کا حکمران بھی تھا۔ مگر ہر دو حال میں اپنے ربّ سے اس کا تعلق
ویسا ہی رہا۔ اگر کوئی اس راز کو نہ پا سکے اور محض دُنیا کمانے کے لئے یا خواہشات کی
تکمیل کے لئے چلہ کشیاں کرتا بھی رہے تو اوّل تو وہ خواہشات پوری نہ ہونے پر یہ
سب چھوڑ چھاڑ بیٹھتا ہے اور خواہشات اتفاقاً چلّے سے مطابقت پا جائیں ورنہ
تو قانونِ قدرت کے تحت ہی پوری ہوتی ہیں اور اگر نہ بھی چھوڑے تو ان خرافات
پر اللہ کی بارگاہ میں کوئی اجر ملتا ہے نہ دُنیا میں بھلا ہوتا ہے بلکہ دُنیا و آخرت
ہر دو عالم میں نقصان اُٹھانا پڑتا ہے اور یہ نقصان بہت بڑا نقصان ہے۔

اللہ کریم اس سے پناہ دیں اور اپنی رضا کے لئے اپنی عبادت کرنے کی
توفیق بخشیں! آمین۔

۲۹ جنوری ۱۹۸۹ء

آج بھی حسبِ معمول بعد از فجر درسِ قرآن ہُوا، آج کا موضوع تھا معاشرے کی اصلاح کا اسلامی طریقہ ۔ اگرچہ آج کی مادی ترقی نے عجیب و غریب ایجادات بھی دی ہیں، حتےٰ کہ ایسی مشینیں وجود میں آچکی ہیں جو بات سُن کر بتادیتی ہیں کہ بولنے والے نے سچ کہا یا جھوٹ بولا۔ خفیہ کیمروں اور وائرلیس کے ذریعے رابطے نے پولیس کے کام میں بھی بہت آسانی پیدا کردی ہے۔ مجرموں اور جرائم کا کھوج لگانے کے جدید طریقے اور پھر ایسے ممالک، جہاں حکومت واقعی جرائم کا سدِّباب کرنے میں پوری طرح کوشاں ہے۔ رشوت یا سفارش پر کوئی مجرم نہیں بچ سکتا۔ مگر ان تمام کوششوں کے باوجود اگر جرائم کی شرح دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے اور ایسے بھیانک اور گھناؤنے جرائم ہوتے ہیں کہ انسان سُن کر لرز اٹھتا ہے اس لئے کہ کیمرے کی آنکھ میں دھول جھونکی جاسکتی ہے، پولیس اور حکومتی اداروں کی نگاہوں سے چُھپا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذرا موقع ملا اور واردات ہوگئی۔

مگر اسلام سب سے پہلے اللہ پر ایمان لانے کی سعادت بخشتا ہے، وہ اللہ جو سب کا خالق بھی ہے، مالک بھی ہے۔ پھر ابدی اور دائمی زندگی کی خبر دے کر اس کے یقین سے سرشار کرتا ہے جس کے مقابلے میں یہ زندگی محض ایک آزمائش ہے جس نے اس عالم میں اللہ کریم کے احکام کی بجاآوری کا اہتمام کیا اس نے آخرت کی دائمی راحتوں کو پالیا۔

اب معاشرے میں ہر فرد کے لئے حقوق مقرر فرماتا ہے اتنے حسین اور پیارے انداز سے کہ کافر و منکر کو بھی اپنی محرومی کا احساس نہیں ہوتا، اس کے انسانی حقوق تک کا تعین بھی کردیتا ہے۔ اس حکومت کو ان قوانین، حقوق کی نگہداشت

کا فریضہ سونپ کر فارغ نہیں ہوجاتا بلکہ بندے سے بات یہ کرتا ہے کہ ایک تو قانون توڑنے کی سزا حکومت دے گی جو ہر حال میں حکومت کو پُورے پُورے انصاف کے ساتھ دینی چاہئے۔

اس کے ساتھ تمہارا رب ایسا ہے جو ہر جگہ ہر حال میں موجود ہے اور تم اس کی نگاہ سے ہرگز پوشیدہ نہیں ہو، لہٰذا قانونِ اسلام کو توڑ کر اللہ سے دشمنی کا ارتکاب کروگے کہ اس کے رُوبرو اس کے احکام کو پامال کرنے والا اُس کا دشمن ہی ہوسکتا ہے۔ یعنی گناہ، اپنا نقصان، دُوسرے کی حق تلفی، حکومت سے سزا کا باعث اور سب سے بڑھ کر دشمنی، جو بہت ہی خطرناک انجام کا باعث ہوگی۔ لہٰذا معاشرتی انصاف کو قائم رکھنے کے لئے اس نتیجے سے بھی مطلع فرمادیا جو ایسے لوگوں کو یوم حشر پیش آئے گا اور فرمایا،

"جس روز اللہ کے دشمنوں کو آگ یعنی دوزخ کی طرف بُلایا جائے گا تو بہت شور کر رہے ہوں گے۔"

شور سے مُراد کہ عذر معذرت یا یہ شور کہ ہم نے تو یہ جرائم کئے ہی نہیں فرشتے کہاں لکھتے رہے یا اس طرح کی باتیں۔ یہ سورۃ فصلت کی ۱۹، ۲۰، ۲۱ آیات ہیں کہ ان کے اعضا بدن کو بات کرنے کا حکم ارشاد فرمائیں گے چنانچہ خود اُن کے اعضا، کان، آنکھ، جسم کی کھال تک سب اقرارِ جرم کریں گے اور تمام جرائم پہ گواہی دیں گے تو وہ حیرت سے کہیں گے، کمال ہے! تمھی کو آگ میں جلنا ہو گا۔ اس مصیبت سے تمہیں بچانے کے لئے تو ہم شور ڈال رہے تھے بھلا تم کس خوشی میں ہمارے خلاف گواہ بن گئے ہو؟ تو وہ کہیں گے کہ اس میں حیرت کی تو کوئی بات نہیں، جس اللہ نے ہر شے کو قوتِ گویائی دی تھی اُسی نے ہمیں بولنے

کی اور بات کرنے کی طاقت بخش دی تو آخر زبان بھی تو گوشت ہی کا ایک ٹکڑا تھی جو اسے بولنے کی طاقت دینے پہ قادر تھا، اس نے ہمیں بھی بات کرنے کا حکم دیا ہے تو اب ہم غلط تھوڑی کہیں گے نتیجہ خواہ کچھ ہو، ہمیں تو گویائی ہی اس بات کو صاف کرنے کے لئے ملی تھی اور اس میں حیرت کی بھی کوئی بات نہیں وہ ایسا قادر ہے جس نے تمہیں پہلی بار پیدا فرمایا تھا، تم کچھ بھی نہ تھے انسان بنا دیا، سماعت بصارت، حُسنِ صورت، قد و قامت یہ سب کچھ تو اُسی نے بنایا ہے، ایک بار پھر بنا دے گا اور تم اس کی بارگاہ میں حاضر کیئے جاؤ گے۔

یہاں فلسفۂ گناہ پہ ارشاد فرمایا کہ تمہیں یہ توقع ہی نہ تھی کہ ہاتھ پاؤں باتیں کرنے لگیں گے بلکہ اسلام کو صدقِ دل سے قبول نہ کر کے تو تم اس وہم میں رہے کہ شاید اللہ ہمارے اعمال سے واقف نہیں ہیں۔ یہی غلط فہمی تمہاری دو عالم کی تباہی کا باعث بن گیا۔ لہٰذا اسلام تعمیرِ معاشرہ کی بنیاد اس ایمان کو قرار دیتا ہے جس کی وجہ سے مومن کو ہر آن حضورِ الٰہی حاصل رہتا ہے۔ گھر ہو یا دفتر، مسجد ہو یا بازار کوئی دیکھ رہا ہو یا نہ، مگر اللہ کریم ہر حال میں دیکھ رہا ہوتا ہے جس کی نافرمانی کرنا مومن کو گوارا نہیں ہوتا یا اگر بتقاضائے بشریت غلطی کر جائے تو فوراً توبہ کرتا ہے اس کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے کہ حکومت سے، پولیس سے، معاشرے سے، انسانوں سے چھپ کر عمل کرنا ممکن ہے، مگر اللہ سے چھپنا ممکن نہیں، دوسرے انسانوں کی ناراضگی سے شاید کچھ نہ بگڑے مگر اللہ سے دشمنی انسان کی دائمی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ لہٰذا اسلام نے جہاں معاشرے کے تمام طبقوں کے حقوق میں ایک خوبصورت توازن رکھا ہے وہاں ان کی نگہداشت اور پابندی کے لئے حکومت کے ذمّے بطور فریضہ لگا کر بس نہیں کر دیا بلکہ انسان کے تعلقات جو اپنے رب کے



زیر تعمیر مسجد نبوی

مسجد قبا



ساتھ ہیں ان کو بھی بنیاد قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود ہزار کمزوریوں کے مسلم ممالک میں رُوئے زمین کی بڑی بڑی حکومتوں کی نسبت امن ہے خصوصاً عرب ممالک جہاں کسی حد تک اسلامی حدُود نافذ ہیں۔ امن مثالی ہے۔

اللہ کریم ہمیشہ یہاں امن ہی رکھے! آمین۔

آج دوپہر مسجد نبوی میں حاضری دی، دعائیں کیں، خطاؤں سے توبہ اور آئندہ بچنے کے لئے دُعا کی۔ مسلم دُنیا کے لئے اور مجاہدینِ اسلام کے لئے نیز اپنے ملک کے لئے دعائیں کیں۔ کچھ گزارشات تھیں کچھ نوازشات ہوئیں۔ ایک پیغام صاحبِ مجاز حضرات کے لئے عطا ہوا۔ اُمید ہے ناظمِ اعلیٰ صاحب جو ہمراہ تھے سب کو پہنچا دیں گے۔ بہرحال یہ ایسی باتیں ہیں جن کا تعلق عمومی تحریر سے نہیں اور بعض اوقات لکھی بھی جا چکی ہیں۔

صُبح زاہد امین صاحب ریاض گئے تھے کہ ہمارے کینیا کے لئے ویزے نہ تھے انھوں نے پچھلے پہر اطلاع دی ہے کہ ویزے لگ گئے ہیں یعنی ہم حسبِ پروگرام ۲، فروری کو نیروبی جا سکیں گے۔ انشاء اللہ!

۳۰، جنوری ۱۹۸۹ء

آج مدینہ منورّہ میں قیام کا آخری دن ہے کل دوپہر یہاں سے روانگی ہے۔ انشاء اللہ، کل شام جدّہ میں ہوں گے۔

آج صُبح اُحد میں مزاراتِ شُہداء پر حاضر ہوئے، جبلِ اُحد کا نظارہ نظر نواز ہوا۔ پھر مسجد قبلتین پہنچے، موٹر ہی میں بیٹھ کر دُعا کی اور مسجد قبا حاضر ہوئے۔ دوگانہ ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ واپسی پر جنّت البقیع کے ساتھ ساتھ گزرتے

ہوتے فاتحہ پڑھی کہ دروازے بند تھے اندر جانے کی اجازت نہ تھی اور زاہد صاحب آج واپس چلے گئے ہیں شام دیر سے جدّہ پہنچیں گے۔ ہم کل ہوائی جہاز سے جا رہے ہیں، اب بعد عصر بچّے تو مسجد نبوی چلے گئے ہیں۔ چند حروف لکھنے بیٹھ گیا ہوں جو صبح کے درس کے بارے ذہن میں موجود ہیں۔

آج کے بیان میں سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۱۲۸ کی تلاوت کی۔ جس کا مفہوم اس طرح سے ہے کہ،

"تحقیق تمھارے پاس اللہ کا رسُول ﷺ تشریف لا چکا جو تم میں سے ہے اور تمھیں دُکھ پہنچے تو بڑی شدّت سے محسوس فرماتا ہے۔ نیز اے انسانو! تمھارے لئے تو حرص کی حد تک تمنا رکھتا ہے اور مومنین کے لئے رؤف و رحیم ہے۔"

یہاں سب سے پہلے تو پوری انسانیت کو اس بات کی طرف متوجّہ فرمایا کہ کسی نئے واقعہ کے رُونما ہونے کا انتظار نہ کریں کہ اچانک کچھ ظہور پذیر ہوگا، اور تم میں مثبت تبدیلی ہو جائے گی کہ عموماً انسانی مزاج تبدیلی کے لئے یا سوچ کے دھارے بدلنے کے لئے کسی نہ کسی واقعے کا منتظر رہتا ہے۔

فرمایا، وہ بہت بڑا واقعہ ہو چکا، اتنا بڑا کہ پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی بار ظہور پذیر ہُوا۔ نہ پہلے ایسا ہوا تھا نہ بعد میں ایسا ہوگا اور وہ ہے رسُول اللہ کی بعثت، جس کا ایک انفرادی پہلو یہ ہے کہ پہلے بھی انبیاء مبعوث ہوتے رہے مگر خاص اقوام کے لئے اور خاص اوقات کے لئے۔ یہ ایک ہی بار ہوا کہ ساری انسانیت کے لئے ایک رسول ﷺ مبعوث ہوا اور ہمیشہ کے لئے ہُوا پھر کسی اور کی بعثت کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ یہ اتنا عظیم واقعہ

ہے کہ کبھی دُہرایا نہ جائے گا۔ لہٰذا اب باری تمھاری ہے کہ آگے بڑھو اور اپنے دامن برکات سے بھر لو۔ یہ اتنی بڑی ہستی، جس میں اس قدر برکات اور سامانِ ہدایت موجود ہے کہ ساری انسانیت کے لئے بس ہے، کسی اور جنس سے نہیں کہ تمھیں استفادہ کرنا مشکل ہو۔ غیر جنس سے استفادہ واقعی مشکل ہے مگر اپنی ساری انفرادیت کے باوجود، اپنی ساری عظمتوں اور منازلِ قُرب اور جمالِ بے مثال کے باوجُود، اللہ کا رسُول تم ہی میں سے ہے۔ یہ شرفِ انسانیت ہے اور باعثِ خیرِ بشر ہے۔ دو باتیں تو ہو گئیں مگر کیا انسانوں کو برداشت بھی فرمائیں گے، کہ طالب اصلاح ہو جائیں گے تو بیشتر اللہ سے ناآشنا، کُفر و شرک میں لتھڑے ہوئے اور صدیوں کے نسلاً بعد نسلٍ بھٹکے ہُوتے ہوں گے کیا ایسے لوگوں کے لئے وہاں کوئی گنجائش ہوگی؟

فرمایا، وہ دو جہاں سے بے نیاز اور صرف خالقِ دو جہاں کا طالب، اے انسانو! تمھارے معاملے میں تو حریص ہے یعنی تمھیں ہدایت پہ لانے کے لئے لالچ اور حرص کی حد تک چلا گیا ہے تم قریب جا کر تو دیکھو، بھلا اس کے کرم کا تماشا تو کرو۔ ایک بات اور کہ یہ لوگ تو عُذر رکھتے تھے اسلام و ایمان سے واقف نہ تھے، گناہ آلود زندگی بسر کر گئے تو کیا حرج ہے کہ گناہ و ثواب تو ایمان کے بعد کی بات ہے پہلے تو دعوتِ ایمان لانے کے لئے ہے جو انھوں نے قبول کر لی، مگر کچھ غریب ایسے بھی ہیں جو ہیں تو مسلمان اور مومن۔ ایمان تو رکھتے تھے مگر گناہ سے باز نہ رہ سکے اور یوں اپنا دامن سیاہ کر لیا، کوئی گنجائش اُن کے لئے بھی ہے؟ فرمایا، مومنوں کے لئے تو رؤف بھی ہے رحیم بھی ہے۔ در گزر کرنے والا بھی ہے، شفقتیں لُٹانے والا بھی۔

رافت کو سمجھنے کے لئے آپ ایک والد کو دیکھیں اگر اس کا بچہ بہت بگڑ جائے، معاشرہ اسے رد کر دے، دوست احباب برا جانیں، اہلِ خاندان ٹھکرا دیں پولیس پیچھے پھرتی ہو۔ مگر والد کے دل میں اُس کے لئے ایک نرم گوشہ ضرور موجود ہوگا اور پھر کہہ اُٹھے گا۔ بیچارے کو معاف کر دو! آئندہ سنبھل جائے گا۔

یہ رافت کی ادنیٰ سی صورت ہے جبکہ اس کا کمال دیکھنا ہو تو شفقتِ نبوی ﷺ کو مومن کے حق میں دیکھنا چاہیئے۔ اللہ کریم تمام مسلمانوں اور ہم سب کو بھی ان نعمتوں سے نوازیں۔

ایک بات جو یہاں بین السطور میں عموماً رہ جاتی ہے اور مفسر بھی محاسن و فضائل کی لذتوں سے سرشار گزر جاتا ہے کچھ یہی حال مفسرین کرام کا بھی ہوتا ہے وہ بات یہ ہے کہ رحمت کا اس قدر بحرِ بیکراں آوازیں دے رہا ہے پھر بھی جس نے پرواہ نہ کی اور پیاسا مُنہ لے کر خالی ہاتھ میدانِ حشر میں پہنچا۔ اس کے پاس کوئی دلیل کوئی جواز نہیں ہوگا کہ وہ کیوں خالی رہا اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

اللہ کریم ہم سب کو کامل استفادہ نصیب فرمائے!

۲ فروری ۱۹۸۹ء

دو دن کچھ نہیں لکھ سکا، ۳۱ جنوری کو درس تو نہ ہوا تھا کہ سڑک کے راستے جانے والے لوگوں نے نماز کے فوراً بعد روانہ ہونا تھا۔ لہٰذا وہ ناشتہ کر کے نکل کھڑے ہوتے۔ ہم نے بھی سامان بند کیا اور کاروں پہ ہی جدہ روانہ کر دیا کہ ایئرپورٹ پر لے جانے اور پھر لانے کی مصیبت نہ ہو گی۔ لہٰذا درس تو نہ ہو سکا۔ البتہ سلام کے لئے حاضری دی۔ ریاض الجنۃ میں تلاوت کی۔ نوافل ادا کئے۔ کچھ گزارشات

اور دُعائیں کیں۔ بحمد للہ! یوں دوپہر فارغ ہو کر کھانا کھایا اور ظہر ادا کرتے ہی ایئرپورٹ چلے گئے۔ اب مدینہ منورہ سے رُخصت کی کیفیات تو صرف محسوس کرنے کی چیزیں ہیں کوئی کیا لکھ سکتا ہے۔

بہرحال عصر جدہ میں پڑھی اور کھانا کھانے چلے گئے۔ یہاں ایک علیحدہ محلہ ہے جسے بہت بڑی چار دیواری نے گھیر رکھا ہے، باقاعدہ گیٹ اور سیکیورٹی ہے جہاں سے صرف اور صرف وہاں کے لوگ گزر سکتے ہیں یا پھر اجازت لے کر، ان کے مہمان۔ اِسے شربتلی ویلج (SHARBATALI VILLAGE) کہتے ہیں۔ جس کی رہائش بہت مہنگی ہے، مثلاً جہاں ہم گئے سُنا ہے اس ایک مکان کا کرایہ اَسّی ہزار سعودی ریال سالانہ ہے یہ نام کا گاؤں کیا ہے، سرزمینِ عرب پر اور شہر جدہ میں امریکہ کی بستی ہے۔ سب کچھ وہی ہے اور اکثر لوگ بھی امریکن اور یورپین ہیں جو یہاں عرب کی کمپنیوں میں بڑے بڑے افسر ہیں۔ وہی بود و باش، وہی لباس، وہی سوئمنگ پول وغیرہ سب خرافات موجود ہیں، ہاں! دیوار سے باہر وہ انسانوں کی طرح رہنے کے پابند ہیں اور دیوار کے اندر غیر متعلقہ آدمی کو داخلے کی اجازت نہیں۔

بہرحال عرصہ ہوا یہاں آتے مگر یہ کونہ پہلی بار دیکھا۔ پینتیس کے قریب ساتھی تھے، سب کا کھانا ہمارے ساتھ تھا۔ بحمد للہ! مغرب کے بعد کا ذکر بھی وہیں ہوا۔ اور یوں پہلی بار اس علاقے میں بھی ذکرِ الٰہی کی محفل سجی۔ رات کافی دیر سے گھر پہنچے، ساتھی بھی اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔

یکم فروری یعنی کل صبح درس ہوا۔ سحری کا ذکر احباب کے ساتھ جا کر کیا اور نماز کے بعد درسِ قرآن سورہ رعد کی آیات ۲۶ تا ۲۹ تلاوت کیں مفہوم یہ ہے،

"اللہ جس کے چاہیں، رزق میں فراخی پیدا کر دیتے ہیں اور جب چاہیں

تنگی، لوگ دُنیا کی زندگی اور اس کی ضرورتوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب آخرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کافر کہتے ہیں، اُن پر کوئی خاص نشانی ان کے ربّ کی طرف سے کیوں نازل نہیں ہوتی۔ آپ ان سے کہیئے کہ اللہ جسے چاہیں گمراہ کر دیتے ہیں کہ ہدایت تو ان کو نصیب ہوتی ہے جن کے دل میں انابت پیدا ہو ایسے لوگ جنہیں ایمان نصیب ہوتا ہے اور ان کا دل صرف یادِ الٰہی سے قرار پکڑتا ہے اور سُنو! دلوں کا قرار صرف اللہ کی یاد ہے۔ ایسے لوگ جو ایمان لائیں اور اچھے کام کریں، اُن کے لئے حُسنِ انجام کی مبارک ہو۔"

اللہ کریم کے دو صفاتی نام ہیں، باسط اور قابض۔ انسانی حیات پر اُن کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے سب اللہ کریم کی طرف سے بطور رزق نصیب ہوتا ہے۔ زندگی، بچپن، جوانی، بُڑھاپا، طاقت، کمزوری، صحت، بیماری، دولت، غربت یہ سب اِنہی صفاتِ باری کے مظاہر ہیں۔ جب کسی پہلو پہ بسط ہوتی ہے تو اس میں فراخی آجاتی ہے اور اگر قبض ہو تو تنگی۔ مگر انسان اللہ کو بھول کر صرف اور صرف اپنی کوششوں میں سر کھپاتا رہتا ہے۔ اظہارِ بسط ہو تو شکر نہیں کرتا اپنی عقلمندی کے گیت گاتا ہے۔ قبض ہو تو شکوے کرنے لگتا ہے صبر کے ساتھ دُعا نہیں کرتا، حالانکہ درُست طریقہ یہی ہے کہ اصل تو حیاتِ آخرت ہے۔ جس کی تعمیر ضروری ہے اور جس کے لئے اطاعتِ الٰہی ہی واحد راستہ ہے لہٰذا مومن کی شان یہ ہے کہ بسط میں بھی شکر ادا کرے اور اطاعت گزار ثابت ہو۔ قبض میں بھی اللہ ہی کو پکارے اور صبر و شکر کرے تو یہ حالات تبدیل ہوتے

رہتے ہیں۔ اسی طرح صاحبِ حال لوگوں کو علم ہونا چاہیے کہ احوالِ قلبی میں بھی اِن صفات کا اظہار ہوتا ہے۔ بسط میں دو عالم منکشف ہو جاتے ہیں اور قبض میں اپنے مراقبات و مقامات تک سمجھ نہیں آرہی ہوتی۔ مگر یہ دونوں حال وارد ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا بسط میں فخر کی ضرورت نہیں اور قبض میں مایُوس ہونے کی۔ بلکہ ہر دو حال مزید ذکرِ الٰہی کا تقاضا کرتے ہیں۔ لیکن نادان انسان خود کو ان حالات میں الجھا کر آخرت سے غافل ہو جاتا ہے اور یوں بہت بڑا نقصان اُٹھاتا ہے۔

آپ دیکھیں! اگر بادشاہ مصرُوف ہے تو ایک خاکرُوب کے پاس بھی وقت نہیں۔ اگر اِسے حکومتوں اور ممالک سے مقابلہ درپیش ہے تو اُسے برادری میں ناک رکھنی ہے اور یوں اس قدر اُلجھ جاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جیسی ہستی سے کہتے، ان پر کوئی خاص نشانی کیوں نہیں اترتی؟ یعنی ان کے خیالِ باطل میں آپ ﷺ کا وجُودِ مبارک، جو خود ایک معجزہ ہے بچپن، لڑکپن اور جوانی کی ایک ایک ادا معجزہ ہے۔ ذرا اُس ماحول اور پسِ منظر کو دیکھیں اور پھر دُرِ یتیم کو جس کا ثانی ساری تخلیق میں نہیں، پھر اللہ کی کتاب اور بے شمار معجزات۔ مگر ان کو جیسے کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ اور ابھی کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

فرما دیجئے! کہ تم نے گناہ کر کے اللہ سے بات بگاڑ لی ہے اور اس حد تک کہ اب اللہ کی طرف سے تمہیں ہدایت نصیب نہیں ہوتی تمہارے دل سیاہ ہو کر انابت سے خالی ہو چکے ہیں اور اللہ تو تمہیں ہدایت کی توفیق بخشتے ہیں۔ جن کے دل میں انابت یعنی اللہ کو پانے کی آرزو پیدا ہو جاتے، انسان کے تو بس میں صرف یہی فیصلہ ہے کہ اسے اللہ کریم کو پانا ہے یا دوسرے راستے پر چلنا ہے۔ اور بس۔ اگر اُس نے دل کی گہرائی سے ہاں کہہ دی تو اللہ اُسے

اپنی راہ دکھا دیتے ہیں۔ پھر اُسے نہ صرف ایمان نصیب ہوتا ہے بلکہ اس کے دل کو اللہ کے ذکر ہی سے قرار ملتا ہے یعنی ذکرِ الٰہی کے بغیر اس کے ہاں زندگی کا کوئی تصور نہیں رہتا اور یاد رکھو۔ دلوں کا قرار ہے ہی صرف اللہ کی یاد میں، جو اللہ کے ذکر سے محروم ہوں، ان کے دلوں کو کبھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ اسی سے ایمان مضبوط ہوتا ہے اور نیکی کی توفیق ارزاں ہوتی ہے۔ عملِ صالح کی توفیق ملتی ہے جس پر ابدی راحتوں کا مدار ہے۔ ایسے ہی لوگ خوش نصیب ہیں اور حُسنِ انجام اُنہی کو مبارک ہو۔

یہ چند حرُوف جو حافظے میں تھے، لکھ دیئے ہیں پھر تو کل دن بھر مصروفیت رہی، بچوں کے ساتھ بازار جانا ہوا اور عصر کے بعد اہلیہ عمرہ کرنے چلی گئیں مگر میں تھک چکا تھا نہ جا سکا۔ شام کو پھر ذکر تھا، رات ملنے بلانے والوں نے ایک بجے تک مصروف رکھا۔ کوئی دو گھنٹے آرام کیا اور تین بجے اُٹھ گئے۔ بچوں کو تیار کیا آج اُنہیں واپس جانا تھا، ساتھ احباب کو بھی جانا تھا۔ لہٰذا علی الصبح وہ چلے گئے۔ واپس آکر سو گیا۔

اب اُٹھ کر غسل کیا، یہ چند سطور لکھیں۔ دوپہر کے سوا بارہ بج رہے ہیں۔ ڈیڑھ بجے ہوائی اڈے پہ جانا ہے اور شام انشاء اللہ نیروبی، جو افریقہ میں کینیا کا دارالخلافہ ہے۔ اب باقی باتیں انشاء اللہ وہاں پہنچ کر ہوں گی۔

تب تک اللہ حافظ

۲ فروری۔ نیروبی

کل شام ۳۵-۳ پہ جہاز جدہ کے ہوائی اڈہ سے اُڑا اور بحرِ احمر کے اُوپر

سے پرواز کرتا ہُوا نئے برِّ اعظم افریقہ میں داخل ہوا۔ اکثر بادلوں کی موٹی تہہ ہی نظر آتی رہی، جہاں کہیں بادل تھے وہاں نیچے پہاڑ اور تقریباً ہر وادی میں دریا نظر آتے تھے۔ ساڑھے تین گھنٹے کی پرواز کے بعد نیروبی پہنچا۔

ہوائی اڈے کی عمارت اگرچہ واجبی سی ہے اور شاید اس لئے واجبی سی نظر آتی ہے کہ جدہ اور خصوصاً ریاض جیسے ہوائی اڈے دیکھنے کے بعد تو تاثر یہی ہونا چاہیئے، ورنہ بہت اچھی عمارت ہے۔ ہاں! رن وے وسیع ہیں، حدِ نگاہ تک ہر طرف سبزہ ہی نظر آتا ہے۔ یہاں مغرب ہو رہی تھی۔ کالے عیسائیوں کی حکومت ہے مگر لوگ اچھے ہیں، کسٹم اور امیگریشن والوں کا رویّہ دوستانہ تھا۔ یہ اللہ کریم کا احسان ہے کہ مجھے تو کبھی اپنے ملک میں یا پھر باہر کسی ملک میں کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ یہاں عام لوگوں سے بھی کم از کم بات اچھے انداز میں کر رہے تھے۔ محمد سالم کچھ احباب اور کاروں کے ساتھ منتظر تھا۔ باہر آتے آتے مغرب بھی قضا ہو گئی کہ جہاز سے سامان کے آنے میں کچھ وقت تو ضرور لگتا ہے۔ بہرحال گاڑیوں میں بیٹھ کر شہر آتے اور ٹھکانے پہ پہنچ کر عصر، مغرب قضا کیں۔ عشاء پڑھی، کھانا کھایا اور سو گئے۔

جو معلومات کھانے پہ حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ ملکی آبادی میں تقریباً پینتیس فیصد مسلمان ہیں، اتنے ہی عیسائی، باقی دوسری اقوام۔ مذہبی آزادی ہے شہر میں بیس سے زائد خوبصورت مساجد ہیں، اذانیں ہوتی ہیں اور لوگ کثرت سے نماز ادا کرتے ہیں۔ تبلیغی جماعت کی طرف سے بہت دینی کام ہو رہا ہے شیعہ اور مرزائی بھی ہیں۔ لوگ انگریزی خوب جانتے ہیں۔ یہاں کی اپنی زبان سواحیلی اور سکّہ کینین شلنگ ہے جو تقریباً پاکستانی کرنسی کے برابر ہی ہے۔ عُلماء نے

بہت سے مدرسے بنا رکھے ہیں اور اکثر لوگ عربی بھی خوب جانتے ہیں۔ ایشیائی تقریباً سب ہی اردو بھی جانتے ہیں۔ بہرحال ماحول اچھا اور پُرامن ہے سیاحوں کی بھی بہت بھیڑ رہتی ہے اور تہذیبِ مغرب نے بھی بہت سے ساحلوں پر اپنی قباحت پھیلا رکھی ہے۔ اب یہ فرد پر منحصر ہے کہ وہ مسجد کا رُخ کرتا ہے یا ساحلِ سمندر کا اس ملک کی جنگلی زندگی بھی قابلِ دید ہے۔ کل کا دِن اور آدھا دن پرسوں کا ہے دیکھیں اگر موقع ملا تو جو دیکھا، لکھ دیں گے۔

آج صُبح فجر ادا کرنے مسجد میں گئے تو درسِ قرآن کا موقع نصیب ہوا، یہاں لوگ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر آرام کرتے ہیں اور اُٹھ کر ناشتہ کر کے آٹھ بجے کام پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان ممالک میں بیکار رہنے کا تصوّر کم ہے۔ ہاں! نیم مہذب لوگ اس مصیبت میں گرفتار رہتے ہیں۔ اس لِئے فجر کے بعد لوگ کم بیٹھتے ہیں مگر الحمدُللہ! لوگ بیٹھ گئے اور میں نے بھی کوشش کی کہ زیادہ وقت نہ لوں تاکہ بات بھی ہو جائے اور کسی پر بوجھ بھی نہ ہو، لہٰذا مناسب وقت ہی لیا۔ سُورہ یونس کی آیت نمبر ۲۳ کا آخری حصّہ تلاوت کیا۔ جس کا مفہوم یوں ہے،

"اے انسانو! اگر تم اللہ کے حکم سے بغاوت کرتے ہو تو اس کا وبال تم ہی پر پڑتا ہے کہ حیاتِ دُنیا تو لمحاتی بات ہے اور تمھیں اُس کے رُوبرو پلٹ کر جانا ہے، جہاں وہ تمھیں تمھارے ہی اعمال کی خبر دے گا۔"

تو اسلام اور دینِ حق نے اولادِ آدم علیہ السلام پر محض رسُومات کا بوجھ نہیں ڈالا بلکہ دُنیا میں رہنے کا بہترین اور آسان طریقہ تعلیم فرما دیا جس کے مقابلے میں مذاہبِ باطلہ کو دیکھا جائے تو انھوں نے ایسی ایسی رسومات مذہب کے

نام پر ایجاد کیں جن میں انسان مزید بوجھ تلے دَب جاتا ہے اور زندگی مشکل ہو جاتی ہے مگر اسلام نے بنیادی طور پر فرمایا کہ دنیا میں سب کچھ تمھارے ہی لِئے پیدا فرمایا گیا ہے لہٰذا اس سے فائدہ اٹھاؤ، آرام حاصل کرو۔ پھر کچھ چیزوں سے روک دیا۔ وہ چیزیں سائنس کی نظر سے بھی انسان کے لِئے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ کچھ کاموں سے روکا۔ وہ کام ایسے ہیں جن میں دوسروں کے حقوق پر زد پڑتی ہے۔ لہٰذا اِسلام نے کسی کام سے روکا نہیں بلکہ ہر کام کو کرنے کا ایک سلیقہ دیا ہے اور یہ عین انسانی مزاج کے مطابق ہے۔ جیسے جُوتا ایک معمُولی چیز ہے ہم ہر وقت استعمال کرتے ہیں مگر بنانے والے نے جو دائیں پاؤں کے لِئے بنایا اُسے دوسرے پاؤں میں ڈالیں تو تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ راحت تب ہی ہے جب بنانے والے کے بتاتے ہوئے قاعدے کے مطابق استعمال کریں تو اِتنی وسیع کائنات میں رہنے بسنے کے لِئے اور بے شمار نعمتوں کو استعمال کرنے کے لِئے ضروری ہے کہ اس کے بنانے والے کے بتاتے ہوئے قاعدے کے مطابق اسے استعمال کریں اور یہی اسلام ہے۔

اب جس نے اس قدر نعمتیں عطا فرمائیں اِتنا احسان فرمایا جب یہ شعور نصیب ہوتا ہے تو لامحالہ اس کا شُکر ادا کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے لِئے عبادات کا حکم عطا فرما دیا۔ اِسی لِئے یہاں ارشاد ہوا کہ اگر کوئی اللہ کے قانون سے بغاوت کرتا ہے تو اللہ کا یا اللہ کے دین کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، اُلٹا اس کا اپنا نقصان ہوتا ہے کہ دُنیا کی زندگی میں بھی اپنے لِئے پریشانیاں پیدا کر لیتا ہے لیکن اگر کوئی اس جہالت میں گرفتار ہو، کہ اُس نے بہت دُنیا جمع کر لی یا بڑا فائدہ حاصل کیا حالانکہ ایسا ہوتا نہیں ملتا وہی ہے جو اللہ کریم دیتے ہیں، لیکن

اس کے باوجود بھی دنیا کی حیات تو چند روزہ ہے آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلے
میں تو اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں اور اخروی زندگی کی ابتدا ہی اس بات پر ہے
کہ آپ کو واپس اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور وہاں وہی بات سامنے آ
جائے گی۔ لہٰذا یہ انسانیت کی ضرورت ہے کہ وہ اطاعتِ الٰہی اختیار کرے، جو
سنت خیر الانام ﷺ کے مطابق ہے۔
اللہ کریم ہمیں اور سب مسلمانوں کو اس کی توفیق ارزاں فرمائے! آمین

۴، فروری ۱۹۸۹ء

کل کا دن تو بس آرام ہی کرتے رہے۔ عصر کے بعد نیروبی شہر کے دیکھنے
نکلے۔ موٹر میں چکر لگایا۔ مقامی آبادی کا رنگ کالا اور لباس انگریزی ہے کہ یہ بھی
انگریزی تسلط سے ۱۹۶۳ء میں آزاد ہوتے ہیں مگر اب تک بہت سنبھل چکے ہیں،
شہر خوبصورت عمارات اور کشادہ سڑکوں، سرسبز پارکوں اور بے شمار کاروں سے
بھرا ہوا ہے۔ اگرچہ بازار ۵ بجے بند ہو جاتے ہیں مگر لوگوں کے ہجوم خصوصاً منی
اور لوکل بسوں کے سٹاپ پر بہت نظر آتے۔ بڑی بلند اور جدید عمارتیں ہیں۔ مشہور
بین الاقوامی ہوٹلوں کی بہت بڑی بڑی عمارتیں بھی وسط شہر میں ہیں۔ ہلٹن ہوٹل
کی عمارت تو حبیب بنک پلازا کراچی کی مانند ہے۔ اسمبلی کی عمارت اور ایک کانفرنس
ہال، جس کی عمارت پرانی افریقی جھونپڑیوں کی طرز پر بنائی گئی ہے گول مٹول اور
تینتیس ۳۳ منزل بلند ساتھ چھپر کی طرح مخروطی چھت والی تقریباً بارہ منزلہ مگر دونوں
جدید شیشے کی بنی ہوئی قدیم اور جدید کا حسین امتزاج ہیں۔
چائے، کافی، فروٹ، سبزی سب کی الگ الگ منڈیاں جو برآمد بھی کرتی ہیں،

اپنی اپنی الگ عمارت رکھتی ہیں۔ ہاں شہر کے ایک طرف ریلوے سٹیشن لاہور
ریلوے سٹیشن جیسا ہے غالباً انگریز نے بنایا ہوگا۔ ہر رنگ، ہر قد کاٹھ اور ہر نسل کی
کار نظر آتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اب کاروں کی درآمد بند ہے اور اندرون
ملک اسمبل کی جاتی ہیں۔
بڑی بڑی خوبصورت مساجد ہیں۔ شہر کے وسط میں جامع مسجد بہت خوبصورت
ہے جو سعودیہ نے بنائی ہے اور ساتھ ایک عمارت بنا کر اس میں سعودی ایئر لائنز
کا دفتر بنا دیا ہے جس کا کرایہ مسجد کو آتا ہے۔ اس طرح سعودی حکومت بھی یہاں
علماء اور مساجد کی بہت خدمت کر رہی ہے۔ یہ سعودی ایئر لائن بھی عجیب شے
ہے، اندرونِ ملک بڑی شریف مگر جیسے ہی جدہ سے نیروبی کے لئے جہاز اُڑا
تو انگریز کپتان نے فلم لگا دی غالباً اتنی فحش فلم یورپ کے سفر میں بھی نہ دیکھی ہو
گی۔ اور یہ ہمارا سعودیہ کے ساتھ آخری سفر تھا۔ اس دورے میں اب ہم یہاں سے
متحدہ عرب امارات اور وہاں سے وطن اپنی پی آئی اے سے سفر کریں گے انشاءاللہ۔
شیعہ بھی ایرانی انقلاب کے بعد بہت متحرک ہیں اور روپے سے لوگوں
کا ایمان خریدنے میں کوشاں رہتے ہیں، امام بارہ بھی بنا رکھا ہے۔ اسمٰعیلیوں
کا جماعت خانہ بھی ہے، سکھوں کا گوردوارہ بھی۔
شام مسجد میں بیان ہوا، تو ایک صاحب چند منٹ کے لئے اپنے ساتھ
گھر لے گئے وہ یہاں سرکاری سکول میں انگریزی شعبہ کے سربراہ ہیں۔ انھوں
نے بتایا کہ تعلیم میں مذہب لازمی مضمون ہے مگر صرف دو مذاہب کا نصاب
ہے اسلام اور عیسائیت۔ جو دونوں نہ لینا چاہے اسے اخلاقیات کا مضمون
لینا پڑتا ہے۔ مگر ان تین میں سے ایک ضروری لینا ہوتا ہے۔ انھوں نے خود

دو کتابیں مذہبِ اسلام کے بارے انگریزی میں لکھی ہیں، جو داخل نصاب ہیں اور یہاں سکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ پاکستانی اور جہلم شہر کے رہنے والے ہیں۔ بہر حال یہ تھوڑا سا خاکہ شہر کا لکھا ہے۔ کل انشاء اللہ وائلڈ لائف پارک دیکھنے کا ارادہ ہے جو اس ملک میں کئی ہیں مگر قریب ترین ۲۹ میل پر ہے جو نسبتاً چھوٹا ہے ہم وہاں تک ہی پہنچ پائیں گے۔

یہاں سے تین سو کلو میٹر پر دوسرا بڑا شہر ممباسا ہے جو کراچی کی طرح بڑا شہر ہے اور مسلمان اکثریت وہاں آباد ہے۔ بحمد للہ! مسلمان خوشحال اور بیشتر کاروباری ہیں نماز کے اوقات میں، مساجد کے ساتھ کار پارک کاروں سے بھر جاتے ہیں، جس سے خوشی ہوتی ہے۔ ہم پھرتے پھراتے مغرب سے پہلے مسجد میں پہنچ گئے اور مغرب کے بعد بیان ہوا، تزکیۂ نفس موضوع تھا۔ سورۃ اعلیٰ کی ۱۴ اور ۱۵ نمبر آیات کی تلاوت کی جن کا مفہوم ہے کہ،

"جسے تزکیہ نصیب ہوا وہ فلاح پا چکا اور اسے ربّ کے نام کا ذکر نصیب ہوا اور توفیقِ عبادت بھی"۔

اگرچہ بیان تو گھنٹے سے زیادہ پر پھیلا ہوا تھا، مگر یہاں خلاصہ ہی عرض کر سکوں گا۔ تو یہ مضمون خطبۂ مسنونہ کے بعد عرض کیا کہ آیۂ مبارکہ میں کامیابی کی اطلاع ماضی میں فرمائی گئی۔ یہ انداز بات کی قطعیت کو عیاں کرنے کے لئے ہوتا ہے اور انسانی زندگی کا محور کامیابی ہی ہے۔ ہر انسان کامیابی کے حصول کے لئے سرگرداں ہے۔ فرق یہ ہے نادانی سے کامیابی اپنی رائے سے مقرر کر لیتا ہے اور اس کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے اسی لئے مختلف افراد کی رائے میں کامیابی کے معیار بھی مختلف ہیں مگر حقیقی کامیابی وہی ہے، جسے اللہ کریم کامیابی قرار دیں اور

جسے قرآن کریم فلاح کہتا ہے، یہ ایسی ہمہ گیر کامیابی ہے کہ ذاتی امور سے لے کر خاندانی، قومی، دنیاوی اور اُخروی حتیٰ کہ میدانِ حشر تک کو محیط ہے کہ جس نے تزکیہ حاصل کر لیا، اُسے یہ ہمہ گیر کامیابی حاصل ہو گئی۔

تزکیہ کیا ہے؟ یہ دل پر وارد ہونے والی ایک کیفیت کا نام ہے۔ جس کی اصل ذات پیامبر ﷺ ہے۔ جہاں یہ دولت لٹائی گئی کہ ایمان لا کر جسے اِک نگاہ نصیب ہو گئی، اسے تزکیہ میں وہ درجہ کمال حاصل ہو گیا کہ وہ صحابی کہلایا اگر صحبتِ عالی میں نہ پہنچا تو بھی نیک، صالح، غازی، شہید سب کچھ بن سکا مگر صحابی نہ بن سکا۔ تو یہ ایک انعکاسی عمل تھا جو صرف صحبت سے نصیب ہوتا تھا اور صحابی ایک ہی بلند مقام کا نام ہے جو تمام کمال اوصاف میں بعد از نبی ساری اُمت سے اعلیٰ ہوتا ہے۔

لوگوں نے اعتراض کے لئے بھی لب کھولنے کی جرأت کی ہے۔ مگر یہ سخت نادانی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ حکومتوں پہ کس قدر تنقید ہوتی ہے مگر ناقدین کو اگر حکومت دی جائے تو چند روز چلا نہیں سکتے۔ اس کے باوجود ان کا حکومت میں آنا ممکن تو ہے اور صحابی وہ بلند درجہ ہے کہ جنہیں مل گیا، مل گیا۔ وصالِ نبوی ﷺ کے بعد ساری دنیا مل کر کسی کو صحابی بنانا چاہے تو ممکن ہی نہیں، پھر ایسے چیدہ اور پسندیدہ حضرات اور کتاب اللہ کے مثالی مسلمانوں پر لب کشائی بہت ہی ناروا حرکت ہے، کرنے والے کا ایمان ضائع ہو جاتا ہے ذرا حدِ ادب سے بڑھا اور مارا گیا۔

یہ تھا تزکیہ! اور اس کی بدولت اُنھیں اللہ کا ذکر یوں نصیب ہو جاتا تھا کہ قرآن کے مطابق ان کی کھال سے لے کر دل تک ہر جزوِ بدن ذاکر ہو

گیا۔ وصالِ نبوی ﷺ کے بعد صحابی کی صحبت نے تابعی پیدا کئے، اُن کی
مجالس میں پہنچنے والے تبع تابعی قرار پائے یعنی دِلوں سے دِلوں کو یہ نور منتقل
ہوتا رہا اور جس طرح دین کے مختلف شعبے بنے اور اللہ نے مختلف حضرات سے
ان میں خدمت لی۔ جیسے تفسیر، حدیث، فقہ ایسے ہی اللہ کے بندوں نے اس کمال
کو حاصل کرنے اور آگے پہنچانے میں عمریں صرف کیں اور یہ تصوّف کہلایا۔

یاد رہے ہر فن کے ائمہ اس کمال سے بھی بہرہ وَر ہوا کرتے تھے اب
نادانی سے ہم نے اعمال کو ذکرِ الٰہی کا قائم مقام سمجھ کر ذکرِ الٰہی کا اہتمام تقریباً
چھوڑ ہی دیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں۔ اگرچہ نماز، جہاد، حج، انفاق سب نیک
کام بھی ذکرِ الٰہی ہیں مگر کتاب اللہ میں ان سب امور کے ساتھ ذکرِ الٰہی کا حکم موجود
ہے۔ حتیٰ کہ خود نبی اکرم ﷺ کے لئے ذکرِ الٰہی کا حکم موجود ہے جس کا آپ
ﷺ اہتمام بھی حد درجہ فرماتے تھے پھر کسی کو اس سے استثنا کیسے ہے؟
لہٰذا مشائخ کی صحبت میں بیٹھ کر قلبی توجہ حاصل کرنا اور ذکر کرنا ہماری بنیادی
ضرورت ہے کہ ہم جو کام بھی کریں۔ اس میں حضورِ الٰہی نصیب ہو اور امورِ دُنیا
بھی عبادت قرار پائے۔ اللہ یہ نعمت نصیب فرمائے!

یوں دیر سے پلٹے۔ کھانے کے بعد ذکر کیا، مقامی ساتھی بھی شریکِ محفل
تھے۔ اللہ کریم ان سب کے سینے منوّر فرمائے، آمین۔

آج انشاء اللہ مغرب کے بعد پھر بیان ہے کچھ مصروفیات دن میں بھی
ہیں جو اللہ کریم کو منظور ہوگا۔ ہاں! اگر اُس خادم کا تذکرہ نہ کروں تو بات پوری نہ
ہوگی، جو یہاں میزبان کی طرف سے ہمارے ساتھ ہے رنگ بھی کالا ہے اور
نومسلم بھی ہے اور نام بلال ہے۔ سُبحان اللہ! اُسے بلانے میں بھی لُطف آجاتا

ہے اور بہت محبّت سے پیش آتا ہے، رات سے ذکر میں شامل ہوگیا ہے ابھی
ابھی آیا تھا کہ دھونے کے لئے کپڑے دے دو!

میں نے کہا، "نہیں ہیں!"

پھر کہنے لگا، "میرے لئے دُعا کرتے رہا کرو! مجھے خبر ہے اللہ مجھے دُنیا میں
لایا ہے اور پھر اُس کے پاس لَوٹ کر جانا ہے۔"

سبحان اللہ! کیا مزے کی بات کی ہے۔ لو وہ چائے لے کر آگیا۔ اب
اجازت! میں چائے پی لوں، پھر بعد میں جو ہُوا لکھنے کی کوشش کروں گا۔

انشاء اللہ تعالےٰ!

۵ فروری ۱۹۸۹ء

کل ظہر کے بعد ایک مدرسے میں حاضری دی۔ وہاں کے مُہتمم صاحب
نے وقت لیا تھا، یہ مدرسہ بچیوں کے لئے ہے جہاں عربی زبان اور دینیات کی
تعلیم دی جاتی ہے۔ بچیاں مدرسے میں ہی رہتی ہیں جن کی تعداد چوّن بتا رہے
تھے۔ ساتھ مُسلم خواتین بھی جمع تھیں۔ بیان ہوا کرنل صاحب ساتھ نوٹس لیتے
گئے اور پھر سارا انگریزی میں دوہرا دیا جو اُمید ہے 'المرشد' کے انگریزی سیکشن میں
آپ دیکھ سکیں گے، لہٰذا یہاں لکھا نہیں جا رہا۔

مغرب کے بعد مسجد میں بیان تھا۔ معیت رسالت اور اس کے اثرات
ظاہری اور باطنی طور پر۔ یہ بھی ایسی بات ہے جو اکثر دُہرائی جاتی ہے۔ اگرچہ
انداز تو ہر بار نیا ہوتا ہے کہ اللہ کریم کی طرف سے ہوتا ہے مگر نفسِ مضمون آپ
بارہا سُن چکے ہوں گے یا پڑھا بھی ہوگا۔ لہٰذا یہ بھی نہیں لکھ رہا۔

اب تہجد کا وقت ابھی باقی ہے اور آج بعد دوپہر ہمیں ابوظہبی کے لئے روانہ ہونا ہے یہاں سے ہماری پرواز بھی پی۔آئی۔اے کے ساتھ ہے۔ لہٰذا بعد نماز فجر وائلڈ لائف پارک دیکھنے کا ارادہ ہے جس کا باقاعدہ اہتمام ہوچکا ہے ہمارے میزبان صاحب بہت اچھے انسان ہیں انھوں نے ایک ٹورسٹ ایجنٹ سے سب کچھ طے کر رکھا ہے۔ اب ہمارا وہاں جانا، دیکھنا اور آپ احباب کے لئے لکھنا باقی ہے۔ اللہ کریم سے خیر ہی کی اُمید ہے۔

نماز اور ناشتہ کے بعد شہر سے باہر پارک دیکھنے چلے گئے سب سے پہلے شہر کا پچھلا پاسا (BACK SIDE) دیکھا۔ سامنے جس قدر خوشحالی ہے اس سے کئی گُنا زیادہ مفلسی دوسری طرف ہے۔ رہنے کے گھر کا سوچنا غریب کے بس کی بات نہیں۔ گتے کا جھونپڑا، اگر مٹی کی دیوار پر ٹین کی چھت میسر آگئی تو بہت اعلیٰ گھر ہے۔ راستے نہ صرف کچے، سخت گندے بھی ہیں۔ سکہ پاکستانی روپے کے برابر ہے۔ مگر مہنگائی کم از کم پانچ گنا زیادہ۔ ایک کپ چائے ۵ شلنگ یعنی ۵ روپے۔ گھی ۱۰۰ روپے سیر۔ پٹرول ۱۱ روپے لٹر۔ یہی حال کپڑے اور جوتے کا ہے سستا جوتا ۴۰۰ روپے تک ہے۔

درمیانی طبقہ نہیں ہے اس لئے سائیکل یا موٹر سائیکل، رکشہ، تانگا کچھ نہیں۔ کار یا بس اور ریل یا پیدل۔ ارباب بست وکشاد کو باہر سے بھی بہت دولت ملتی ہے مگر لوگوں کی عادتیں نہیں بگاڑنا چاہتے لہٰذا باہر سے باہر ہی اپنے ذاتی حسابات میں منتقل کر دیتے ہیں۔ ہر محکمہ خیرات کی طرح رشوت طلب کرتا ہے جو بڑی شریفانہ ہوتی ہے یعنی سو، دو سو میں کام کرایا جاسکتا ہے ہماری طرح رشوت میں مہنگائی نہیں۔

پھر پارک دیکھا سینکڑوں میل پر پھیلا ہوا قدرتی پارک خوبصورت ہرنوں، جنگلی پرندوں، زرافوں، جنگلی بھینسوں اور مختلف درندوں سے اٹا پڑا ہے، اندر کچھ سڑکیں ہیں جو دیکھنے والے استعمال کرتے ہیں۔ کافی مہنگا ٹکٹ ہے۔ ہم نے آج واپس جانا تھا لہٰذا زیادہ تو نہ پھر سکے، بس چار پانچ گھنٹے میں جو ہو سکا، پھر لیا۔ واپسی پر چڑیا گھر ہے۔ اکثر درندے جن سے پارک میں ملاقات نہ ہوئی تھی، وہاں دیکھ کر حسرت پوری کی اور اب گیارہ بجے دن گھر پہنچے ہیں۔ ذرا دم لیں گے ظہر ہوگئی اور کھانا کھا کر ہوائی اڈے کو چلیں گے۔

آج خیر سے اپنی ہوائی کمپنی ہوگی، پی۔آئی۔اے۔ اور ہم ابوظہبی جا اُتریں گے۔ مگر اب میں مزید کچھ نہ لکھوں گا کہ بہت لکھا ہے۔ پھر وہاں احباب لکھنے والے بھی ہوں گے ریکارڈ کرنے والے بھی۔ انشاءاللہ!

لہٰذا میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں اور اللہ کریم کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے ایک جانکاہ حادثے کے بعد اس قدر جلد اپنے کرم سے نوازا کہ اتنے طویل سفر، اذکار، بیانات اور سب کام بحسن وخوبی ہوتے رہے۔ آئندہ بھی اُسی کے کرم کی اُمید ہے۔

میں برف ہی برف ہوتی ہے تو برف کا موسم ہوتا ہے۔ یہ لوگ برف کی سردی سے بچنے کے لئے لباس استعمال کرتے ہیں۔ کسی انسانی ضرورت، انسانی معیار یا شرم وحیا کی کوئی دیوار، ان کے راستے کی دیوار نہیں ہے۔

اب یہ بیماری ہمارے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں اپنی پوری قوت اور پورے زور سے داخل ہو چکی ہے

اس سال پہلی دفعہ دوبئی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر قدِ آدم بورڈ دیکھا جس پر مغربی طرز کے (BEACH) بیچ کا فوٹو لگا ہوا تھا اور اس پر لکھا ہوا تھا،

"THIS IS DUBAIY."

شاید اکثر دوست بیچ سے نہ سمجھ سکیں، بیچ سے مراد سمندر کا وہ ریتلا کنارہ ہوتا ہے جہاں مغربی لوگ بلا تفریق جنس، بغیر عمر کی قید کے، بغیر کسی لباس کے دن بسر کرتے ہیں۔ نہاتے دھوتے ہیں، دھوپ میں ریت پر لیٹتے ہیں، اٹھکیلیاں کرتے ہیں اور وہ اس جگہ کو BEACH کہتے ہیں۔ ہر طرح کے لباس، ہر طرح کے شرم وحیا سے آزاد، باپ بھی ہوتے ہیں بیٹیاں بھی ہوتی ہیں۔ بہنیں بھی ہوتی ہیں، بھائی بھی ہوتے ہیں، بیویاں بھی ہوتی ہیں، خاوند بھی ہوتے ہیں اور کوئی کسی کا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

پہلی دفعہ یہ چیز دوبئی میں دیکھی ہے اور یہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے، ورنہ سارے مشرقِ وسطیٰ میں بحرین ایک ایسا علاقہ تھا جس میں یہ چیزیں تھیں اور وہ جزیرہ نمائے عرب سے کٹا ہوا ایک جزیرہ تھا اس میں یہ ساری فحاشی بھی تھی، جوئے خانے بھی تھے، شراب کی آزادی بھی تھی اور جنس کی آزادی بھی۔ لیکن اب وہ اس سے آگے بڑھ گئی ہے۔

دیارِ غیر میں

میں نے پچھلے سال بین الاقوامی دورے سے واپسی پر تقریباً مغرب کے خدوخال کا سارا نقشہ آپ احباب کے سامنے رکھا تھا اور مغرب میں ابھی تک کچھ بھی نہیں بدلا۔ اگر آپ کو یاد ہو تو المرشد میں شائع بھی ہو گیا تھا، تو بجائے اس کے کہ اس کو میں دہراؤں، آپ اگر یادیں تازہ کرنا چاہیں تو پھر اسے دیکھ لیں۔

آپ جونہی سمندر عبور کر کے برطانیہ کی سرحد سے شروع ہوتے ہیں تو قطب شمالی تک چلے جائیں یا پھر آپ شمال میں اس پورے امریکہ سے ہوتے ہوئے اگر جاپان جائیں، واپس بھی آنا چاہیں تو بشمول ہانگ کانگ، برما وغیرہ آپ چین کو بھی شامل کر سکتے ہیں، روس کو بھی شامل کر سکتے ہیں، وسط ایشیا کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ پھر یورپ میں آ جاتیے کہ یہ ساری خلقِ خدا لباس صرف سردی سے بچنے کے لئے پہنتی ہے کسی شرم وحیا کے لئے نہیں اور آپ اندازہ کریں، کہ اس کرۂ ارض پر کتنی مخلوق بستی ہے۔ یہ سارے ممالک سرد ہیں تقریباً خطِ سرطان سے سارے اُوپر اوپر ہیں اور یہاں گرمیوں میں بھی ٹھنڈ ہوتی ہے، سردیوں

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کہ ہم مغربی اقوام یا غیر مسلم اقوام یا یہود و نصاریٰ کی بات کرتے رہیں، میرے خیال میں ہمیں سب سے پہلے مسلمان قوم کا جائزہ لینا ہے، اپنے آپ کو پرکھنا ہے، اپنے متعلق صحیح اندازہ قائم کرنا ہے کہ ہم کون ہیں؟ ہمیں کہاں ہونا چاہیئے؟ ہم کس جگہ کھڑے ہیں؟

آج میرا جی چاہتا تھا کہ میں اپنا تعارف تلاش کروں کہ ہم کون ہیں اور قرآن حکیم کی نگاہ میں ہمیں کہاں کھڑا ہونا چاہیئے اور قرآن کی توقع ہم سے کیا ہے؟ قرآن حکیم ہماری بات جب ہم سے مخاطب ہو کر کرتا ہے تو سب سے پہلے ابتداء ہی اس کلمہ خیر سے کرتا ہے کہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ۔ تم بہترین قوم ہو، دُنیا میں کوئی قوم تمہاری مثال نہیں ہے۔ دُنیا میں جتنی اقوام بستی ہیں، قومیں بستی ہیں، لوگ بستے ہیں، تہذیبیں ہیں، معاشرے ہیں، رواجات ہیں، طرز ہائے زندگی ہیں۔ ان سب میں باختیار عقیدے، عمل، معاشرت، اخلاق کے ہر پہلو سے تم بہترین قوم ہو۔ اس لئے اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ کہ تمہیں اللہ نے پیدا ہی دوسروں کے لئے کیا ہے۔

ایک گاڑی ہم بناتے ہیں جو خود چلتی ہے۔ ایک گاڑی بنائی جاتی ہے جو دوسری گاڑیوں کو کھینچ کر لانے کے لئے ہوتی ہے وہ کھینچ کر لانے والی اُس دُوسری سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ ہم کوئی بھی چیز دُنیا کی بناتے ہیں دُوسروں کے کام وہ تب آتی ہے۔ جب وہ اُن اوصاف میں اُن سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ مسلمان بحیثیت ایک قوم، ایک اُمت کے ساری کائنات، ساری اقوام کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو تخلیقی، بنیادی طور پر ہر قوم سے اسے بہتر ہونا چاہیئے تب یہ دوسروں کا سہارا بن سکے گا۔ اگر یہ خود کمزور ہے تو دُوسروں کو کیا سہارا

دے گا۔ دوسروں کا ہم نے کیا سنوارنا ہے۔ کیا ہم نے اُن کے لئے کھانے پینے کا انتظام کرنا ہے؟ کیا ہم نے اُن کے مکان بنانے ہیں؟ کیا ہمارے ذمّہ ہے کہ ہم اُن کی حفاظت کریں؟

ہم نے اُن کا کیا کرنا ہے؟

فرمایا، تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ۔ تمہارے ذمّہ ہے کہ تم دُنیا بھر کی اقوام کو نیکی کا سبق دو۔ یہ تمہاری ذمّہ داری ہے کہ دُنیا کے ہر فرد کو بُرائی سے روکو! اگر ہم یہ کریں، اگر ہم میں قوّت پیدا ہو جاتے کہ ہم دوسری اقوام کو نیکی کی طرف دعوت دے سکیں، انہیں بُرائی سے روک سکیں تو ہمیں اللہ کریم سے کیا ملے گا؟

فرمایا، تمہارا میرے ساتھ ایمان مضبوط ہو جائے گا، تم میرے بندے بن سکو گے، تمہیں میری ذات پر یقینِ کامل نصیب ہو جائے گا۔ اب اس کو آپ واپس پڑھنا شروع کریں تو کیا ہو گا؟ کہ اگر ہم نیکی کا حکم کرنا چھوڑ دیں گے، اگر ہم برائی سے روکنا چھوڑ دیں گے، تو ہمارا اپنا ایمان متزلزل ہو جائے گا۔

اس سے پیچھے چلیں تو فرمایا، تمہارا مصرف ہی یہ ہے تمہیں پیدا ہی دوسروں کے لئے کیا گیا ہے۔ تمام قوموں نے اپنے لئے، اپنی قوموں کے لئے، اپنے ممالک کے لئے، اپنی معاشرت کے لئے، اپنی تہذیب کے لئے زندہ رہنا ہے لیکن تمہیں اللہ کے لئے، اللہ کے دین کے لئے، اللہ کے رسول ﷺ کے لئے، اللہ کی کتاب کے لئے، اللہ کے احکام کے لئے، اللہ کی مخلوق کے لئے زندہ رہنا ہے تو تمہارے جینے میں اور دُوسرے انسانوں کے جینے میں، ایک بنیادی فرق ہے۔ ہر فرد کو اپنے لئے جینا ہے، اپنے بچوں کے لئے جینا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سوچے گا تو اپنی قوم کے لئے سوچے گا، لیکن تمہیں ساری

انسانیت کے لئے زندہ رہنا ہے اور اگر یہ نہیں کرو گے تو پھر تم خیرِ اُمّت نہیں کہلا سکو گے چونکہ خیرِ اُمّت کا تو مصرف ہی یہی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ جو چیز اپنے مصرف کی نہیں رہتی اُس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ہم کرسی بناتے ہیں، جب اس کی سیٹیں اُکھڑ جاتی ہیں، ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہیں تو وہ سٹور میں پھینک دی جاتی ہے، بالآخر چولہے میں پھینک دی جاتی ہے۔ برتن ٹوٹتے ہیں کسی کام کے نہیں رہتے بالآخر کباڑی سے ہوتے ہوئے پھر بھٹیوں میں پگھلا دیئے جاتے ہیں، واپس دھات بن جاتے ہیں۔ کپڑے پھٹتے ہیں کسی کام کے نہیں رہتے تو پھر آخر پھینک دیئے جاتے ہیں، ردّی میں چلے جاتے ہیں جلا دیئے جاتے ہیں، ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔

ہم بھی اگر کسی مصرف کے نہیں رہیں گے تو ردّی میں بکیں گے، کوڑے میں پھینک دیئے جائیں گے، ذلت اور رسوائی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا، اور آج آسٹریا سے لے کر فلسطین تک دیکھ لو، کہاں عزّت ہے مسلمانوں کے پاس! آپ کہتے ہیں مغربی اقوام مسلمان کی عزّت نہیں کرتے۔ میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مسلمان کی اپنے گھر میں کوئی عزّت نہیں ہے اگر مسلمان کی امریکن عزّت نہیں کرتے تو مسلمان کی پاکستان میں کیا عزّت ہے۔ کسی اور ریاست میں کیا عزّت ہے؟ میں نے تو چپہ چپہ پھر کر دیکھا ہے، مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ کسی جگہ پر اس !! یورپ میں نے کسی شخص کو پرسکون نہیں پایا کہ یہ مسلمان ہے اس کا احترام کیا جائے۔ کسی مسلمان ریاست میں شاید اس لئے کہ ہم اُس پائے کے مسلمان رہے ہی نہیں، جس پائے کا مسلمان عزت کا مستحق ہوتا ہے۔

کوپن ہیگن میں یہ بات ہوئی اور میرے خیال میں مغربی معاشرے میں

لوگوں نے جگہ جگہ یہ سوال کیا۔ ہر جگہ تقریباً بات ایک ہی تھی، اگرچہ الفاظ مختلف تھے۔ یہ باتیں میں لکھتا رہا ہوں چند ایک اور لکھوں گا۔ آپ کے سامنے "المرشد" میں آتی رہیں گی۔ میرا خیال ہے کہ ان تمام باتوں کو یکجا کر کے ایک چھوٹا سا کتابچہ بن جائے تاکہ ایک آدمی ایک نگاہ میں ان سب کو پڑھ سکے۔

مغرب میں جتنے مسلمانوں سے واسطہ پڑا، اُن سب کی شکایت ایک ہی ہے۔ بڑی دیر کے بعد انھیں ہوش آئی۔ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ وہ دولت یہاں سے کما کر لے جائیں گے۔ مغرب والوں نے اپنا دروازہ بند نہیں کیا، ہر آنے والے پر اپنا دروازہ کھلا رکھا اور دولت کے وسائل بھی انھوں نے بند نہیں کئے۔ لوگ رات دن کام کرتے رہے، اتنا کام کیا جتنا وہ اپنے ملک میں نہیں کرتے تھے اور سوچتے بھی نہیں تھے کہ ہم اتنا کام کریں گے۔ انھوں نے کروڑوں ڈالر کمائے، لیکن وہ خود مزدوری کرتے رہے اور ان کی آئندہ پیدا ہونے والی نسل برطانیہ میں پیدا ہوئی، فرانس میں پیدا ہوئی، ڈنمارک میں پیدا ہوئی، امریکہ میں پیدا ہوئی، کینیڈا میں پیدا ہوئی۔ اور وہ پیدا ہونیوالی نسل ان کے سکول میں گئی۔ وہاں کی ہوا کھائی، وہاں کی غذا کھائی، وہاں کی تہذیب سیکھی، وہاں کی تعلیم پائی اور جب یہ کروڑوں ڈالر کما چکے تو ان کے آگے جو تصویر تھی یہ کبھی مسلمان کی نہیں تھی بلکہ ایک برطانوی شہزادے کی تھی، ایک امریکن شہری کی تھی۔ مسلمان لڑکی کی بجائے ایک کینیڈین بچی کھڑی تھی، ایک فرانسیسی بچی سے باپ کو سابقہ پڑا مسلمان بچی کی بجائے۔ اور اب وہ حیران کھڑے ہیں۔ اب وہ وطن واپس نہیں آ سکتے۔ بیٹیوں اور بیٹوں کے بغیر اور وہ وہاں اس لئے نہیں رہ سکتے کہ ان کی بیٹیاں بیٹے ان کا جنازہ پڑھنے کے قابل نہیں۔

اس ملک کا کچھ نہیں بگڑا۔ انھوں نے جتنا کمایا، جتنے مکان بنائے جتنی
دکانیں بنائیں، جتنا سرمایہ کمایا وہ بھی اُس ملک میں رہ گیا۔ انھوں نے گدھے
کی طرح کام کیا وہ اس ملک کی تعمیر میں لگا۔ انھوں نے جو اولاد پیدا کی وہ اس
ملک کے شہری بن گئے۔ ان کا کام ہر لحاظ سے سُدھر گیا اور آج اِن کے پلّے
کچھ نہیں اور آج یہ حال صرف مسلمان کا نہیں ہے۔

میں نیویارک شہر گیا، وہاں دارالعرفان کے جو خادم ہیں، وہاں انھوں
نے چھوٹی سی دکان بنا رکھی ہے۔ مین ہیٹن میں (مین ہیٹن نیویارک کا بھی دل ہے
جتنی بڑائی زمین پر ہوتی ہے بیک وقت مین ہیٹن میں بھی ہوتی ہے شاید اس
سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔) انھیں دکان کے لئے جگہ ایک ہندوستانی سکھ نے
دی ہے بہت بڑی بلڈنگ ہے اس میں اُس کا ہوٹل ہے کافی حصّہ اس نے
کرائے پر دے رکھا ہے۔ کچھ میں خود رہتا ہے۔ مین ہیٹن میں کئی منزلہ بلڈنگ
کا مالک ہونا، اس کا مطلب ہے کہ وہ اربوں ڈالر کا مالک ہے۔ لیکن میں حیران
تھا کہ ایک سکھ نے ان بچوّں کو کیوں جگہ دی؟ اور وہ کہتے ہیں وہ سکھ خوش ہوتا
ہے وہ کہتا ہے، "نماز پڑھا کرو میرے مکان میں!" میں نے کہا، نماز کہاں
پڑھتے ہو؟ کہنے لگے، اس بیسمنٹ (BASEMENT) میں نیچے جو تہہ خانہ
ہے اس نے خالی رکھا ہوا ہے اور اس میں اُس نے ہمیں بہت سی جگہ دے
چھوڑی ہے کہ یہاں وضو کرو، نماز پڑھا کرو، اللہ اللہ کیا کرو!۔

میں نے کہا، اِسے کیا مصیبت پڑی ہے؟

میں نے اس سے بات کی کہ بھئی! کیا بات ہے آپ نے انھیں کیوں
اتنی بلڈنگ کی جگہ دی ہے؟

اُس نے کہا، کچھ نہ پوچھو، میں اربوں ڈالر کا مالک ہوں۔ یہاں ہمارے
ملک کی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی آئی تو وہ پرسنلی مجھ اکیلے آدمی کو ملی، پُورا فرسٹ پیج
جو تھا اخباروں کا وہ میری تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ میرے پاس آج بھی
کروڑوں ڈالر ہیں لیکن میرا بیٹا ایک سپینش (SPAINISH) لڑکی کے ساتھ چلا
گیا ہے مجھے کہتا ہے جاؤ! اپنا کام کرو، میں یہ کروڑوں ڈالر کس کو دوں، میں
انھیں کہاں لے جاؤں؟

اگرچہ وہ کافر ہے لیکن اُسے کم از کم یہ احساس تو ہے کہ اس کی ایک اپنی
قوم ہے، ایک اپنا ملک بھی ہے، ایک اپنی جگہ بھی تھی۔ اس نے ساری عمر
ضائع کی، رات دن مزدوری کی، اربوں ڈالر کمائے لیکن یہ انھی لوگوں کے
ہیں جن کے دروازے پہ اس نے محنت کر کے کمائے تھے بغیر کسی مشقت کے
انھیں واپس دے رہا ہے اس لئے کہ اس کی اولاد انھوں نے لے لی ہے
اور سب مال اُسی اولاد کا ہے جو ان کے دروازے پہ پڑی ہے۔

لندن میں بریڈ فورڈ میں تھا تو ہم بازار ایک ٹیکسی میں گئے کہ اپنی موٹر پارک
کرنے کا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ پھر آدمی اگر ایک دو سٹوروں میں گھومتا ہوا نکل جائے
تو واپس وہیں آنا پڑتا ہے جہاں گاڑی چھوڑی تھی۔ ٹیکسی کا سیدھا سا معاملہ ہے
جہاں فارغ ہوئے وہاں سے پکڑ لی، گھر چلے گئے۔ واپسی پر جو ٹیکسی پکڑی اس
کا ڈرائیور ایک مسلمان تھا، شکل سے پاکستانی نہیں لگتا تھا لیکن اس نے بتایا
کہ وہ پاکستانی مسلمان ہے۔ کہنے لگا، جی! آپ نے ہمارے لئے کیا سوچا ہے
آپ ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں؟

میں نے کہا، "میری مدد کو آپ چھوڑیں، آپ پہلے اپنی تکلیف بتائیں!

آپ کو تکلیف کیا ہے؟ کہ آپ کی مدد کروں کس قسم کی مدد چاہیئے آپ کو؟"

وہ کہنے لگا کہ ہمارے بچے اور بچیاں ہیں ان کے لئے کوئی علیحدہ سکول نہیں ہے۔ یہاں کی سکولنگ کا طریقہ یہ ہے کہ بچے کو صبح سکول کی گاڑی لے جاتی ہے وہ بمشکل دودھ کا کپ گھر پیتا ہے۔ اس کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور ظہر کی چائے یہ سب کچھ سکول میں ہوتا ہے جس میں خنزیر تک ہر چیز شامل ہوتی ہے اور اگر بکرے کا، بیل کا یا گائے گوشت ہو تو وہ بھی مشین کا کٹا ہوا ہوتا ہے اس میں ذبیحہ کا اہتمام بہرے سے نہیں کیا جاتا۔ بچیاں آٹھویں، نویں، دسویں، گیارھویں میں جب جاتی ہیں تو آٹھویں سے اوپر سوئمنگ (SWIMMING) کا ایک لازمی پیریڈ ہوتا ہے۔ بچوں بچیوں کا اکٹھا بغیر کپڑے پہنے ہوئے تالاب میں تیرنا ہوتا ہے، لڑکیوں نے بھی لڑکوں نے بھی۔ ہفتہ ہفتہ آؤٹنگ (OUTING) ہوتی ہے۔ آٹھویں، نویں، دسویں کی بچیاں، بچے پیدا کرنا شروع کر دیتی ہیں جبکہ ان کی شادی نہیں ہوتی۔

میں نے کہا، آپ نے اس کے لئے کچھ کیا؟ آپ کچھ کر رہے ہیں، کہ آپ کی کچھ مدد کروں؟

تو وہ مجھے کہنے لگا کہ وہ پرسوں سکول گیا تھا اور اتفاق کی بات ہے کہ جب وہ سکول گیا تو وزیر تعلیم سکول آیا ہوا تھا۔ وہ ہماری طرح کا معاشرہ نہیں ہے کہ منسٹر نے آنا ہے تو سڑکیں بلاک ہیں، ڈھول بج رہے ہیں۔ دروازے بنے ہوتے ہیں، کچھ بھی نہیں! ایک آدمی کی طرح وزیر بھی بازار سے سودا سلف خرید لاتے ہیں، عام انسانوں کی طرح رہتے ہیں۔ آپ کو سڑک پر مل سکتے ہیں، کوئی ایسی بات نہیں ہے اور عام ملازموں کی طرح ڈیوٹی کرتے ہیں؛ وزیر منتخب

ہونے کے بعد وہ بھی ایک دفتری آدمی ہوتے ہیں اور وزیر تعلیم ہائی سکولوں تک کے معائنہ کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہاں تک کی خرابیوں کی جوابدہی اسے کرنی ہوتی ہے کیبنٹ کے سامنے۔ وزیر ہائی سکولوں تک کو پرسنلی وزٹ کرتے ہیں تو وہاں وزیر تعلیم بیٹھا تھا، میں بڑا خوش ہوا۔ اس سے ملا۔ تو اس نے پوچھا کہ آپ یہاں کیسے آئے؟ ۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آپ کم از کم ہم مسلمانوں کے بچوں کے لئے حلال گوشت کا اہتمام کریں، اور انھیں کھانے میں خنزیر کا گوشت نہ دیں۔

اس نے کہا، "تم اپنے ایک بچے کی بات کرتے ہو، پاکستانیوں کے جتنے بچے ہیں ان میں سے کسی ایک کو بلا لو!"

میں نے ایک بچے کو بلایا تو اس نے اس سے پوچھا کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ ۔ اس نے کہا، "پاکستانی!" وزیر صاحب نے کہا، میں مذہب پوچھتا ہوں؟ ۔ اس نے کہا،

"پاکستانی!"

اس نے تیسری دفعہ پوچھا،

"بیٹا! میں نے آپ سے پوچھا آپ کا مذہب؟ WHAT IS YOUR RELIGION?"

اس نے کہا، "I AM PAKISTANI."

اس نے میری طرف دیکھ کر کہا، "اس کے لئے تم حلال حرام کی بات کرتے ہو، HE EVEN DOES NOT KNOW, WHAT IS RELIGION. مذہب کسے کہتے ہیں اسے تو یہ بھی پتہ نہیں، اس کے

لیے تم حلال حرام کہتے ہو؟"

ڈرائیور کہنے لگا، اُس نے کہا، کہ یہ بچّے تمھارے نہیں یہ ہمارے ہیں، تم جاؤ، اپنی ٹیکسی چلاؤ! جب مر جاؤ گے تمھیں دفن کر دیا جائے گا۔ "مت گھبراؤ ان کا فکر چھوڑ دو، یہ بچّے تمھارے نہیں، ہمارے ہیں!"

اس کے باوجود وہ باقاعدہ کلین شیو تھا، ٹائی تک باضابطہ پہنے ہوئے تھا۔ میں نے کہا،

"ہمت ہے تمھاری، ابھی تک تم نے گلے سے یہ پھندا تو نہیں اتارا یعنی اتنا کچھ بھگتنے کے باوجود تمھیں شرم تک نہیں آتی کہ تم اپنی ڈگر سے نہیں بدلے تم خود نہیں ہٹنا چاہتے ہو تو بچوں کو کیسے بدل سکتے ہو؟ تم خود حلال حرام کی پرواہ نہیں کرنا چاہتے ہو، تم خود خدا کے دروازے پہ آنا نہیں چاہتے ہو، تم خود سجدہ نہیں دینا چاہتے ہو، اولاد کو کیسے ولی اللہ بنا لینا چاہتے ہو۔"

ان سب کا ایک ہی جواب تھا، تمام ممالک میں الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ کہ معاشرہ یا سوسائٹی کا بہت زیادہ دباؤ ہے اور ہم چند افراد اس کے سامنے کھڑے نہیں ہو سکتے، ہم کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟

میں نے کہا، بات تمھاری بڑا وزن رکھتی ہے معاشرہ تو روڈ رولر کی طرح چلتا ہے جو چیز سامنے آتی ہے اسے کرش کرتا چلا جاتا ہے۔ معاشرہ کا دباؤ باقی دُنیا کے لیے ہے لیکن مسلمان کے لیے نہیں۔ اس لیے کہ مسلمان کی فطرت ایسی ہے کہ معاشرے سے کرش نہیں ہوتا بلکہ معاشرے کو توڑ پھوڑ دیتا ہے تم اس سوسائٹی کی بات کرتے ہیں جس کے پاس کھڑا ہونے کی جگہ ہی نہیں۔ معاشرہ تو وہ سخت تھا جب اسلام کا ظہور ہوا۔ جب وہ اکیلے بُت کو سجدہ

نہیں کرتے تھے بلکہ دوسرے کو بھی کہتے تھے کہ تم اس بُت کو سجدہ کرو، ورنہ تمھارا سر کاٹ دیں گے۔ جب وہ بُرائی کرتے تھے تو دُوسرے کو حکماً اس بُرائی پہ مجبُور کرتے تھے۔ اس معاشرے میں تو جان ہی نہیں ہے۔ اگر یہ بُرائی کرتا ہے تو خود کرتا ہے، آپ کو مجبُور نہیں کرتے اور اپنی بُرائی سے خود تنگ ہیں، ان کے پاس کوئی واپسی کا راستہ ہی نہیں۔

معاشرہ تو وہ تھا جب کسی نے لا الٰہ الا اللہ پڑھا تو اس کی جان کو آ گئی لیکن کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ اللہ کے رسُول ﷺ نے اکیلے کھڑے ہو کر پورے معاشرے کو چیلنج کر دیا تھا کہ بس بھئی! بہت ہو چکی ہے اب رُک جاؤ، بلکہ اب تمھیں واپس چلنا ہو گا۔ اور کیا وہاں سے تاریخ کا سائیکل اُلٹا چلنا شروع نہیں ہو گیا؟ کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ دو آدمی مسلمان ہوئے، چار ہوئے، پانچ ہوئے، دس ہوئے ایک ایک دو دو بڑھتے گئے اور معاشرہ اپنی ساری سختی کے باوجود ان کے لیے جگہ پیدا کرتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ نصف صدی ختم ہونے سے پہلے پہلے چائنہ سے لے کر ہسپانیہ تک اور سائبیریا سے لے کر جنوبی افریقہ تک ایک مسلم سٹیٹ بن چکی تھی جس میں اللہ کا قانون نافذ تھا، کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا تھا۔ کوئی بے حیائی نہیں تھی۔ کوئی چوری نہیں تھی کوئی بدکاری نہیں تھی۔ کوئی جھوٹ نہیں تھا۔ کوئی ظلم نہیں تھا۔ کوئی جور و جفا نہیں تھی وہ زمین جو تمام بُرائیوں سے پُر تھی خار خار تھی وہ ایک گلستان میں بدل گئی۔

آج اس میں سے کیا چیز بدلی ہے؟ اس وقت کیا تھا، اللہ تھا، اللہ کی کتاب تھی، اللہ کا رسُول ﷺ تھا، اللہ کے بندے تھے۔ ان چار کے علاوہ پانچواں عنصر کیا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ کیا اللہ بدل چکا ہے؟ ہرگز نہیں!

کیا اللہ کی کتاب معدوم ہو گئی یا بدل گئی؟ بالکل نہیں! وہی ہے جو اس وقت
نازل ہوئی تھی۔ کیا نبوت تبدیل ہو گئی ہے؟ وہ نبی نہ رہا، کوئی اور نبی آیا؟ نئی
نبوت آئی یا کوئی نبوت میں تبدیلی آئی یا اس کی کوئی قوت بڑھا گھٹا دی گئی یا
اس کی برکات کچھ تبدیل ہوئیں؟ ہرگز نہیں۔ تو پھر تبدیلی کیا آئی؟ مومن میں جو
اس وقت تھا، وہ آج نہیں ملتا۔ وہ کون تھا؟ میں اور آپ!

جن کو دیکھ کر آپ خوش ہوتے ہیں یہ نوجوان لڑکیاں جو ننگی پھر رہی ہیں
یہ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، میری اور آپ کی بیٹیاں ہیں۔ ان تک اللہ کا اللہ
کے رسول ﷺ کا پیغام پہنچانے کے ہم مکلف ہیں، ہم ان کے ننگے بدن
دیکھنے کے مکلف نہیں ہیں ہم ان کے بدن ڈھانپنے کے مکلف ہیں۔ ہم سے یہ
حساب ہوگا۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ ان ننگے جسموں کو ڈھانپنے کے لیے ہم
نے کیا محنت کی؟ جنہیں دیکھ کر تم کہتے ہو یہ انگریز کی بیٹی ہے، یہ امریکن کی بیٹی
ہے، یہ سویڈش کی بیٹی ہے، یہ ناروے کی لڑکی ہے۔ میں انہیں آدم علیہ السلام
کی بیٹیاں سمجھتا ہوں، میں انہیں محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمت دعوت
تسلیم کرتا ہوں کیونکہ ان سب کی طرف حضور مبعوث ہوئے ہیں۔

میں اور آپ اگر ان کے برہنہ جسم دیکھ کر انجائے کریں گے تو انہیں اللہ
کا پیغام کون پہنچائے گا۔ کافر میں اور مسلمان میں فرق کیا ہوا۔ کیا فرق ہے کافر
اور مسلمان میں۔ قد مختلف ہوتا ہے، رنگ مختلف ہوتا ہے، شکل مختلف ہوتی
اعضاء مختلف ہوتے ہیں، پیدا ہونے کا طریقہ مختلف ہوتا ہے، غذائیں مختلف
ہوتی ہیں، بیماریاں مختلف ہوتی ہیں، عمریں مختلف ہوتی ہیں۔ کیا اختلاف ہے
کچھ بھی تو نہیں! مومن پیدا ہوتا ہے، بچہ ہوتا ہے، لڑکا ہوتا ہے، جوان ہوتا

ہے، شادی کرتا ہے، اولاد ہوتی ہے، دولت کماتا ہے، گھر بناتا ہے، بوڑھا
ہوتا ہے، مرجاتا ہے۔ کافر پیدا ہوتا ہے، بچہ ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے،
شادی کرتا ہے، گھر بناتا ہے، بچے ہوتے ہیں، مرجاتا ہے۔

فرق کیا ہے؟

کافر مائع کی مثال ہے۔ کافر کے پاس سٹیبلٹی (STABILITY) نہیں ہوتی
اثبات نہیں ہوتا۔ کافر ایسے ہوتا ہے جیسے پانی۔ جس برتن میں ڈالو، اُس جیسا
ہو جاتا ہے۔ پانی کو گلاس میں ڈالو گلاس کی شکل بنا لے گا۔ بوتل میں ڈالو بوتل
جیسی شکل ہو جائے گی۔ گول دیگچی میں ڈالو گول ہو جائے گا۔ کسی چوکور برتن میں
ڈالو چوکور ہو جائے گا۔ کافر دُنیا میں اِس طرح جیتا ہے کہ جس معاشرہ میں جاتا
ہے اس میں ضم ہو جاتا ہے اس کا اپنا کچھ نہیں ہوتا۔

مومن ٹھوس ہوتا ہے۔ ٹھوس جو ہوتے ہیں وہ ڈھلا نہیں کرتے جہاں
جاتے ہیں وہاں ویسی جگہ بنانی پڑتی ہے جہاں وہ ٹھوس چیز رکھی جاتے۔ یا
وہ ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں، ڈھلتے نہیں ہیں۔ خود ٹوٹ جاتے ہیں یا اس جگہ
کو توڑ کر اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ مومن یا تو شہید ہو جاتا ہے ورنہ دوسروں کو ایمان
عطا کر جاتا ہے اگر مومن بھی ہر معاشرہ میں ڈھلنا شروع ہو گیا تو فرق بتائیے
مومن اور کافر کا۔ صرف یہ کہہ دینا کہ ہم مسلمان ہیں، اس سے کیا فرق پڑے
گا۔ دو آدمی ہیں، دونوں نے کھانا نہیں کھایا۔ ایک کہتا ہے میں نے نہیں کھایا
اور ایک کہتا ہے میں نے کھا لیا ہے۔ نتیجے میں کیا فرق پڑے گا۔ صرف یہ
کہہ دینے سے مسلمان مسلمان نہیں ہو جاتا۔

وہاں جس بات نے مجھے بہت دُکھ پہنچایا، جس کی شکایت میں لکھوں

گا اور ملک کے چپے چپے میں پھیلاؤں گا۔ وہ شکایت مجھے کافروں سے نہیں ہے، عام مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ مذہبی پیشواؤں سے ہے، پیروں سے ہے علماء سے ہے۔ ان مسلمانوں کو دیکھا ہے اگر وہ نام نہ بتائیں تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے ہندو ہے، عیسائی ہے، یہودی ہے یا مسلمان ہے۔ ان غریبوں سے یہ دونوں ہاتھوں سے ڈالر لوٹ رہے ہیں لیکن انھیں اللہ کا دین نہیں بتاتے بلکہ اُن کا ایمان خراب کرتے ہیں انھیں مساجد میں لڑاتے ہیں اور وہاں بھی یہ فتنہ لے جاتے ہیں۔ نیوجرسی میں پاکستان کا بیٹھا ہوا مولوی تقریر کر رہا ہے،

"اے نبی کو اپنے جیسا بشر ماننے والو!"

خدا کے بندے! یہاں تو لوگ خدا کو نہیں مان رہے اور اگر آٹھ یا دس مسلمان مسجد میں بیٹھے ہیں اور نیوجرسی اتنا بڑا شہر ہے کہ یہاں سے لے کر آپ دس بارہ میل تک چلے جائیں یا اس سے زیادہ تو اتنی بڑی آبادی ہے اور اتنی بڑی آبادی میں آٹھ یا دس آدمی مسجد میں بات سننے آئیں تو انھیں بنیاد بتاؤ اسلام کی، انھیں صحیح، صاف ستھری تعلیم دو، اللہ پر ان کا اعتماد قائم کرو، انھیں پھر آپس میں لڑا رہے ہیں؟

ان کا کردار یہ ہے کہ لاہور کے ایک مولانا نیویارک تشریف لے گئے۔ تین دن پہلے اس خدا کے بندے نے ان سے زبردستی رمضان ختم کرا دیا، رمضان ختم ہو گیا۔ چلو عید پڑھو۔ جو لوگ اعتکاف بیٹھے تھے، انھیں اُٹھا دیا، رمضان ختم ہو گیا۔ تقویم کا حساب لگا لیا۔ تقویم سے سمجھ آ گئی ڈالر لئے، عید پڑھائی۔ دوسرے دن برطانیہ پہنچ کر عید کا اعلان کر دیا اور عید کی نماز پڑھائی۔ آپ ان کا ایمان دیکھیں وہاں سے پیسے لئے اور تیسرے دن فلاں کر کے عید بچوں کے ساتھ لاہور

کی اور یہاں بھی عید کی نماز پڑھائی اور پیسے لئے۔

آپ ان ظالموں سے پوچھیں جو نماز سال میں ایک دفعہ پڑھائی جاتی ہے ایک ہفتے میں ایک آدمی اس کی تین دن امامت کیسے کرتا ہے، یہ کونسی شریعت ہے، کونسا دین ہے، کونسی فقہ ہے اور یہ کہاں کا انصاف ہے اور پیروں کا کردار اس سے زیادہ گیا گزرا ہے۔

کوپن ہیگن میں مسلمانوں کی دکانیں ہیں شراب کی۔ ہر قسم کی شراب بکتی ہے وہ کھول کر نہیں بیچتے۔ میں نے کہا، کیوں بھئی! کیا پرابلم ہے؟ کہنے لگے، وہ بھئی! پیر صاحب نے منع کیا ہے کھول کر بیچنا گناہ ہے، بند بوتل بیچنے میں گناہ نہیں ہے۔ ان کو یہ بھی احساس نہیں کہ تمھیں جو پیسے دیتے ہیں۔ یہ بھی تو اسی حلال کمائی سے آ رہے ہیں اگر انھیں حلال حرام سے کوئی غرض ہو۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ لوگ کتنا ظلم کرتے ہیں، کہتے ہیں: "ہمیں پیسے دیتے رہو!" میں سمجھتا ہوں خود ان کا آخرت پر، خدا پر سرے سے ایمان ہے ہی نہیں۔ یہ دوسروں کو ایمان کیا دیں گے۔ جو آدمی چند ٹکے کے لئے یہ فتویٰ دیتا ہے کہ شراب کی بند بوتل بیچنا جائز ہے۔ اُسے یہ تو بتاؤ کہ یہ حرام ہے اگر کر رہے ہو تو اس بات کے قائل رہو کہ یہ گناہ تو ہے شاید وہ کبھی چھوڑ بھی دے۔ کہتے ہیں تم تو بوتل بیچ رہے ہو، شراب تو بند ہے شراب تو نہیں بیچ رہے ہو۔ تو اس بوتل کا بیچنا حلال ہے؟ اندازہ کر لو جواز کا۔ اب ہم ان سے اصلاح کی کیا اُمید رکھیں۔

کافرین کی بات سُننا بھی چاہتے ہیں، بات کرنا بھی چاہتے ہیں لیکن مولوی اور پیر، پاکستان سے لے کر دوسرے سرے تک نہ ہماری بات سُننا چاہتے ہیں نہ ہم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے زیادہ رکاوٹیں دین کی راہ میں،

تبلیغ کی راہ میں، نام نہاد مولویوں اور نام نہاد پیروں کی طرف سے ہیں۔ میں سب علماء کو تو نہیں کہہ سکتا، علماء میں نیک بھی ہیں، پیروں میں نیک لوگ بھی ہیں لیکن مجھے نیک لوگوں سے بھی یہ شکوہ ہے کہ نیک لوگوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے اور میدان بدمعاشوں کے سپرد کر دیا ہے۔ خدا ان کو بھی معاف نہیں کرے گا۔ ہمیں میدان میں نیک لوگ نظر نہیں آتے۔ یہ اپنے اپنے کونوں میں اپنی جان بچا کر بیٹھے ہیں جو کبھی نہیں بچے گی کہ یہ بھی مکلّف ہیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے۔ یہ کیوں میدان میں نہیں آتے۔ کونے میں بیٹھ کر تسبیح پڑھنا تو کوئی کمال نہیں ہے البتہ پیرس کے ہالی ڈے ان میں رہ کر باجماعت نماز پڑھنا مسلمان کی نشانی ہے۔

آپ کے اسلام کا اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب آپ چار سو سواریوں کے ساتھ جہاز میں سفر کر رہے ہوں، لیکن آپ تین آدمی بھوک پیاس سے بیٹھے ہیں چار سو آدمی کے برتن میں کھانا نہیں کھاتے کہ ہم کافروں کے استعمال کرنے والے برتن استعمال نہیں کرتے۔ آپ کا کسی کو احساس ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس زمین پر کھڑے ہیں، کسی کا کوئی کلچر، کوئی تہذیب، کوئی عقیدہ ہے کوئی بات اُن کے پاس ہے ورنہ ہمیں بھی یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ یہاں بیٹھے رہیں۔ لوگ خدمت بھی کرتے ہیں۔ اللہ نے عزت بھی دی ہے گھر سے کھانا بھی ملتا ہے خدا نے بے شمار ذرائع دیتے ہیں، مزدوری کے لئے زمین دی ہے، جائیداد دی ہے، اولاد دی ہے لیکن کیا یہ نعمتیں اس لئے دی ہیں کہ ہم اس کی نعمتیں کھا کر سو جائیں اور جو فریضہ اُس نے بحیثیت مسلمان ہمارے ذمہ لگایا ہے اُسے فراموش کر دیں۔

اگر ہم نے اس سب بے حیائی میں حصّہ نہیں لینا ہے تو ہم اسے دیکھنے کیوں جائیں۔ ہم دیکھنے نہیں جاتے ہم اس کا مقابلہ کرنے جاتے ہیں اور بحمد للہ! یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہم نے ایک مہینے میں چودہ ممالک میں ذاکرین کی جماعتیں پیدا کی ہیں اور یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہر ملک میں غیر مسلموں کو مسلمان بھی کیا ہے، لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔

اسلام میں زیادہ شادیاں کیوں کرتے ہیں؟

یہ عجیب لوگ ہیں، ان سے جواب نہیں بن پڑتا انھوں نے مطالعہ کبھی نہیں کیا، دیکھنے کی تکلیف نہیں کرتے، اُن کے لئے بڑا مسئلہ بنا ہوا تھا نبی کریم کی شادیاں اتنی کیوں ہیں؟ اس معاشرہ میں یہ بڑا اعتراض ہے۔ دیکھو جی! مولویوں کو یہ بیان نہیں کرنا چاہیئے۔ میں نے کہا تم گدھے ہو! کیوں بیان نہیں کرنا چاہیئے نبی اکرم ﷺ وہ شخصیت ہیں جس ہستی نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی بیوہ کے ساتھ نکاح کیا اور جب تک زندہ رہیں پچاس برس کی عمر تک رسول اللہ ﷺ نے اُسی کے ساتھ عہدِ وفا نبھایا اور اس طرح نبھایا کہ دنیا میں مثال قائم کر دی اگر آپ ﷺ کو کثرتِ ازدواج کا شوق ہوتا تو جوانی میں کیوں نہ کرتے؟

دوسرا نکاح سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد دیکھیں گے کہ جب آپ ﷺ کا خانہ مبارک زوجہ محترمہ سے خالی ہو گیا تو ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی سولہ سالہ دوشیزہ بیٹی خدمتِ عالیہ میں پیش فرمائی۔ اس کے بعد جتنے نکاح مبارک حضور نے فرمائے تو ان ازواج مطہرات کی کفالت کا سبب بنا اُن کے

پانچ پانچ چار چار بچوں کی کفالت کا سبب بنا۔ عمر رسیدہ خواتین تھیں، اُن کے شوہر شہید ہو چکے تھے کسی کے اُحد میں کسی کے بدر میں۔ وہ اعلیٰ قبائل کی خواتین تھیں۔ اور قبائل کے قبائل ان کی معرفت اسلام میں داخل ہوئے۔ لیکن کوئی مطالعہ کی تکلیف تو کرے۔ شوقیہ شادیاں کرنے کی عمر تو جوانی کی ہوتی ہے بڑھاپا شوقیہ شادی کرنے کی عمر تو نہیں ہوتی۔ لیکن اتنا بھی کوئی جواب نہیں دے سکا کتنی عجیب بات ہے۔

مغرب والوں کو اتنا نہیں کہہ سکتے کہ اسلام میں شادیاں تو چار کرنے کی اجازت ہے لیکن کوئی گرل فرینڈ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ تم شادی ایک کرتے ہو لیکن پچاس گرل فرینڈ اپنے ساتھ رکھتے ہو۔ وہ صحیح ہے یا یہ صحیح ہے۔ پھر اسلام میں آپ دو شادیاں بھی کریں تو ساتھ عدل کی قید ہے، عدل نہیں کر سکتے ہو تو ایک ہی رکھو۔ پھر دونوں کے لئے مکان کا اہتمام کرو، لباس کا اہتمام کرو، غذا کا اہتمام کرو، دونوں کے حقوق ادا کرو کسی کو شکایت پیدا نہ ہو اگر یہ سب نہیں کر سکتے تو ایک ہی رکھو۔

میں نے کہا، "دکھاؤ ایسا نظام تمھاری سوسائٹی میں ہے، تم گرلز فرینڈ اور بیوی میں مطابقت کر کے مجھے دکھاؤ!"

تو وہ مغربی لوگ بھی یہ کہتے تھے،

"THAT SOMETHING IS VERY BEAUTIFUL."

یہ بہت اچھا سسٹم ہے۔ لیکن کوئی انھیں بتاتے بھی۔

اگر ہم ہی لُوٹنے کو جائیں، ہم ہی صرف چندے اکٹھے کرنے کو جائیں، اور ہم ہی وہاں لڑنے کو جائیں۔ ایک جا کر کہتا ہے، مجھے پیسے دو جو پہلے آیا

وہ تمھیں گمراہ کر گیا وہ کافر تھا۔ دوسرا جا کر یہ کہتا ہے، وہ کافر ہے پیسے مجھے دو میں تمھیں اگلے جہان بخشواؤں گا۔

لیکن ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہمارے گھر میں آگ لگی ہوتی ہے جس شخص کا گھر جل رہا ہے وہ کس طرح سکون کے ساتھ کسی دوسرے کی مدد کر سکتا ہے؟ ہمارا اصل مسئلہ یہ نہیں کہ وہاں کفر کیوں پھیلا ہوا ہے ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اسلام پر یہاں عمل کیوں نہیں کرتے؟ اگر ہم جو یہاں بستے ہیں خدا نے ہمیں ملک دیا ہے خدا نے ہمیں ریاست دی ہے خدا نے ہمیں مُہلت دی ہے فرصت دی ہے۔ کیا ہم اپنے آپ کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں نہیں لا سکتے۔ کیا ہماری عبرت کے لئے دُنیا کا یہ حال کافی نہیں ہے۔ اگر ہم یہاں دین اپنا لیں اور دین پر باقاعدگی سے عمل کریں اور ہم خود کو مسلمان ثابت کریں تو اس دُنیا کو مسلمان بنانے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ زیادہ محنت نہیں لگتی زیادہ تکلف نہیں لگتا۔ آپ دیکھیں لوگ خود بخود مسلمان ہونا شروع ہو جائیں۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں یہ صرف منبر پر کہا جاتا ہے عملی زندگی میں، بازار میں، گلی میں، کاروبار میں، تجارت میں، دفاتر میں یہ کہیں نظر نہیں آتا۔

میں حج کو ایک مختلف نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ہر شخص کا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے میرا نقطۂ نظر حج کے متعلق یہ ہے کہ اللہ کے سامنے جا کر ہتھیار ڈال دینے کا نام حج ہے جس طرح کوئی فوج شکست تسلیم کر لیتی ہے اور دوسرے کے سامنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا دیتی ہے کہ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب ہماری طرف سے کوئی گولی نہیں چلے گی۔ تم ہمیں مارو، باندھو، چھوڑ دو، کہیں لے جاؤ، جیل میں رکھو، آزاد کر دو یہ تمھاری پسند پر ہے۔ ہم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ حج ہے

اللہ کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا نام۔ اگر اللہ کریم بیت اللہ شریف میں لے جائیں اور آپ کھڑے ہو کر دیکھیں تو وہاں جو کچھ ہوتا ہے بالکل وہی رسم ادا کی جاتی ہے جب فوجیں باقاعدگی سے ہتھیار ڈال دیتی ہیں۔ پریڈ کرتی ہیں کہ وہ ہتھیار بھی پیش کریں اور اُن کے کمانڈر کے کراؤن وغیرہ بھی اُتارے جائیں۔ بالکل ہاں یہی ہوتا ہے کہ کپڑے اتار دیتے جاتے ہیں، سر ننگا ہوتا ہے، پاؤں ننگے ہوتے ہیں، دو اَن سلی چادروں میں لپٹا ہوا بندہ، ہاتھ باندھے ہوئے اللہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے کہ خدایا! مَیں اپنی ساری کوتاہیوں، ساری کمزوریوں کے سمیت حاضر ہوں جو ہو چکا، ہو چکا۔ آئندہ میں تیرے حکم سے سرتابی نہیں کروں گا۔

اللہ کریم وہاں لے جائے تو یہ اُس کا بہت بڑا احسان ہے لیکن کیا اپنے حج کو ہم یہاں حجِ اکبر نہیں بنا سکتے؟ چونکہ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ وہ صرف بیت اللہ میں نہیں ہے بلکہ تم جہاں بھی ہو، ربِ جلیل تو موجود ہے۔ ہم اپنے اس حج کو جہاں بھی ہم ہیں کیا یہاں ہی ہم سرنڈر کر دیں تو بہتر نہیں ہے۔

آیئے! ہم اپنے اللہ سے عہد کریں کہ وہ ہمیں قبول کر لے اور پھر سے وہ ولولہ تازہ دے کہ ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے سربکف ہو جائیں۔

اردو میں ایک ضرب المثل ہے کہ گھر میں دانے نہیں امّی چلی پیسنے۔ بھئی خود تو عمل نہیں کرتے۔ اپنے دل کو یقین حاصل نہیں ہے تو کسی کو کیا دے گا؟ آؤ! اپنے پاس سرمایہ جمع کریں۔ سب سے پہلے اپنے دلوں کو آباد کریں۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کر دیا ہوا ہے۔ آپ نے کبھی کسی بحری جہاز کے ڈوبنے کا منظر پڑھا ہو گا، کسی فلم میں دیکھا ہو گا، کسی تصویر کو دیکھا ہو گا، کوئی کہانی سُنی ہو گی۔ جب جہاز پھٹتے ہیں یا ڈوبتے ہیں تو جو لوگ سمندر میں رہ جاتے

ہیں، اُن میں سے کوئی دیکھتا ہے کہ کوئی اور بھی ہاتھ پاؤں مارے تو میں ہاتھ پاؤں ماروں، ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ نہیں ہر کوئی ہاتھ پاؤں مارتا ہے اگرچہ وہ سمجھتا ہے کہ خشکی سے سینکڑوں میل دُور ہوں میں تیر کر نہیں پہنچ سکتا، پھر بھی ہاتھ پاؤں جب تک شل نہیں ہو جاتے مارتا ہی رہتا ہے کہ میں سر باہر رکھوں ممکن ہے کوئی بچنے کا سبب بن جائے۔

ہم عین سمندر میں غرق ہو رہے ہیں تو ہمیں دوسروں کو دیکھنے کی بجائے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے چاہئیں۔ جو اپنے لئے ہو سکتا ہے وہ تو کرنا چاہیئے۔ اگر یہ وبا دوبئی میں آ سکتی ہے، تو پاکستان زیادہ دُور نہیں ہے کل یہ بیچز (BEACHES) یہاں بھی بننا شروع ہو جائیں گی۔ اگر ہمارا یہی حال رہا تو یہ سب کچھ ہمارے گھروں میں آ جائے گا۔ اب پیشتر اس کے کہ یہ آگ یہاں لگے ہمیں اس کو وہاں بجھانا چاہیئے ورنہ اللہ کریم بڑا بے نیاز ہے۔

بغداد میں کتب خانے بھی بہت تھے۔ علماء بھی بہت تھے۔ مناظرے بھی گلی گلی ہوتے تھے۔ مباحثے بھی بہت ہوتے تھے۔ فتویٰ بازی بھی بہت ہوتی تھی۔ خانقاہیں بھی بڑی تھیں لیکن دین نہیں تھا، لوگوں کے دل خالی تھے خدا نے ان پر تاتاری مسلط کر دیئے اور انھوں نے ہر چیز تہس نہس کر دی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اتنے کتب خانے دریا میں انھوں نے پھینکے کہ چھ ماہ تک دریا کا پانی جب بغداد شہر سے گزرتا تھا تو وہاں سے سیاہ ہو جاتا تھا کیونکہ قلمی کتابیں ہوتی تھیں سیاہی سے لکھی ہوتی۔ لیکن اسلام نہیں مٹا۔ جن تاتاریوں نے مسلمانوں کو تباہ کیا تھا وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے اور سے

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

خدا کا پیغام قبول کر کے انھوں نے ایمان قبول کر لیا اور وہ مناظرے کرنے والے اپنے انجام کو پہنچ گئے لیکن ہمارا بھی یہی حال نہ ہو کہ ہم جس روس پر لعنتیں بھیجتے ہیں کل کو وہ ایمان لے آئے اور ہم اپنے سارے ناز و نخرے سمیت اللہ کی گرفت میں آئے ہوئے ہوں۔ اس سے پہلے آؤ، اللہ سے عہد کریں کہ خدایا! ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما اور ہمیں نورِ ایمان، صلاحیت اور استعدادِ کار عطا فرما کہ ہم تیرے پیغام کو نہ صرف خود قبول کریں بلکہ زمین پر پہنچانے اور پھیلانے کا سبب بن سکیں۔

اُبھرتے ڈُوبتے سُورج

۱۵ مئی ابُوظہبی

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علےٰ حبیبہٖ محمدٍ وآلہٖ واصحٰبہٖ اجمعین۔ امّا بعد
فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

کل صبح گھر سے نکلا تو طبیعت بہت بوجھل تھی۔ انسان بہرحال انسان ہے اللہ کی ایک عاجز مخلوق! ضروریات، احساسات اور احتیاجات میں جکڑا ہوا۔ اسی عالم آب و گل میں ایک طرف یہی ضرورتیں اُس کے راستے کی بہت بڑی دیوار ہیں اور دُوسری طرف ربِ جلیل اور اس کا حُسنِ بے مثال و لازوال، جس کی اطاعت اور اس کے احکام پر عمل کے ساتھ ان کی اشاعت، اس کا فریضہ ہے۔

دراصل یہ محض فریضہ ہی نہیں، انسان کی ابدی اور دائمی زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے، مگر انسان اپنی کوتاہ بینی اور کم نظری نیز فطری کمزوری کے سبب فوری اور دُنیاوی ضرورتوں کی تکمیل میں اُلجھ جاتا ہے اور اسے فراموش کر بیٹھتا ہے۔ ضرورت انسان کی اپنی ہے مگر اللہ کا کرم دیکھیں کہ اُس نے فریضہ قرار دے دیا اس کے باوجود کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو اس کو نبھانے کی سعی کرتے ہیں، اگر

محض انسانی ضرورت ہی کی سطح پر رکھا جاتا تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد شاید ہی کوئی انسان اس کی تکمیل میں کوشاں نظر آتا۔

انسان بھی عجیب شے ہے سوچتا ہے ذرا فراغت ہوگی تو کر لوں گا، بھئی! کس بات سے فراغت؟ اگر ضروریاتِ زندگی اور مسائلِ حیات سے فراغت مراد ہے تو کبھی نہ ہوگی کہ جب تک زندگی ہے اس کی ضروریات بھی رہیں گی لہٰذا زندگی کی اس ہماہمی سے ہی ان فرائض کے لئے وقت نکالنا ہوگا، اس کے ساتھ ربِّ جلیل کا وعدہ ہے کہ تمھاری ضرورتوں کو پورا کرنا یہ میرا کام ہے کہ میں تمھارا ربّ ہوں اور میری طلب میں، میری اطاعت کے لئے کوشاں رہنا یہ تمھاری زندگی کا مقصد ہے۔ بات کہنے میں تو آسان سی ہے مگر کرتے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ کام کسقدر مشکل ہے۔

رمضان المبارک سے تین روز پہلے گھر لوٹا تھا۔ جنوری میں حرمین الشریفین کی زیارت سے سرفراز ہوئے۔ تو وہاں سے کینیا (مشرقی افریقہ) چلا گیا۔ پھر نیروبی سے ابوظہبی، دبئی ہوتا ہوا کراچی اور اسلام آباد پہنچا، چند روز گھر قیام کیا اور گلگت چلا گیا وہاں سے پلٹا، تو ایک آدھ دن گھر ٹھہر کر گوجرانوالہ، لاہور اور وہاں سے جہاز پر بیٹھ کر کراچی جا اُترا۔ واپسی پر سکھر اور پنوں عاقل سے ہوتا ہوا فیصل آباد پہنچا، وہاں سے گوجرہ، جھنگ ہوتا ہوا گھر آیا تو پشاور چلا گیا اور یوں ۴ اپریل کی شام گھر پہنچا اور ۸ اپریل سے رمضان المبارک شروع ہو گیا، برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ! اس کی برکات میں سے ایک بہت بڑی نعمت احباب کا اجتماع ہے جو دارالعرفان کی زینت بنتا ہے۔ یکم رمضان سے ہی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ اکیڈمی کے اساتذہ اور نونہال تو ہوتے ہی ہیں یوں رونق بڑھنے لگتی ہے۔

حافظ غلام جیلانی صاحب نے تراویح میں قرآن سُنانا شروع کیا، ساتھ ہی اسرار التنزیل کی تیسری جلد تقریباً آدھی لکھنا باقی تھی وہ کام شروع کیا، احباب کی آمد،

ڈاک اور اس کے جوابات کے ساتھ صبح ۸ بجے سے ۲ بجے تک لکھنے کا معمول بنایا پھر بھی کبھی پچھلے پہر لکھنا پڑتا اور یوں رمضان المبارک کے دو عشروں میں ختم قرآن بھی مکمل ہوا اور تفسیر بھی مکمل ہو گئی۔ اب اعتکاف کے دن آپہنچے اور تقریباً چار سو ساٹھ (۴۶۰) احباب سنتِ اعتکاف کے لئے پہنچ گئے۔ نفل کے لئے آنے جانے والوں کو ملا کر آٹھ صد سے ایک ہزار کے لگ بھگ مہمان اللہ کے گھر کی رونق تھے۔ ذکر کے معمولات، بیان اور تعلیم و تعلّم کے اوقات شب و روز پر چھا گئے، سُبحان اللہ! کیا بہار تھی کہ رُواں رُواں اور لمحہ لمحہ ذاکر تھا، دُنیا اور غمِ دُنیا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ یوں عید کی خوشیوں پہ یہ رونق تمام ہوئی تو فصل کی کٹائی کا کام تھا۔ اکیڈمی میں کچھ اضافے کئے جا رہے ہیں ان کا جائزہ لینا تھا، کچھ کاروباری ضرورتیں بڑے دو بچوں کے ذمہ کیں فصل کسی حد تک سنبھال لی گئی کچھ کام باقی تھا، درمیان میں ایک دن امریکہ کا ویزا لینے میں بسر ہو گیا اور یوں خود کو کھینچ تان کر ۱۴ مئی صبح منارہ سے نکلا۔

عبدالقدیر کا پاؤں ٹخنے پر سے جل گیا تھا، اس کی وجہ سے اُسے بخار تھا، بہرحال تمام کاموں کے لئے ربِّ جلیل سے دُعا کی اور چل پڑا سیتھی گیا وہاں بچّی بیمار تھی، اور دُوسرے اہلِ خاندان سے ملاقات بھی مقصود تھی۔

گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ اہلیہ کو رات دِل کا دَورہ پڑا ہے اُٹھنے کے قابل نہیں، موٹر سے اُتر کر اندر گیا تو عجب حال تھا کمزور، نقاہت سے چُور، چہرہ زرد چارپائی پہ پڑی تھی، بچے پریشان پھر رہے تھے، تیس برس کی زندگی کا ساتھ، ہر مشکل و آسانی میں اکٹھے بسر ہوئی۔ بڑے بچے سے کہا، انھیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ۔ کہ میں بھی ایک بارگاہ کا غلام ہوں، اُنھیں کے حکم کی تعمیل میں پابرکاب ہوں، شاید میرے لئے کوئی چھٹی بھی نہیں اور نہ مانگنے کی جرأت ہے لہٰذا سب کو اللہ کریم کے ہی سپرد کرتا ہوں۔

یوں سات بج گئے جبکہ مجھے نو بجے اسلام آباد ہوائی اڈے پہ ہونا چاہیئے تھا۔

بڑے سے چھوٹا بچہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ بحمدللہ، ہم نو بجے پنڈی پہنچ گئے، بہت سے احباب ملاقات کے انتظار میں تھے صرف سلام دعا ہی کر سکے۔ ایئر پورٹ پر پہنچے اور بارہ ۱۲ بجے شیر جہاں میر اور میں کراچی اُتر رہے تھے۔ ڈاکٹر عظمت، کرنل قیوم اور کرنل مطلوب صاحب کو لاہور سے آنا تھا وہ چھ ۶ بجے پہنچے۔

کچھ دیر کراچی آرام کر لیا، احباب جمع ہو گئے ملاقات کر لی، عصر کے بعد ذکر کی سعادت نصیب ہو گئی اور پھر اگلے سفر کے لئے تیار۔ ایئر پورٹ پر پتہ چلا کہ عظمت کا دوبئی کا ویزہ نہیں لگا، انہیں کراچی رُکنا پڑے گا۔ لہٰذا باقی ہم چاروں وہاں سے ۸½ بجے شام اُڑے اور پاکستانی وقت کے مطابق ساڑھے دس بجے جبکہ دوبئی کے وقت کے مطابق ساڑھے نو بجے دوبئی پہنچے۔ مغرب کراچی ایئر پورٹ پر پڑھی تھی عشاء دوبئی مکان پر آ کر ادا کی۔

ہوائی اڈے پر بہت سے ساتھی منتظر تھے، الحمدللہ ملاقات نصیب ہوئی۔ رات دوبئی ٹھہرے۔ صُبح ناشتہ کے بعد وہاں سے کار کے ذریعہ روانہ ہو کر ابوظہبی آ گئے۔ پھر واپس دوبئی جائیں گے وہاں سے برطانیہ اور غالباً برطانیہ سے ڈنمارک اور ناروے وغیرہ ہو کر پھر لندن سے نیویارک اور کینیڈا جا کر واپس وطن روانہ ہوں گے انشاءاللہ العزیز۔

اب آج یہاں سے کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کیا ہے۔ کسی خاص سفرنامے کی ضرورت تو محسوس نہیں کرتا، لکھنے کا بڑا مقصد تو احباب کو اُن ممالک سے روشناس کرانا ہے، جہاں جہاں سے اثنائے سفر گزر ہو گا یا ٹھہریں گے۔ نیز ان باتوں کا دوسرے احباب تک پہنچانا بھی مقصود ہے جو اِن اجتماعات میں بیان ہوں گی کہ اسلام کی افادیت عالمگیر ہے اور تمام زمانوں کے لئے ہے۔

اللہ کریم سے توفیق کا طلبگار ہوں!

۱۶ مئی

دوبئی کا ہوائی اڈہ بہت خوبصورت ہے، بلند و بالا عمارت رات کو چکا چوند، اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے لوگ، باہر نکلو تو موٹروں کی قطاریں، کھلی اور روشن سڑکیں، لوگوں کے سکون کا پتہ دیتی ہیں نہ چوری کا ڈر نہ جھگڑے کا خوف۔ ہر کوئی اپنے کام سے مطلب رکھتا ہے۔ دراصل عرب کا خطہ آج بھی پوری دُنیا کا پُرامن ترین خطہ ہے۔

بہرحال سب سے پہلے عظمت کے بارے پُوچھا، پتہ چلا کہ اُوپر تک درخواست کر چکے ہیں مگر صاف انکار کر دیا گیا ہے وجہ؟ آخر چند روز کے وزٹ ویزے سے انکار کیوں؟ تو پتہ چلا کہ پیشہ کی جگہ "ایگریکلچرسٹ" لکھا تھا جس کا ترجمہ یہاں مزارعہ کرتے ہیں اور مراد وہ مزدور لیتے ہیں جو سڑکوں پہ لگے ہوئے پودوں کو کھاد پانی دیتے ہیں لہٰذا ایسے کم آمدنی کے فرد کو سیر کی کیا سُوجھی یقیناً نوکری یا مزدُوری کی تلاش میں ہو گا۔ یہاں ہمارے ملک کی طرح کی زراعت کا تو کوئی تصور نہیں لہٰذا انکار کر دیا۔ اور جو کہہ گزرتے ہیں اسے سمجھانے پہ اصرار کرتے ہیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بادشاہت کا اثر نیچے تک ہے۔ چلو، بھئی! اب انھیں فون کر دو کہ ۱۹ کو اُسی جہاز میں آ جائیں جو لندن جا رہا ہو گا اور ہم دوبئی سے اس میں سوار ہو جائیں گے۔

دن ابوظہبی کے مرکزِ ذکر میں بسر ہوا مغرب کے بعد بیان تھا جس میں سورۃ اعراف

کی آیات ۳۱ تا ۳۳ کا مفہوم بیان ہوا، جو اس طرح شروع ہوتی ہیں،

"اے اولادِ آدم! ہر نماز کے وقت مناسب اور اچھا لباس پہنو اور کھاؤ پیو، مگر ضائع نہ کرو کہ اللہ ضائع کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔"

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ تمام ممالک، جملہ اقوام اور سب زمانوں کے لئے ہے لہٰذا خطاب ہی اولادِ آدم کو فرمایا اور انداز ایسا کہ ہر نماز کے لئے لباس کم از کم معقول ضرور ہو، یعنی آدمیت کی ضرورت عبادت ہے اور لباس محض آرائش یا نمائش کے لئے نہیں، بلکہ انسان کی وہ زینت ہے جو اسے بارگاہِ الوہیت کی حاضری میں اختیار کرنی چاہئے اس سے اس بات کی اصلاح از خود ہو گئی کہ حیثیت سے بڑھ کر اور محض لوگوں پر اپنی برتری جتانے کے لئے لباس نہ بنایا جائے بلکہ اس سے بھی اللہ کی رضا مقصود ہو جب یہ بات ہے تو یقیناً مرد و عورت کا لباس شرعی تقاضے بھی پورے کرنے والا ہو گا نیز ہر آدمی کی اپنی حیثیت کے مطابق ہو گا کہ امیر بخل کر کے سستا لباس نہ پہنے اور غریب محض اظہارِ شوکت کے لئے ادھار نہ لیتا پھرے بلکہ سب کی نگاہ اس ذات کو راضی کرنے پہ لگی ہو جو سب کی مالک ہے۔

نیز فرمایا کھاؤ، پیو کہ سب نعمتیں تمہارے ہی لئے ہیں مگر اسراف نہ کرو یعنی کھانے پینے میں ان قواعد کی پابندی کرو جو مالک نے ارشاد فرمائے ہیں۔ تاکہ پتہ چلتا رہے کہ ان نعمتوں کے مالک تم نہیں ہو بلکہ وہ ہستی ہے جس کی ارشاد کردہ حدود کے تم پابند ہو اور تم بھی ایک مالک کے بندے ہو اور اسقدر اطاعت شعار کہ کھانے پینے میں بھی اس کے حکم سے باہر قدم نہیں رکھتے۔

دنیا بھر کے معاشی نظاموں میں یہ اسلام کی برتری ہے کہ خرچ پہ بھی اللہ کا حکم نافذ کرتا ہے جب ان حدود سے زیادہ خرچ ہی کرتا تو کمائی کے ناجائز ذرائع استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ یقیناً ایسا انسان اس قانون کے مطابق کمائے گا بھی جو اللہ نے دیا

ہے اور اگر خرچ میں بھی حد سے بڑھے گا تو اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں فرماتے۔ گویا وہ معیارِ انسانیت و آدمیت ہی سے گر جائے گا۔ پھر فرمایا،

"جو اشیاء انسان کی زینت کے لئے اللہ نے حلال کر دی ہیں دوسرے کسی کی طاقت نہیں کہ ان سے منع کر سکے اور پاکیزہ کھانوں سے بھی کوئی نہیں روک سکتا۔"

لہٰذا مختلف مذاہبِ باطلہ کا رد ہو گیا جن میں غیر فطری امور یعنی محض بھوکا ننگا رہنا، حصولِ کمال کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے جس سے جہلاء متاثر ہوتے ہیں اور یہ کمال بتاتے ہیں کہ فلاں بہت بڑا بزرگ ہے ساری عمر جوتا نہیں پہنا یا کپڑے پھٹے ہوئے پہنتا ہے یا کئی کئی روز بھوکا رہتا ہے۔ فرمایا،

"کمالِ انسانیت یہ ہے کہ بھرپور خوبصورت اور معتدل زندگی گذاری جائے جس میں ایک ترتیب ایک معیار اور ایک حسن جھلکتا ہو اور یہ سب کچھ ربِّ جلیل کو راضی کرنے کے لئے کیا جائے اور واقعی یہی معیارِ کمال بھی ہے کہ لباس اچھا ہو مگر تفاخر کے لئے نہ ہو، پیٹ بھرا ہو مگر حلال سے بازو میں قوت ہو مگر زیادتی نہ کرے۔"

فرمایا یہ نعمتیں دنیا میں بھی ایمانداروں کے لئے ہیں۔ کفار اور بے دین تو ان کے طفیل کھاتے ہیں ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ جب کوئی اللہ اللہ کہنے والا نہ رہے گا قیامت قائم ہو جائے گی یعنی یہ رنگا رنگ نعمتوں کی بہار مومنین کے دم سے ہے ورنہ کفار کو اس کی مہلت نہ دی جاتی اور یہ بھی دارِ دنیا میں۔ آخرت میں تو سب نعمتیں صرف مومنین کے لئے خاص کر دی جائیں گی حتیٰ کہ کافر کو ایک قطرہ پانی تک نصیب نہ ہو گا۔

لہٰذا حلال ذرائع سے رزق کمانا بھی عبادت ہے اور اپنی حیثیت کے مطابق اچھا

لباس، معقول کھانا پینا، اچھی گاڑی یا خوبصورت گھر، اظہارِ تشکر کے ذرائع ہیں۔ اور فرمایا، ہم تو ایسے ہی کھول کر بات ارشاد فرما دیتے ہیں اگر انسان اپنی سمجھ ہی ضائع نہ کر چکا ہو تو بات کوئی مشکل نہیں۔ نیز یہ باتیں کوئی مقام نہیں رکھتیں کہ کھایا پیا کچھ نہیں یا جوتا نہیں پہنا بلکہ آپ فرما دیجئے، اللہ نے فحش باتوں سے منع فرمایا ہے خواہ بظاہر کرو یا چھپ کر، ظاہری اعمال میں ہوں یا دلی کیفیات ہیں۔ بُرے کاموں اور بُری سوچ تک سے منع فرمایا ہے اور گناہ سے بھی۔ ایسے کام جن میں اللہ کی نافرمانی ہو چاہے مخلوق کو زد پڑے گناہ کہلاتے ہیں اور بغاوت و سرکشی سے روکا ہے۔ وہ امور جن میں انسانی حقوق بھی متاثر ہوتے ہیں نہ صرف گناہ بلکہ بغاوت و سرکشی ہیں جو ہر حال میں ناحق ہے اور اس بات سے منع فرمایا ہے کہ اپنی اُمیدیں اللہ کے سوا کسی اور سے نہ باندھو یعنی شرک نہ کرو،

" اور شرک کی اصل یہ ہے کہ انسان اپنی اُمیدوں کا مرکز ہی اللہ کے سوا کسی دُوسرے کو بنالے، اس سے بچنا کمال ہے اور محض رسُومات کو مذہب کے طور پر قبول نہ کرلو کہ یہ تو اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے اور بہت بڑی جہالت ہے "

یعنی صاف ستھری زندگی، جدوجہد سے بھرپور مگر شرعی حدُود کے اندر اور رواجات سے بالاتر، اللہ کے حکم کے مطابق بسر کرنا اسلام ہے، اللہ ہمیں اس کی توفیق دے، آمین۔ بیان تو ذرا مفصل تھا، بہرحال خلاصہ یہی تھا۔ عشاء کے بعد ذکر کی مجلس ہوئی کھانا کھایا اور ذرا پیدل چلنے کے لئے ساحل سمندر پر چلے گئے۔ ابوظہبی کا شہر سمندر کے کنارے بلکہ آدھا نیا شہر تو سمندر سے زمین چھین کر بنایا گیا ہے۔ عجمان اور راس الخیمہ سے بڑی بڑی کشتیوں پر بہت بڑے بڑے پتھر لاکر سمندر کو پاٹ دیا اور اوپر عمارتیں، بازار اور سڑکیں خوبصورتی کے ساتھ سجا دی گئی ہیں۔ ایک ایک پتھر یہاں پہنچتے پہنچتے پانچ پانچ صد درہم

کا پڑتا ہے، یعنی پچیس سو پاکستانی روپے کا۔ اور کنارِ سمندر کو بہت خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا ہے۔ روشنیوں کی چکاچوند میں رنگ برنگے پھُولوں کی بہار، فوارے اور پارک میلوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک سڑک کئی میل اندر تک سمندر میں لے جاتی ہے جس پر رات کو بہت رونق ہوتی ہے۔ روشن، کھُلی اور صاف دُو رویہ سڑک، جس کے دونو جانب گہرا سمندر جھاگ اُڑاتا رہتا ہے جس میں چھوٹی سے لے کر شارک تک مچھلیاں موجود اور تہہ میں قیمتی موتی اور پتھر ہیں جو یہاں کے مقامی بدو نکالتے رہتے ہیں، جو بغیر آکسیجن سلنڈر کے آدھ گھنٹہ تک زیرِ آب رہ سکتے ہیں۔

ہم گاڑی کھڑی کرکے تقریباً تین میل تک اس پر پیدل چلتے گئے۔ باتوں باتوں میں رمضان المبارک کا تذکرہ آیا تو پوچھ لیا کہ یہاں روزہ خور سے کیا سلوک کرتے ہیں؟ پتہ چلا کہ رمضان کا پورا مہینہ اگر کوئی بھی کھاتا پیتا نظر آئے تو اُسے گرفتار کرکے جیل بھیج دیا جاتا ہے جہاں سارا رمضان اُسے حکماً روزے رکھنا پڑتے ہیں۔ عید کے روز سر مُونڈ کر دس درہم کرایہ بھی دیتے ہیں چلو اب گھر جاؤ! ۔ اور اس میں مسلمان ہندو، سکھ سب کے ساتھ ایک ہی برتاؤ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا کوئی بھی احترامِ رمضان میں خلل ڈالنے کی جرأت نہیں کرتا۔ ویسے جب کوئی سکھ پکڑا جاتا ہوگا تو واقعی بڑا مزہ آتا ہوگا کہ بیچارہ روزے بھی رکھے اور سر بھی مُنڈوائے۔ یوں گپ شپ کرتے رات ساڑھے بارہ بجے واپس پہنچے اور آرام کیا علی الصبح ذکر۔ اور آج کا دن خواتین کا اجتماع تھا جو اب تمام ہو چکا ہے۔

اب انشاء اللہ مغرب کو بیان اور ذکر ہوگا۔

۱۷ مئی

کل مغرب کا اجتماع بھی بارونق تھا کہ صبح تو ابوظہبی سے روانگی تھی احباب بھی زیادہ سے زیادہ جمع تھے اور نئے لوگ بھی تھے پہلے بیان ہوا جو تقریباً صرف ایک سوال کا جواب تھا کہ "تصوف کیا ہے؟"

اس کی ضرورت یوں پیش آئی کہ چند احباب نے کچھ لوگوں کے اعتراضات کا حل چاہا جو اس نوعیت کے تھے کہ ذکر کیسے درست ہے اور کیسے نہیں کرنا چاہیے؟ تو میں نے مناسب خیال کیا کہ پہلے یہ تعین کر لیا جائے کہ تصوف کیا ہے؟ پھر اس کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ بھی آسانی سے کیا جا سکے گا اور اس کے طریقے اور سلیقے پر بھی بات ہو سکے گی۔

خطبہ مسنونہ کے بعد بات یہاں سے شروع ہوئی کہ ہر فن اور ہر کمال کے ماہرین ہوتے ہیں اور لوگ ان سے سیکھتے یا حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سب سے قیمتی فن تعمیرِ انسانیت ہے کہ کمالِ انسانیت کو حاصل کیا جائے یہ فن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ہے اور انہی کی ذواتِ مقدسہ اس فن کی ماہر اور امام ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ کمالِ انسانیت اللہ کی معرفت سے نصیب ہوتا ہے، یعنی جس کسی کو جس قدر معرفتِ باری ہوتی ہے اتنا ہی وہ کامل ہے

حتیٰ کہ کائناتِ بسیط میں نعمتِ عظمیٰ سب سے بڑھ کر آقائے نامدار ﷺ کو حاصل ہے تو آپ کو انسانِ کامل بھی کہا جاتا ہے جو حق ہے۔ دوسرے علوم و فنون اور ان کے ماہرین اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں ایک بنیادی فرق تو یہ ہے کہ تمام فنون کا تعلق انسانی عقل سے ہوتا ہے لہٰذا ماہرینِ فن کی بات انسانی دماغ تک پہنچا پاتے ہیں، ضروری نہیں کہ دل بھی ساتھ ہو۔ مثلاً کسی نے کوئی چیز بنانا سیکھ لی، بناتا بھی رہے گا مگر ضروری نہیں کہ دل سے پسند بھی کرتا ہو،

"مگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جو فن سکھاتے ہیں، اس کا تعلق ہی دل سے ہے اور جب دل ہی فدا ہو جاتا ہے یا ایک خاص کیفیت کو اپنا لیتا ہے تو دماغ لامحالہ اس کی اطاعت کرتا ہے لہٰذا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام صرف تھیوری پر ہی بحث نہیں فرماتے بلکہ دلی کیفیات عطا فرماتے ہیں اور یہ نبوت کے فرائض میں سے ہے۔"

فرمایا، یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْہِمْ وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ۔
یعنی دعوت الی اللہ پھر جو بھی قبول کرے اس کا تزکیہ، اس کے دل کی پاکیزگی اور اس کے بعد کتاب و حکمت کی تعلیم۔

یہ تزکیہ کیسے اور کتنی مدت میں فرماتے ہیں۔ یہ ایک لمحے کی بات ہے کہ جب ایمان نصیب ہوا اور پھر بارگاہِ نبوت کی حاضری کی سعادت نصیب ہو گئی تو وہ لمحہ جس میں اس کی نگاہ نبی کے وجودِ عالی پر یا آپ کی نگاہ اس پر پڑ گئی، وہی لمحہ اسے تزکیہ کے درجۂ کمال پر لے گیا، اتنی بلندی پر کہ وہ صحابیت سے سرفراز ہوا، جو نبوت کے بعد انسانیت کے کمالات میں آخری مقام ہے۔ اب جس خلوص سے وہ تعلیماتِ نبوت پر عمل کرتا ہے دوسرا کسی کے بس کی بات نہیں۔ جیسے ایک حدیثِ پاک کا مفہوم ہے کہ

میرے صحابی نے اگر مٹھی بھر جَو اللہ کی راہ میں خرچ کئے تو بعد میں آنے والا اُحد کے برابر
سونا بھی خرچ کرے اس کے ثواب کو نہیں پا سکتا۔ ظاہر ہے کہ صورتِ ظاہری میں تو بعد
میں آنے والے نے بہت ہی زیادہ خرچ کیا مگر دل کی وہ کیفیت اور وہ خلوص جو صحابی کو
حاصل تھا کہاں سے لائے گا اور اجر کی بنیاد تو وہی کیفیت ہے۔

یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پہ اعتراض
کر کے اپنی علمیت کا اظہار چاہتے ہیں درحقیقت مقامِ صحابیت کی عظمت کو نگاہ میں نہیں رکھتے
اور یہ نعمت جب تک نبوت باقی ہے تب تک باقی رہنی چاہیئے۔ لہٰذا نبی کے بعد صحابی
میں یہ شان موجود کہ اس کی صحبت پانے والا تابعی بنا اور پھر تابعی سے تبع تابعی بنا۔

یہ ہے تزکیہ اور اس کے بعد علم کتاب و حکمت اور علم کے بعد عمل، کہ جاننا تو عمل
کے لئے ہی شرط ہے ورنہ اس کا حاصل اور فائدہ کیا؟ اور،

"دین کے علم کی بنیاد تزکیہ پہ ہے اگر تزکیہ نصیب نہ ہو تو مشاہدہ یہ ہے کہ
دین کا علم بھی محض حصولِ دنیا کا ایک سبب ہی رہ جاتا ہے لہٰذا اسی
تزکیہ کا نام تصوف ہے، آپ اسے ترجمہ کہہ لیں یا متبادل لفظ، بہر حال
مقصد دل کی صفائی ہے، توجہ اور انواراتِ قلبی سے جو شیخ کے دل میں
ہوتے ہیں اور وہ طالب کے دل میں القا کرتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ بھی
روشن ہونے لگتا ہے۔ یہ فنِ تصوف کہلاتا ہے۔ چونکہ مل کر مجلس میں یہ
دولت لی اور دی جاتی ہے تو مجلس میں ذکر الٰہی کا، جو کہ اس کا باعث
بھی ہے اور اس کا حاصل بھی، اہتمام ہوتا ہے۔ ذکرِ اسم ذات کی تاکید
کتاب میں اور اس پر عمل سُنت میں موجود ہے۔ نیز اس کی پہچان بھی یہی
ہے کہ اگر دل کو روشنی اور برکاتِ صحبت نصیب ہوں تو علوم شریعت

کی نہ صرف سمجھ آنے لگتی ہے ان پر عمل کرنے کو جی چاہتا ہے اور گناہ
سے بے رغبتی اور پھر نفرت ہونے لگتی ہے، یعنی یہ ساری محنت شریعت
ہی کو سمجھنے اور خلوص کے ساتھ اس پر عمل کرنے کی سعادت حاصل کرنے
کے لئے کی جاتی ہے۔"

لہٰذا خود اس کام میں خلافِ شریعت عمل کیسے ہو سکتا ہے اور اگر کوئی واقعی
خلافِ شریعت کام کرتا ہے تو پھر وہ تصوف کا نام استعمال کر رہا ہے کام کوئی اور اختیار
کر رکھا ہے اس پس منظر پہ نگاہ رکھتے ہوئے انسان خود اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ کیا شئے ہے،
اور اس کی کس قدر ضرورت ہے؟

یہ بیان کا خلاصہ تھا، پھر آرام کیا۔ لاہور فون کیا تھا، بچے آئے ہوئے تھے، اُن
کا پتہ تو چلا، ملاقات نہ ہو سکی کہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے بہر حال گھر کی خیریت معلوم کی اور
صبح ذکر اور نماز کے بعد ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر دوبئی کو چل پڑے۔ میرا خیال تھا کہ
میں نے تو بارہا ابوظہبی کو دیکھا ہے بھلا نئی چیز کیا ہوگی، مگر یہاں تو ہر بار عجیب
تبدیلیاں نظر آتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بادشاہت عام آدمی کو اپنی خوشیوں میں
شریک رکھتی ہے سڑکیں، پل، راستے، پارک، بجلی، فون، ہسپتال اور کھانے پینے کی اشیاء
غرض ایک ایک چیز خوبصورت، خالص، آرام دہ اور آسانی سے دستیاب رکھنے کی پوری
پوری کوشش کی جاتی ہے آپ ایک واقعہ سے اندازہ کر لیں کہ مجھے ایک عزیز نے بتایا
چند سال پہلے انہوں نے حج کی تیاری کی چھٹی آخری دنوں میں ملی۔ جدہ ائیر پورٹ بند
ہونے میں صرف چوبیس گھنٹے باقی تھے کہ یہ لوگ احرام باندھ کر ائیر پورٹ پہنچے۔ سیٹیں
کنفرم تھیں، دن بھر کے انتظار کے بعد فلائٹ ملی تو اتنی آدمی سوار ہونے سے رہ گئے جہاز
چھوٹا تھا۔ اب مغرب ہو چکی تھی اور صبح بارہ بجے کے بعد جدہ ائیر پورٹ بند ہو جاتی تھی

لہٰذا بہت پریشان ہوئے، ٹریفک منیجر سے بات ہوتی رہی، آخر گھنٹہ ڈیڑھ کے بعد اس نے بتایا کہ جہاز نہیں مل سکتا۔ یہ لوگ بہت پریشان کہ احرام کیسے کھول دیں؟ چھٹی لی، روپے جمع کروا کے ٹکٹ لیے احرام باندھا، اب کیسے نہ جائیں؟

کوئی صورت بنتی نظر نہ آئی تو بس لے کر سب لوگ وزارتِ حج میں گئے کہ وزیر صاحب سے عرض کریں تو وہاں بھی عید کی چھٹیاں اور مزے کی بات یہ کہ وزیر موصوف شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ بہت پریشان ہوئے تو اُس بدو چوکیدار نے جو اکیلا وزارت کی عمارت کا نگران تھا، وجہ پوچھی اور سُن کر کہنے لگا آپ لوگوں کے جو ٹکٹ ہیں ان پر لکھا ہوا ہے کہ آپ کو لے جائیں گے؟

کہا، "ہاں!"

تو کہنے لگا، "پیسے دے کر خریدے ہیں یا ویسے ہی ملے ہیں؟"

کہا، "بھئی! رقم دی ہے۔"

کہنے لگا، "یہ تو پولیس کیس ہے، وزیر کا اِس میں کیا کام؟ پولیس میں جاؤ!"

سب بس لے کر پولیس کے ڈیوٹی افسر کے پاس گئے جو لانس ایس آئی قسم کا تھا کہ یہاں پولیس کے رینک بھی فوج کی طرح ہیں، لہٰذا لیفٹیننٹ ہوتا ہے، جسے یہ "ملازم" کہتے ہیں۔ اس نے ساری بات سُنی اور کہا، "میں اپنی جیپ پر جاتا ہوں تم لوگ گلف ایئر کا جو چیئرمین یا ذمہ دار ہے اس کے بنگلے پر آجاؤ!"

وہ ایک انگریز تھا جب یہ پہنچے تو وہ اس سے بات کر رہا تھا کہ ان لوگوں نے ٹکٹ خرید کر احرام باندھا، اب صبح بارہ بجے سے پہلے انھیں جدہ پہنچانا تمھاری ذمہ داری ہے اگر نہ کر سکو تو میری ذمہ داری ہے کہ فوج کو کہہ کر انھیں جہاز دلواؤں گا اور تمھیں مع بیوی بچوں کے جیل میں بند کردوں گا۔ اور عید کی چھٹیوں کے بعد معاملہ قاضی کے سامنے

جائے گا۔ اُس نے کہا، "انھیں ایئرپورٹ بھیجو!"

چنانچہ جب یہ لوگ ہوائی اڈے پر پہنچے تو کمپنی والے کپتان اور (غالباً) بحرین جانے والی فلائٹ خالی کرا چکے تھے جو انھیں لے کر جدہ گئی اور خالی واپس آکر بحرین کے مسافروں کو لے کر روانہ ہوئی۔

آپ اندازہ کریں کہ ریاست میں عام آدمی کا کتنا احترام ہے۔ یہی حال زندگی کی سب سہولتوں کا ہے حتیٰ کہ سڑکیں بھی پھولوں سے یوں لدی ہیں جیسے شاہی محل کی روشیں ہوں۔ بہرحال ہم دوبئی آگئے۔

دو رات قیام ہے اور پھر لندن، انشاء اللہ۔

۱۸، مئی

کل شام مجلسِ ذکر کے بعد شہر سے باہر ایک نئی آبادی میں جس کا نام "کچا صفا" ہے بیان تھا عشاء کی نماز وہاں جا کر ادا کی اور تقریباً پون گھنٹہ بیان ہوا۔ غالباً ساتویں پارہ کی آخری اور آٹھویں پارہ کی شروع کی آیات تھیں جن کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے کہ یہ لوگ بڑی زوردار قسمیں کھاتے ہیں اور اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی نازل ہو جائے جس سے ہماری تسلی ہو تو ایمان لے آئیں گے تو آپ فرما دیجئے کہ اللہ قادر ہے ایسا کر سکتا ہے مگر یہ بات بھی ہے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے اس لئے کہ اُن کے کردار اور باطنی فیصلے کے سبب اُن کی آنکھیں اور دل اللہ نے پھیر دیئے ہیں۔ اب اگر ان کے سامنے فرشتے بھی اُتر آئیں یا ان سے مُردے باتیں کریں یا کچھ بھی ہو جائے انھیں ایمان نصیب نہ ہو گا کہ جب تک اللہ نہ چاہے یہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس لئے نہیں چاہتے کہ انھوں نے اپنے دل سے خواہشات کی پیروی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ایسے لوگ تو انبیاء کے دشمن اور خود شیطان بن جاتے ہیں انسانوں میں سے بھی اور جنوں میں سے بھی اور پھر ایک دوسرے کو فضول باتوں میں لگائے رکھتے ہیں۔

یہ میں نے زبانی نقل کرنے کی کوشش کی ہے جو مفہوم اب تک ذہن میں تھا اور لفظ بلفظ ترجمہ نہیں۔ اس پر بات اس انداز میں ہوئی کہ انسان با اختیار ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ دیکھنے میں تو بے اختیار ہے' اپنی مرضی سے نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے نہ حُسن پہ اختیار ہے نہ رزق پہ، نہ صحت پہ' خود اپنے وجود کو بنانے یا قائم رکھنے پہ بس نہیں چلتا تو اختیار کیسا؟ اور یہی بات جاننے کی ہے کہ اس موضوع پر بڑی لمبی بحثیں کی گئی ہیں مگر ماحصل سب کا ایک ہی ہے کہ،

" انسان کو ایک کیفیت' ایک استطاعت عطا ہوتی ہے اور وہ ہے معرفتِ باری کو حاصل کرنے کی سکت اور شعور۔ اب ایک طرف دُنیا اُس کی لذاتِ نفس، اس کی خواہشات' ابلیس اور اس کے مشورے اور دوسری طرف جمالِ باری اور قربِ الٰہی ہے۔ ان دو راستوں میں فیصلہ انسان خود کرتا ہے اللہ کریم اس پر مسلط نہیں فرماتے کہ اُسے کس جانب بڑھنا ہے اگر اللہ کی راہ اختیار کرتا ہے تو دُنیا کی لذات اور نعمتوں سے محروم نہیں ہوتا، ہاں: حاصل اور استعمال ایسے طریقے سے کرتا ہے جس کی اجازت اللہ دیں اور اگر دوسری راہ اپناتا ہے تو دین سے محروم ہو کر دُنیا میں کھو جاتا ہے حتیٰ کہ نگاہ ٹیڑھی اور دل اُلٹ جاتا ہے یعنی ظاہری اور باطنی ادراک سے محروم ہو جاتا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ یہ بدنصیب آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی جو بجائے خود ایک بہت بڑا معجزہ ہے کہ بچپن، لڑکپن، جوانی غرضیکہ چالیس برس کی عمر ایسی بے مثال رکھتے ہیں جس کی نظیر لانا ممکن نہیں، کو نہ پہچان سکے۔ جس نے کسی انسان سے کچھ سیکھا نہ پڑھا مگر جب اعلانِ نبوت فرمایا تو علم کے تمام موضوعات پر ایسی جامع بات ارشاد فرمائی جس نے تمام سوال بھی حل کر دیئے اور وہ حق بھی تھی۔ نہ صرف دُنیا بلکہ مابعد الموت' ذات و

صفاتِ باری تعالےٰ کی پسند و ناپسند، ہر موضوع پر کسی نئی خبر اور بات کی ضرورت باقی نہ رہی۔ پھر آپ ﷺ کا معجزہ اللہ کا کلام ہے اور بے شمار جیسی معجزات، یہ سب انہیں نظر کیوں نہیں آتا؟ اس لئے کہ انھوں نے اپنے فیصلے سے نفس اور خواہشاتِ نفس کو پسند کر لیا لہٰذا دوسرا راستہ ہی کھو بیٹھے اور یہی اختیار اتنا بڑا اختیار ہے جو تعمیرِ بدن سے لیکر حیات، موت اور بعد الموت کو متاثر کرتا ہے حتیٰ کہ قیامت کے روز بھی اعمالنامے تھما کر ارشاد ہوگا اپنی کتاب پڑھ لو اور اپنا فیصلہ دیکھ لو، جس راہ کے حق میں تم نے فیصلہ کیا تھا آج اُسی پر چلاتے جاؤ گے تم خود ہی اپنے جج بھی ہو۔

اس نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان اسلام پر عمل کیوں نہیں کرتا، جب وہ اپنی پسند سے اِسلام قبول کرتا ہے تو عمل نہ کرنا کیسا؟ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ،

"غیر مُسلم جب تحقیق کر کے اور صداقت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے ہیں تو کتنے با عمل ثابت ہوتے ہیں ہم ایسا کیوں نہیں کر پاتے شاید ہم اپنے فیصلے سے نہیں بلکہ محض موروثی مسلمان ہیں۔"

باپ دادا مسلمان تھے لہٰذا ہم بھی مسلمان ہیں۔ خدانخواستہ اگر وہ نہ ہوتے تو شاید ہم بھی مختلف ہوتے۔ ہم نے کبھی فکر کرنے کا تکلف نہیں کیا کہ آخر ہم کیوں مسلمان ہیں؟ یہ موروثی سا قبولِ اسلام، ارکانِ اسلام کو بوجھ بنا دیتا ہے

اگر ہم دِل سے فکر کر کے اور سوچ سمجھ کر طے کر لیں کہ واقعی ہماری زندگی کی راہ اسلام ہے تو یقیناً اپنے ہر عمل میں اس کو اختیار کرنے اور اپنانے کی سعی بھی کریں گے اور یہی مقصود بھی ہے لہٰذا ایک دُوسرے سے اُلجھنے سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ مجھے کونسی راہ اپنانا ہے۔ اللہ تو اِتنے کریم ہیں کہ فرمایا، ہم چاہتے تو فوراً ان کی گردن

مروڑ دیتے یہ کچھ بھی نہ کر سکتے مگر موت تک مہلت دی ہے اور اتنا احسان فرمایا ہے کہ،

"جب بھی یہ طے کر لو کہ مجھے اللہ اور اس کے رسُول ﷺ کی اطاعت اختیار کرنا ہے نہ صرف گناہ بخش دوں گا بلکہ گناہوں کو نیکیوں میں بدل دوں گا۔"

لہٰذا ضروری بھی ہے اور یہی اسلام بھی ہے کہ ہم دِل کی گہرائیوں سے اور خود اپنے فیصلے سے راہِ حق کو قبول کریں سب توفیق اللہ ہی کے پاس ہے۔

واپسی پہ کھانا کھایا اور آرام کیا۔ صُبح خون دیا ہے تاکہ ٹیسٹ ہو جائے۔ یہاں کے ہسپتالوں میں دُنیا کی تمام سہُولتیں مہیا ہیں۔ رات مولانا ابو طاہر محمد اسحٰق صاحب تشریف لائے تھے وہ ورلڈ اسلامک مشن کے نمائندے ہیں جو سعُودی عرب کی طرف سے ہے کراچی اور پھر مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہیں اور بہت سی اعلےٰ پائے کی کُتب کے مصنف ہیں انھوں نے شفقت فرمائی اور چائے کا حکم دیا لہٰذا ان کے دولت خانے پر حاضری دی اور علماء حضرات بھی تھے زیارت نصیب ہوئی ارشادات سُننے اور چائے بھی پی۔

احباب شہر کی سیر کو نکل گئے جو بہت خوبصورت اور دُنیا کا واحد شہر اور ملک ہے جس کی پورٹ واقعی فری ہے۔ دُنیا کی ہر چیز یہاں ملتی ہے اور شاید ہر جگہ سے مناسب قیمت پر بھی۔

۱۹ مئی

دوبئی، شارجہ اور عجمان، یہ تین جڑواں شہر بھی ہیں اور تین ملک بھی اور تین حکومتیں بھی۔ سب خوبصورت اور صاف ستھرے شہر ہیں اور چلتے چلتے دوبئی ختم اور شارجہ شروع ہو جاتا ہے۔ ابوظہبی میں شہر کے باہر کی سڑکوں کو اوور ہیڈ گزارا گیا ہے جہاں سڑکوں کا کراس آیا، ایک دوسری کے اوپر نیچے سے گزر جاتی ہیں۔ اور میلوں تک یہ معلّق سڑکیں بہت مہنگی بھی پڑتی ہیں تو دوبئی والوں نے ٹنل بناتے ہیں یعنی ایک سڑک تو جا رہی ہے اب اسے کاٹنے والی سڑک ٹنل میں اُس کے نیچے سے گزر گئی۔ یہ ٹنل پھولدار چمکیلی ٹائلوں اور جگمگ کرتی روشنیوں سے بہت بھلے لگتے ہیں۔

عام آدمی اگر قانون شکنی نہ کرے تو اُسے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔ امن اور سکون ہے۔ خوبصورت مساجد اور بہترین بازار، اچھی موٹریں اور صاف سڑکیں، غذا، دوا ہر چیز خالص اور شہر کے گرداگرد بھی پارک سجے ہیں۔

اب اگرچہ کسی حد تک تہذیبِ جدید بھی اپنے پاؤں پھیلا رہی ہے مگر پھر بھی یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ یہ لوگ ہماری طرح اس کی لپیٹ میں نہیں آئیں گے۔ انشاءاللہ، کہ عام بدوی ابھی تک ان چیزوں سے بہت دُور بھاگتا ہے بلکہ یہاں یہ بھی دیکھا ہے

کہ وہ حکومت کی دی گئی سہولتوں سے بھی اکثر بے نیاز رہتے ہیں۔ ابوظہبی کے امیر نے کئی چھوٹے چھوٹے شہر بسا دیئے ہیں۔ خوبصورت گھر، صاف ستھری پختہ گلیاں، بجلی، پانی ہر شے موجود۔ حتّٰی کہ بجلی، پانی اور صفائی کا عملہ رات دِن نگرانی کرتا ہے ساری ساری رات روشنیاں جگمگاتی ہیں مگر ان میں کوئی انسان نہیں بستا۔ اگرچہ مقامی لوگوں کو مُفت الاٹ ہوتے ہیں اور ہمیشہ کے لِئے ان کی ملکیّت میں دے دیئے جاتے ہیں مگر وہ لینا نہیں چاہتے اور صحرا میں اپنے خیموں میں خوش رہتے ہیں۔

یہاں بجلی، پانی کا انتظام ایسا ہے کہ رات مَیں نے ایک دوست سے پُوچھا کہ کبھی بجلی بھی بند ہوتی ہے تو انھوں نے کہا میں ساڑھے سات برس سے یہاں ہوں ان سالوں میں ایک سیکنڈ کے لِئے بھی بند نہیں ہوئی۔ نہ پانی کا سسٹم کبھی متاثر ہوتا ہے۔

۱۹ مئی PIA کی پرواز نمبر PK-709۔ لکھ رہا تھا کہ دوبئی سے روانگی کا وقت ہو گیا چنانچہ جہاز میں بیٹھ گئے۔

اب اسے دوبئی سے پرواز کِئے ہوئے تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اور اِس وقت غالباً یورپی ممالک پر محوِ پرواز ہے مزید اڑھائی گھنٹے لگا کر لندن پہنچے گا۔ میرا یہ وقت سونے کی اداکاری کرنے، ایک نہایت بے ذوق فلم دیکھنے، چاء پینے اور عظمت سے باتوں میں گزرا جو آج کراچی سے اِسی پرواز میں آ رہا تھا۔

اب سوچا کل شام کا بیان ہی لکھ دوں۔

سبحان اللہ! باہر نگاہ گئی تو نیچے برف سے ڈھکی چوٹیاں اپنی بہار دکھا رہی ہیں، غالباً رُوما کے سرحدی پہاڑ ہیں جنہیں ہنّی بال نے برف کے طوفانوں میں عبور کر لیا تھا اور اب آگے نسبتاً کم اونچے پہاڑ، شاداب علاقہ، سڑکیں، دریا، نہریں اور شہر نظر نواز ہیں

ان میں ہر شے اللہ کی عظمت پہ گواہ ہے، یہ بادلوں کے آوارہ ٹکڑے، اُسی کے حکم پر اپنے ہدف کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور جہاز ایک شہر کی مانند مخلوق کو اپنے اندر سمیٹے ہوا کے دوش پر محوِ سفر ما یمسکہن الا الرحمٰن۔ صدق اللہ العظیم۔ لو، اور تماشا دیکھو! یہ عجیب بادل آ گئے ہیں، نیچے سے اُوپر کو دور تک اُٹھتے آ رہے ہیں جیسے بے شمار نمونوں کے مینار ترتیب دے دیئے گئے ہوں۔

بہرحال، آپ چلئے! دوبئی سے ہی بات شروع کرتے ہیں۔ دوبئی کی آج کی اہم خبر یہ ہے پاکستانی کرنسی کوئی نہیں لے رہا۔ تبدیل کرنا ممکن نہیں رہا۔ پچھلے کئی سالوں سے درہم کی قیمت ۴٫۷۵ اور ۴٫۸۰ کے درمیان تھی۔ اب جو گرنا شروع ہوئی تو پانچ، ساڑھے پانچ، پرسوں ۵٫۶۰ تھی، کل ۵٫۷۵ پہ چلی گئی لہٰذا روپے تبدیل کرنے والوں نے اس کی خریداری روک دی ہے۔ بہرحال اللہ مالک ہے قوموں پہ ایسے امراض حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ ہمیں توفیق و ہمت دے کہ اپنا تعلق ربِ جلیل سے استوار کر لیں اور تمام مشکلات سے نکل جائیں۔

کل دن بھر مصروف ہی رہا اور ملنے ملانے والوں نے آرام کی فرصت بھی نہ دی شام مرکز میں ذکر ہوا۔ اور کل کا بیان "پاکستان ثقافتی مرکز" دوبئی میں ہوا۔ اس قسم کا جو ثقافتی مرکز ابوظبی میں تھا وہ تو بہت ہی شاندار تھا غالباً اس کے بارے پہلے لکھ بھی چکا ہوں۔ یہاں ویسا شاندار تو نہیں مگر پھر بھی بہت اچھا ہے کم از کم مل بیٹھنے اور بات کرنے کی جگہ تو ہے۔ ہم نو بجے رات عشاء پڑھ کر پہنچے تقریباً ساڑھے نو بجے بیان ہوا۔

مختصر سا بیان تھا، چونکہ رمضان المبارک کے فوراً بعد کی مجلس تھی تو چاہا کہ جو تجربہ المرشد میں لکھا ہے "کیا کھویا؟ کیا پایا؟" اُسی کا خلاصہ عرض کر دوں کہ المرشد کے قاری تو پڑھ ہی لیں گے مگر جو دوسرے حضرات ہیں ان تک بھی آواز پہنچ جائے۔

میرے خیال میں آپ تو مجھے پڑھتے ہی رہتے ہیں جبھی تو یہ حروفِ پریشاں آپ کی نظر کے سامنے ہیں تو پھر دوبارہ لکھنے کی ضرورت ہی کیا؟

اچھا، لکھوں! مگر کیوں؟۔ اچھا، آپ کا خیال مبارک ہے کہ اس تسلسل میں پڑھنے کا اپنا لطف ہو گا تو ٹھیک ہے پڑھئے! لکھ دیتا ہوں۔

بیان، خطبہ مسنونہ کے بعد آیہ کریمہ، یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ سے شروع ہوا کہ موجودہ علمی اور سائنس کی ترقی کے دور میں یہی بات سامنے آئی ہے کہ،

"زمین اگرچہ ایک چھوٹا سا سیارہ ہے اور فضائے بسیط میں کئی سیارے اس سے کروڑوں گنا بڑے موجود ہیں مگر سب کی توجہ کا مرکز یہی ہے اور ایک طرح سے یہ سب سے خدمت لے رہی ہے سورج ہو یا چاند ستارے ہوں یا سیارے۔"

اور یہ خود کیا ہے؟ اللہ کی قدرت کا ایک عجیب مظہر، کہ بے شمار قسم کی تخلیقات کو اپنے سینے پہ سجا رکھا ہے اور ہر آن ایک سین بدل رہا ہے لاتعداد نظارے اس کی گود سے ظہور پذیر ہو رہے ہیں اور بے شمار اس کے اندر فنا کا جام پیتے ہیں۔ خود اس کا تجزیہ کیا جائے تو ٹوٹتے ٹوٹتے آخر ذرے کی وہ باریک ترین حیثیت سامنے آتی ہے، جسے دو نہیں بنایا سکتا وہ ایٹم کہلاتی ہے یہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ ہزاروں ایٹم قلم کی نب کی نوک پر جمع ہو سکتے ہیں۔ خود اس ایٹم کے اندر ایک جہانِ شمسی قائم ہے اور مثبت و منفی قوت اپنا کام کر رہی ہے۔ زمین انہی ایٹموں کا مجموعہ ہے ایک بہت بڑا ذخیرہ۔ آپ نے ایٹم کا پھٹنا اور اس کا تجزیہ تو پڑھا ہے ہیروشیما پہ دیکھا بھی گیا تھا،

"جب یہ سارے ایٹم پھٹنے لگیں گے تو یقیناً پہاڑ روئی کے گالوں کی

طرح اُڑ جائیں گے اور سمندر بھاپ بن جائیں گے، شاید یہی قیامِ قیامت
کی گھڑی ہو گی جب صورِ اسرافیل کی آواز ان ایٹموں کا فیوز بن جائے گی"۔

تو گویا یہ خطرناک ترین بارُود کا ڈھیر ہے مگر کمالِ قدرت کا ملاحظہ ہو کہ انہی ایٹموں
کو جوڑ کر جمادات کی صُورت عطا کر دی کہیں پتھر کہیں ریت کہیں، پہاڑ اور وادیاں پھر ایسا
قادر کہ پتھروں کے اندر ایک خاص ترتیب سے جوڑ کر ہیرے بن گئے۔ سونا چاندی وجُود میں
آئے اور خوش رنگ و بیش قیمت جواہر بنے۔ یہ جُملہ اشیاء جمادات کہلاتی ہیں۔ ان سے
اعلےٰ مخلوق نباتات ہے جو انہی ایٹموں کے ذرا دُوسرے انداز میں جمع ہونے کا نام ہے
درخت ان کے تنے، پھُول اور پتے، پھل، سبزیاں، پودے، یہ مخملیں گھاس کے قطعے، یہ
سب انہی ایٹموں کے مختلف نسبتوں اور مختلف طریقوں سے جُڑنے کا نام ہے۔ یہ تخلیق
پہلی سے اسقدر افضل ہے کہ نباتات جمادات سے خدمت لیتے ہیں۔ اور مختلف صُورتوں
میں انھیں اپنی غذا۔ بناتے ہیں۔

ان سے اُوپر حیوانات کا درجہ ہے جن میں چلنا پھرنا، توالد و تناسل، بھوک، پیاس
گھر اور ٹھکانے کی خواہش کے ساتھ محبت و نفرت کے جذبات بھی ہیں یہ اپنے سے نیچے
والوں سے خدمت لیتے ہیں اور ان کے اُوپر انسان، یعنی اولادِ آدم علیہ السلام کا مقام ہے
یہ وہ مخلوق ہے جو سب سے خدمت لیتی ہے۔ حتیٰ کہ حیوانات کو کاٹ کر کھاتی ہے اُن کی
کھال کھینچ کر جُوتا بناتی ہے کسی پہ سواری کرتی ہے تو کسی سے چوکیداری کا کام لیتی ہے حتیٰ کہ
جانور اگر آدمی کے کام نہ آئے اور مر جائے تو کہا جاتا ہے ضائع ہو گیا مگر انسان ذبح کر کے
کھائے تو گویا اُس نے اپنی حیات کا مقصد پا لیا۔ تو نیچے کی ساری مخلوق کا مقصدِ تخلیق ہی
درجہ بدرجہ اور مختلف صُورتوں میں انسان کی خدمت ٹھہرا،

"مغربی مفکرین نے تو انسان کو بھی حیوانوں میں ہی شامل کیا ہے اور اسے

حیوانِ ناطق یعنی ایسا جانور، جو بات کر سکتا ہے کہہ کر یہ بتانے کی کوشش
کی ہے کہ صرف زبان کے فرق سے اسے ساری بلندی حاصل ہے، مگر
فخرِ دو عالم، نبیِ رحمت ﷺ نے بتایا کہ صرف یہ فرق نہیں ہے
بلکہ اصل فرق یہ ہے کہ اس میں رُوح ہے جو ایک لطیفۂ ربّانی ہے اور براہِ راست
عالمِ امر سے ہے، عالمِ امر، جو تخلیق کی حد سے اُوپر اور صفاتِ باری کی
تجلیات کا عالم ہے چنانچہ اس کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ یہ اپنی روح
کو نورِ ایمان سے زندہ کرے، عبادات سے روشن کرے اور یوں اللہ کی
معرفت کو حاصل کرنے کے عظیم ترین مرتبے پر فائز ہو، اگر یہ ایسا نہ کر سکا تو
نہ صرف اپنی تخلیق کا مقصد کھو بیٹھا بلکہ اپنے سے نیچے کی ساری مخلوق سے
خدمت لیتا رہا اور اپنا کام نہ کر کے جُرمِ عظیم میں گرفتار ہو گا اور اللہ کے
غضب کا شکار ہو گا"۔

یہ کام انسان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا مگر ایک بات راستے کی دیوار بن گئی کہ اس
کے وجود میں خواہشات پیدا ہوئیں تو یہ ان کی تکمیل کے لئے لپکا۔ مگر ارشاد ہوا، ذرا ٹھہر!
تمام ضرورتیں پوری کرو، مگر اس طریقے سے جس طریقے سے میں اجازت دوں کہ تمہیں میری
شان کا اندازہ بھی ہو اور یہ پتہ بھی رہے کہ یہ سب کچھ بھی میرا ہے اور تم بھی میرے بندے ہو۔
اگرچہ انسانی نفس کسمسایا مگر یہ بھی چنداں دشوار نہ تھا کہ ابلیسِ لعین ظاہر ہوا اور انسان کی
دشمنی پہ کمر بستہ ہو گیا۔

آپ کو علم ہے اس نے فرصتِ حیات طلب کی اور دعوٰے کیا کہ انسان کی خواہشات
کو ایسی ہوا دوں گا کہ اپنے مالک کو بھُول کر میرے پیچھے بھاگے گا۔ اللہ کریم نے فرمایا،
او نامراد! تو جا کر زور لگا لے، مگر یاد رکھ! جو میرے بندے ہوں گے، اُن پر تیرا بس نہیں

چلے گا جو تیرے ساتھ لگ جائیں گے وہ تیرے ساتھ جہنّم میں پھینکے جائیں گے۔

اب یہ اللہ کے بندے کیسے ہوں گے؟

اس کے لئے ربِّ جلیل نے عبادات تسبیحات رکوع و سجود کی دولت بخشی جس پر تجلّیات برستی ہیں اور روح انسانی ان سے سیراب اور منوّر ہوتی چلی جاتی ہے یوں اس کی اندرونی حسّیں بیدار ہوکر جمالِ باری سے سیراب ہوتی ہیں تو ایک زندگی کیا لاکھوں زندگیوں کی خواہشات بھی بلکہ خود زندگی بھی اس پہ نچھاور کر دیتا ہے۔

انہی عبادات میں ایک عظیم تحفہ رمضان ہے، سال کے بارہ مہینوں میں یہ ایک مہینہ، جو اس لئے فرض کیا گیا کہ تم تقویٰ حاصل کر سکو، یعنی اللہ سے وہ محبت جو تمہیں اُس کے در سے اُٹھنے نہ دے اور جو شیطان سے نفرت سکھا دے وہ جذبہ جو اللہ کی طلب پیدا کر دے اور جو ساری کوششوں کو اس کے قرب کے حصول پر لگا دے۔ اس میں شیاطین کو قید کر دیا کہ تمہارا کام بند، اس میں اپنا ذاتی کلام نازل فرمایا اور کلام میں متکلم کی صفات کا اثر ہوتا ہے لہٰذا کلام باری نے جان کو نورِ صفاتی سے بھر دیا، اس کے روزے کی برکت کہ گذشتہ سب گناہ معاف کرنے کے لئے کافی، اس کے قیام کی سعادت کہ گناہوں کی معافی کا پروانہ، اس میں نفل کا ثواب فرض کے برابر اور فرض کا ستّر گُنا زیادہ، اس کا پہلا عشرہ رحمت دُوسرا مغفرت اور تیسرا دوزخ سے رہائی کا ٹھہرا۔

غرض، اسقدر برکات سمو دیں کہ شمار و بیان سے باہر۔ صرف ایک رات لیلۃ القدر کو ہزار مہینوں کی عبادت سے بڑھا دیا ملائکہ کو اور پاک ارواح کو نازل ہوکر قلوب پہ سکینت طاری کرنے کی اجازت دی اور یوں رمضان کے کورس سے نکل کر انسان اس کُندن کی طرح ہوگیا جو بھٹی سے نکلا ہو پھر مقابلہ شروع ہُوا شیطان مار کھاتا رہا اور انسان کمزور ہونے لگا کہ پھر رمضان آگیا تو یہ ہے اس کی ایک حیثیت اگر ہم نے واقعی یہ نور، یہ قوت، یہ روشنی

اور یہ عظمت حاصل کر لی ہے تو الحمدللہ، بہت کچھ پا یا، اگر ایسا نہیں تو پھر رمضان کھو دیا، اس کا بھی علاج ہے کہ اللہ سے معافی طلب کریں اور آئندہ کے رمضان میں بھرپور فائدہ اُٹھانے کی خالص نیّت! اللہ ہمت دے اور مہلت تو فائدہ اٹھائیں۔ اگر پہلے سفرِ حیات تمام ہو تو بھی اس کی رحمت نیّت پر ہی ثواب عطا کر دے۔

یہ تھا، بیان کا خلاصہ، اور اب شاید لندن قریب ہے کہ جہاز نیچا ہو رہا ہے اور مسافر سامان سنبھال رہے ہیں۔ لہٰذا، اللہ حافظ۔

۲۰ مئی

جی ! تو آپ ابھی منتظر ہیں کہ پھر کیا ہوا تو حضور ہُوا یہ کہ میں تو لکھتا رہا اور جہاز میاں لندن پہنچ چکے تھے لکھنا چھوڑ، غسلخانے کی طرف لپکا کہ گذشتہ تین گھنٹے سے سیٹ سے اُٹھا نہ تھا حالانکہ درمیان میں جہاز پر چائے بھی پی۔

جنگِ عظیم دوم میں مندرہ جنکشن کی چائے مشہور تھی، بسیں اُس زمانے میں بہت کم تھیں سفر کا بڑا ذریعہ ریلوے ہی تھا اور راولپنڈی سے ۲۰ میل پر مندرہ چکوال جنکشن تھا ہمارے علاقہ کا تقریباً سو فیصد پیشہ فوجی ملازمت کا تھا۔ لہٰذا مندرہ جنکشن بہت مشہور تھا اور وہاں بہت بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ اس بھیڑ میں پلیٹ فارم پہ چائے ملا کرتی تھی۔ جس کا مٹیالا رنگ اور اُٹھتی ہوئی بھاپ اُس کے چائے ہونے کی شہادت دیتی۔ لوگ لپکتے، پیتے، ہونٹ بھی جلتے اور چند منٹوں بعد بڑے زوروں کا پیشاب بھی آتا مگر ذائقہ کوئی نہ جان سکا اور نہ کسی کو سمجھ آسکا۔ پھر یہ مزہ مُدتوں بعد P.I.A میں ملا تو سینکڑوں پُرانی یادیں تازہ کر گیا۔

کرنل مطلوب ساتھ بیٹھے تھے میں نے کہا،

"مندرہ جنکشن اور جنگِ عظیم دوم کا زمانہ یاد آگیا ہے۔"

وہ اگرچہ خود چائے بالکل نہیں پیتے مگر فتویٰ دے دیا، "نہیں ! آپ کو اتفاقاً پہلے

چائے مل گئی۔ لہٰذا یہ اُوپر اُوپر ہے نیچے سے مزیدار ہو گی۔"

چلو بھئی ! اس خیال سے مان لیا کہ جو نہیں پیتے، وہ بھی آشنا ضرور ہوتے ہیں کبھی پی کر ہی چھوڑی ہو گی۔ لہٰذا پھر منگوائی جو کیتلی کے نیچے کی تھی۔ واقعی وہ کچھ اور شے تھی کہ ٹھنڈی ٹھنڈی تھی اور کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔

اس سیلاب بلا سے گزر کر تین گھنٹے غسلخانے نہ جانا، پھر میرے جیسے بیمار اور شوگر کے مارے ہوئے بُڈھے جوان کا۔ یہ صرف آپ حضرات کی محبت کا کرشمہ تھا۔ اور اب جو قلم رکھا تو بمشکل بھاگ کر پہنچا جب اندر سے کنڈی لگائی تو ایک نغمہ سا گونجا،

"پیٹیاں باندھ لیں ! سیٹیں سیدھی اور میزیں بند ہوں سگریٹ بجھا دیں کہ ہم ہیتھرو کے ہوائی اڈے پہ اُتر رہے ہیں۔"

غسلخانے میں کیا پیٹی اور کونسی سیٹ، مگر بہت جلدی جلدی فارغ ہونے کا تجربہ ضرور ہوا۔ بھاگ کر ہی سیٹ پر پہنچا یا لُڑھک کر ہی کہہ لیں کہ اُترتے وقت بھی جہاز کا اگلا حصہ بلند اور پچھلا نیچا ہوتا ہے اور غسلخانے سے سیٹ پیچھے کو تھی۔

ہاں ! ایک بات قابلِ ستائش ہے کہ PIA میں نہ وہ فحاشی تھی اور نہ عریانیت جس کا تجربہ برٹش ایرویز میں ہوا تھا۔ کھانے کی بھی اگرچہ تہمت ہی لگائی مگر یہ اللہ کا شکر ہے کہ خنزیر اور شراب تو نہیں بٹی اور فلم بھی اُن کمپنیوں میں بالکل ننگی ہوتی ہے یہاں نہ صرف لوگوں کے لباس درست تھے بلکہ کہانی کا سر پیر بھی کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ اور یہ خوبیاں ہمیں اس بات پہ آمادہ کر گئیں کہ ممکن حد تک سفر PIA میں کیا جائے۔

بہر حال لندن پہنچ چکے تھے اس ہوائی اڈے پر جہاز کے ساتھ ٹنل تو لگ جاتا ہے مگر امیگریشن تک پہنچنے کے لئے دو سے تین میل تک پیدل چل کر ٹانگیں ضرور سیدھی ہو جاتی ہیں۔ بہت بڑا ہوائی اڈا ہے اور میلوں میں جہاز کھڑے ہیں آنے جانے والے

بھی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے ہوتے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے وہاں زیادہ دیر نہ لگی باہر آئے سامان سمیٹا اور کسٹم والوں کے سامنے سے گزر گئے پتہ نہیں، یہ کیسے جان لیتے ہیں کہ ان کو پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ نہ انھوں نے سامان دیکھا نہ ہم نے دکھایا اور باہر چلے آئے حالانکہ ایک نوجوان لڑکی کو پرچہ دے کر واپس کر دیا تھا۔ وہ انگریزی جانتی نہ تھی مجھ سے پوچھا، یہ مجھے واپس کیوں کر رہے ہیں؟ پرچہ دیکھا تو وہ ڈاکٹری معائنے کے لیے تھا کہ کہیں پیٹ کے اندر نہ کچھ چھپایا ہو۔

بہر حال، باہر آئے حسب معمول لوگوں کی بھیڑ تھی کچھ کپڑوں میں، کچھ نیم برہنہ، کہ یہاں موسم ٹھنڈا ہوتا ہے ورنہ ذرا دھوپ لگے تو لباس کو تو یہ سانپ کی کینچلی سمجھ کر کھینچ مارتے ہیں۔ احباب موٹریں لیے منتظر تھے۔ ہم روانہ ہوئے راستے میں چائے پی اور عصر ادا کی۔ اللہ کریم سے دعا کی کہ اس زمین پر پہنچایا ہے تو اپنی بات کہنے کی توفیق بھی ارزاں فرما اور اسے اپنے بندوں کی اصلاح کا سبب بھی بنا۔

سڑکوں کا جال بچھا ہے اور ہمارے ہاں کی رن وے کی طرح ہیں صاف خوبصورت جگہ جگہ رہنمائی کے لیے بورڈ لگے ہیں، رنگا رنگ موٹریں فراٹے بھرتی ہیں اور بھیڑ بہت ہوتی ہے یہاں امریکہ کی طرح رفتار پر پابندی نہیں، چائے پی کہ جگہ جگہ سروسز کا علاقہ ہوتا ہے، جہاں گاڑی روک کر اس کا پیٹ بھی بھرا جا سکتا ہے اور اپنا بھی۔ غرض سب سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔ احباب سموسے اور مزیدار چٹنی تو گھر سے لائے تھے چائے وہاں سے لی اور یوں کچھ کھایا پیا، رنگا رنگ لوگوں کو دیکھا اور شاید لوگوں نے ہمیں بہت دیکھا۔ ایک نیم برہنہ جوان لڑکی اپنے دوست کے ساتھ بیٹھی یوں منہ بھر کے کھا رہی تھی کہ دونوں گالیں ابھری ہوئی تھیں اور تیزی کے ساتھ جگالی کرتی جاتی تھی، ہاتھ مزید ٹھونسے جا رہے تھے اور آنکھیں ہم پر جمی ہوئی تھیں کہ یہ کونسی مخلوق ہے۔ مجھے اپنی بھینس یاد آئی

جس کا بچہ مر چکا ہے اور دودھ لینے کے لیے ڈنڈا کھلانا پڑتا ہے۔ تو وہ اسی طرح منہ کے دونوں اطراف کو بھر کر کھاتی ہے بالٹی پہ ٹوٹ پڑتی ہے۔

بہر حال یہ سفر رات بارہ بجے تمام ہوا۔ جب ہم دارالعرفان بریڈ فورڈ میں کھانے پہ بیٹھے تھے، دوبئی سے روانہ ہو کر اٹھارہ گھنٹے کا مسلسل سفر اور عظمت کا کراچی سے بیس گھنٹے کا ہو چکا تھا۔ دو گھنٹے کے لیے سو گئے، اب فجر ادا کی اور سوچا آپ سے باتیں ہو جائیں باقی ان شاء اللہ پھر سہی۔

برطانیہ، بذات خود تو ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ مگر اس قوم نے روئے زمین پر اپنی حکومت کے جھنڈے گاڑے۔ اگرچہ یہ سب کچھ ہیرا پھیری، دھوکہ اور فریب کے ذریعہ سے کیا گیا۔ مگر یہ بات قطعی ہے کہ اس کے نتیجے میں دنیا بھر کی دولت یہاں جمع ہوئی، ہندوستان کشمیر اور مغل سلطانوں کے خزانے مشرقِ وسطےٰ کا تیل اور افریقہ کی سونے کی کانیں امریکہ کے تمام وسائل سب کچھ ہی تو ان کے قبضے میں آ گیا۔ اور انھوں نے ہر جگہ سے جو ملا خوب لوٹا اور اپنے ملک کو بنایا۔ اب یہاں شہر اور گاؤں میں بڑا اور چھوٹا ہونے کا فرق تو ہے مگر سہولتوں میں کوئی فرق نہیں۔ سڑک، بجلی، ہسپتال، ٹیلیفون، سکول وغیرہ یا مکانوں کی بناوٹ تک یا پانی گیس وغیرہ میں کوئی فرق نہیں۔ رات کو چپہ چپہ روشن ہر طرف بجلی کا اور بجلی کی روشنی کا سیلاب آیا ہوا ہوتا ہے مگر اب جوں جوں برطانیہ سمٹنے لگا اور آخر کار اپنے گھر پر تو ان سب باتوں کے باوجود اب مشکل میں ہے اور عام آدمی کے لیے زندگی گزارنا ایک مسئلہ بنتا جا رہا ہے، آمدن کے اعتبار سے گرانی بہت زیادہ ہے مثلاً زیادہ سے زیادہ تنخواہ ۲۰۰/- پونڈ فی ہفتہ ہے جو پاکستانی کرنسی کے اعتبار سے تقریباً ۷۰۰۰/- روپے ہوتے ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں چیزیں بھی پونڈوں میں ملتی ہیں مثلاً پٹرول پونے دو پونڈ کا گیلن ہے تو گویا ۵۰/- روپے کا گیلن ہو گیا۔ اسی طرح کپڑا جوتے، کھانا پینا سب کچھ

پاؤنڈوں میں خریدنا پڑے تو گذارہ مشکل ہو جاتا ہے اس پر مزید لعنت جنسی آزادی کی ہے جس میں پھر بڑی طاقت پونڈ ہی ہے۔ اور یوں،

"اب یہ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ رہا ہے قلبی ویرانی کا شکار تو یہ پہلے سے تھے اب ذہنی اور مالی اُجاڑ کا سامنا ہے، اگر اللہ مسلمانوں کو توفیق دے اور یہاں خلوص کے ساتھ دین کی خدمت و اشاعت کے لیے محنت کی جائے تو خود اس قوم کا بھلا بھی اسی میں ہے کہ اپنے خالقِ حقیقی کے دامن لطف میں پناہ لے۔ اور مسلمانوں کی نجاتِ اُخروی کے ساتھ دنیوی بھلائی کا مدار بھی اسی امر پر ہے، اللہ کریم توفیق عطا کرنے والے ہیں۔"

ہمارا آج کا پروگرام عصر کے بعد نوٹنگھم میں ہے مسجد میں بیان ہوگا اور شام کا کھانا بھی مقصود میاں کے ساتھ، جو کرنل مطلوب صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں اور مُدّت سے برطانیہ میں مقیم ہیں اور رات واپس یہاں دارالعرفان بریڈ فورڈ، انشاءاللہ۔

۲۱ مئی

توحضور! کل ظہر کے بعد روانہ ہو کر نوٹنگھم گئے جو بریڈ فورڈ سے لندن کی طرف تقریباً اسّی میل ہے جبکہ یہاں سے لندن دو سو میل ہے۔ برطانیہ میں پندرہ بیس مقامات ایسے ہیں جو شہر کہلاتے ہیں باقی سب قصبے ہیں ان شہروں میں سے ایک نوٹنگھم بھی ہے یہ "شیر دل رچرڈ" کا پایہ تخت تھا جب وہ مشہور صلیبی جنگوں میں حصّہ لینے کے لیے مشرقِ وسطیٰ میں چلا گیا تو اپنے چھوٹے بھائی کو حکمران بنا گیا جس نے لوگوں پر ظلم ڈھائے تو مشہورِ زمانہ کردار "رابن ہڈ" ظاہر ہوا۔ یہ شخص شاہی خزانے کو لوٹ کر غریبوں کی مدد کرتا۔ آخر کار شہزادے کو قید کر کے تقریباً نو ماہ تک حکومت کرتا رہا، کہ رچرڈ لوٹا تو اس کی آمد پر حکومت کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دی جس نے اسے بہت سراہا اور اپنا درباری بنا لیا۔ اس شہر کے پاس تاحال مشہور جنگل باقی ہے۔ بہت بڑا شہر ہے۔

ہم نے چائے پی اور مقصود صاحب کے ساتھ مسجد کو روانہ ہوئے۔ جس کا نام مدنی مسجد ہے ایک نوجوان قاری صاحب نعت پڑھ رہے تھے اور لوگ ہمارا انتظار کر رہے تھے کہ ہمیں اطلاع تھی نماز ½۷ بجے ہوگی جبکہ وہاں عصر ۷ بجے پڑھی جاتی تھی اس طرح ہم آدھ گھنٹہ تاخیر سے پہنچے بہر حال پہنچ گئے اور کچھ لوگ منتظر بھی تھے۔ چنانچہ بیان ہوا،

مسجد کے نام کی نسبت سے موضوع بھی چُنا کہ مدینہ منورہ سے نبی کریم ﷺ نے محبتوں کے دریا بہا دیئے، اللہ کریم کا ارشاد، اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا فرمایا، لوگو! تم تو ایک دوسرے کے دشمن تھے، کوئی کسی کا دوست نہ تھا۔

چھٹی صدی عیسوی کی تاریخ کسی سے پوشیدہ نہیں، سرزمین ہند و پاک بُت پرستی کا گہوارہ اور جور و جفا کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وسط ایشیا میں منگولوں کی بربریت ضرب المثل ہے۔ اِن سے مغرب میں، کسریٰ کے مظالم اور آگ کی پرستش کے ساتھ رُوما کی سلطنت تھی، جہاں انسانوں پر نہ صرف بھوکے درندے چھوڑے جاتے بلکہ گھوڑے کی پیٹھ پر پیٹھ ہی کے بل باندھ کر اُن پر باز چھوڑے جاتے۔ وہ انھیں نوچتے تو اُن کی چیخوں پر لوگ قہقہے لگاتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ امریکہ کے ریڈ انڈین کا حال اور افریقہ کی مردم خوری سے کون واقف نہیں؟

اِن حالات میں جزیرہ نمائے عرب بیک وقت ان تمام برائیوں کا گہوارہ تھا، قتل و غارت، لُوٹ مار، وحشت و بربریت ہی دُنیا کی تہذیب تھی کہ نبی رحمت ﷺ مبعوث ہوئے اور آپ کا کمال یہ تھا کہ بھڑکتے شعلوں کو رُوح پرور پُھوار میں تبدیل کر دیا۔ بستیاں اُجاڑنا کچھ مشکل نہیں، مگر ویرانوں کو بسانا آسان نہیں، دِلوں کو اُجاڑنا بڑی بات نہیں مگر اُجڑے دلوں میں بہار لانا بہت مشکل ہے۔ جو آپ ﷺ کی برکات سے ظہور پذیر ہوا اور کمال یہ ہے مسلمان نہ صرف اس سے خود بہرہ ور ہوئے ایک عالم کو امن و سکون اور عدل و انصاف سے بھر دیا۔ کسی کو زبردستی مسلمان نہ بنایا مگر ہر ظالم کا ہاتھ ظلم سے روک دیا اور کفار کو ان کے زیرِ سایہ امن اور انصاف کی دولت ملی ؎

خود نہ تھے جو راہ پر، اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی، جس نے مُردوں کو مسیحا دیا

صرف فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دس سالہ دورِ خلافت میں پچیس لاکھ مربع میل علاقہ فتح ہوا جس میں کم و بیش پینتیس ہزار بڑے شہر تھے مگر کیا مجال جو کسی کافر عورت کی چیخ بھی سُنائی دے کہ کسی مسلمان سپاہی کا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا ہوا۔ یہ آپ کا کمال تھا اور اس عظیم تبدیلی پہ کوئی وقت نہیں لگتا تھا، اُدھر ایمان نصیب ہوا تو آپ ﷺ کی اِک نگاہ نے دل کی دُنیا بدل دی اور آتش فشاں گل باری کرنے لگے،

آج بھی نبوت آپ ﷺ کی ہے اور رُوئے زمین پر ہے، اور ہمیشہ کے لئے ہے تو برکات کا عالم بھی وہی ہوگا۔ ہاں! اگر انسانوں سے محبت اُٹھ گئی ہے تو انھیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وجہ کیا ہے؟ جو بھی فکر کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ یقیناً آپ ﷺ سے تعلق میں کمی واقع ہوئی ہوگی۔"

آج اگر ہم اپنی حالت کا جائزہ لیں تو یہ آپس کے جھگڑے یہ تقسیم اور طعن و تشنیع کیا یہ محبت کا پتہ دیتے ہیں؟ نہیں! ہرگز نہیں!۔ تو میرے محترم! دِلوں میں محبت کی کمی آقا ﷺ سے تعلق میں کمزوری پہ دلالت کرتی ہے۔ دیارِ غیر میں اگر ہم اِن کی اصلاح نہیں کر سکتے ہیں۔ لہٰذا فکر کیجئے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کیجئے، جس کا واحد راستہ آپ ﷺ سے قلبی تعلق ہے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق بخشے، آمین۔

یہ چند حروف بیان کا خلاصہ ہیں، بہرحال ہم نے مغرب مقصود صاحب کے گھر پہ جا کر پڑھی کھانا کھایا اور واپس پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے گھر آ کر عشاء پڑھی اور سو گئے۔

آج برمنگھم جانا تھا لہٰذا ناشتہ کے بعد روانہ ہو کر ظہر وہاں جا کر ادا کی۔ یہاں سے ایک سو بیس میل فاصلہ تھا۔

برمنگھم بہت بڑا شہر ہے مشہور انڈسٹریل سٹی ہے بلکہ یہاں کی شاٹ گن دُنیا میں بہترین گن شمار ہوتی ہے۔ کافی مساجد ہیں، ہمیں مرکزی مسجد میں جانا تھا۔ جو واقعی خوبصورت

مسجد ہے اور اس پر گنبد بھی بنا ہوا ہے اور بلند مینار بھی۔ جو عموماً ان ممالک میں نہیں ہوتے
بس ایک جیسے مکانات میں کسی ایک کو مسجد بنا لیتے ہیں مگر،

" اس خوبصورت اور وسیع و عریض مسجد کو دیکھ کر مسرت ہوتی ہے مگر یہاں بھی
وہی آپس کی لڑائی کا خطرہ اور مولویوں کی آپس میں چھینا جھپٹی، ایک معمول
ہے کم و بیش دس بارہ پیر خانوں کے نمائندے بھی اس شہر میں مستقل قیام
پذیر ہیں جنہیں کسی عالم کی خبر ہو تو اپنے اپنے عرس جلسے یا گیارھویں شریف
کا اعلان کر دیتے ہیں۔ انھیں مریدوں کے کھو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔"

۲۲، مئی

کل تھکاوٹ بھی تھی، دیر بھی ہو گئی لہٰذا مضمون نامکمل ہی رہ گیا تھا، آج اسی بات
کو پورا کرتے ہیں۔ تو میں حضرات کی بات کر رہا تھا۔ دراصل یہی عقیدت مند اُن کی کھیتیاں
ہیں اور کوئی بھی عقلمند آدمی اپنے آمدنی کے وسائل کھونا نہیں چاہتا۔ رہی بات کہ دین کی
بات ہے، سُننے کیوں نہیں دیتے؟ تو دین اُنھیں وہ خُود بتاتے رہتے ہیں۔ اور دین ہی
کے نام پر چندے وصُول کرتے ہیں لہٰذا دُوسرے کسی سے کیوں سُنوائیں؟ اگر اُس نے کہہ
دیا کہ تمھارا رزق تو اللہ دیتا ہے، صحت بیماری اُسی کے ہاتھ میں ہے لہٰذا اُسی سے اُمیدیں
جوڑو تو پیروں کو نذرانے کون دے گا؟

کہتے یہ بھی ہیں کہ اللہ دیتا ہے یہ صرف دِلوانے والے ہیں بس اپنے لئے لوگوں سے
لیتے ہیں کہ آخر اپنے لئے بھی مانگنے لگیں تو اللہ میاں یہی سمجھیں گے کہ اب کمیشن مانگتے ہیں
اور خفا ہوں گے۔ لہٰذا یہ لوگ اللہ کی رضا میں بندوں سے مانگ لیتے ہیں۔

" مسجد کے خطیب صاحب بہت نیک صورت اور دھیمی آواز والے آدمی تھے
ظُہر کی چار رکعت اُنھوں نے دس منٹ میں ختم کیں اور اعلان فرمایا کہ
نماز کے بعد پروگرام ہے لہٰذا آج درسِ قرآن نہیں ہوگا۔ یہ واضح اشارہ

تھا اپنوں کے لیے کہ جاؤ، کہیں ان کی بات نہ سُن لینا، جیسے وہ تو
درس قرآن دیتے تھے اور ہم کوئی ورائٹی شو پیش کرنے والے ہیں۔"

بہر حال ان کی بھی مجبوریاں ہیں جو پیشِ نظر رکھنی چاہئیں۔ پہلے تو لوگوں کو بھاگتے دیکھ کر خیال آیا کہ بیان نہ ہی کروں۔ نہ چندہ لینا ہے نہ کوئی مفاد ان سے مطلوب، تو کیا ضرورت، مگر پھر بیان کیا، اس لئے کہ اللہ کا دین بیان کرنا ہی میری زندگی ہے اور یہی میری ملازمت! سُننا نہ سننا یہ میرا کام نہیں۔ اور کچھ احباب جو ساتھ تھے، جو وہاں کے تھے اور جو دُوسرے شہروں سے آئے تھے انھیں تو خطاب کرنا ہی تھا۔ چند افراد مقامی بھی بیٹھ گئے شاید یہ مخلص مریدوں میں سے نہ ہوں گے۔

بہر حال آیہ کریمہ تلاوت کی جس کا مفہوم ہے،

"حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسُول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پہ سخت، آپس میں محبت کرنے والے اور جب بھی تو انھیں دیکھے رکوع سجود میں پائے گا، کہ اللہ سے اُس کا فضل اور رضا چاہتے ہیں۔ ان کی پیشانیوں میں سجدوں کے باعث ایک خاص چمک ہے۔"

اور یوں عرض گزار ہوا کہ بھئی! آپ نے اپنا معمول کیوں چھوڑا؟ آپ ہی بیان فرما دیتے اور ہم سُن لیتے، مقصد تو درسِ قرآن ہی تھا۔ بہر حال اب جو بندہ کو توفیق ہے، سُن لیجئے! اس آیہ کریمہ میں ربِ جلیل نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسُول ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے سارے بنی آدم ہمیشہ کے لئے صرف ایک ہی ہستی کی بات پر یقین کریں۔ ذاتِ باری صفاتِ باری اور مرضیاتِ باری سب ہی کچھ صرف اس انداز میں مانیں جس میں وہ ماننے کا حکم دے حالانکہ اس کے ساتھ کوئی دُوسرا انسان اس بات کا شاہد بھی نہ ہو کہ ان پہ

جو وحی نازل ہوئی میں نے بھی سُنی تھی۔ اتنا بلند مقام کہ کسی دُوسرے انسان کی شہادت کی حاجت ہی نہ تھی اور اللہ کریم نے خود فرمایا کہ اس امر پر میری شہادت کافی ہے۔ اور میں ہی اس بات کا گواہ ہوں کہ حضرت محمد ﷺ برحق رسُول ہیں اور پھر اپنی شہادت کو دلائل سے ثابت فرمایا۔

یہ بھی یاد رہے کہ قرآن حکیم میں بے شمار موضوعات زیر بحث آتے ہیں تخلیق کائنات آدم اور اولادِ آدم، جسم اور رُوح، گذشتہ امور کی خبریں، آئندہ کی پیش گوئیاں، عالم ملکوت اور آخرت کی باتیں۔ مگر قرآن حکیم کا اصل موضوع بندے اور مالک کا رشتہ ہے لہٰذا اس کا اعجاز ہے کہ جس موضوع پر بھی بحث کر رہا ہو اصل بات کو ضرور بیان کرتا ہے۔

یہاں بھی انداز تو اپنی شہادت پر دلائل مہیا کرنے کا ہے مگر لطف یہ ہے کہ ساتھ بندوں کو اُن کے حال کی خبر بھی دی جا رہی ہے اور اپنے تعلق کے وہ اثرات بیان فرمائے جا رہے ہیں جو عملی زندگی میں دیکھے جا سکتے ہیں کہ،

"جسے میرے ساتھ تعلق کا دعوٰی ہو تو اسے دیکھ لینا چاہیئے کہ اس کے تعلقات کی میرے نبی کے ساتھ کیا صُورت ہے اس لئے کہ اللہ سے تعلق کا واحد ذریعہ انھی کی ذاتِ کریم ہے اور ان کے ساتھ تعلق کا اثر مومن پر یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ کافر کے لئے ناقابلِ تسخیر بن جاتا ہے۔"

اتنا سخت کہ کافر کی کوئی چال اور کفر کا کوئی داؤ اسے متاثر نہیں کرتا۔ یہ پہلا اور فوری اثر ہے اور اس کو ہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ جب آپ ﷺ نے اعلانِ نبوت فرمایا تو رُوئے زمین پر صرف آپ ﷺ کی ذات تھی جو اللہ سے آشنا تھی اور پُوری دُنیا کا کفر بھڑک اُٹھا پھر ایک ایک کر کے خوش نصیب معیتِ رسالت اور نورِ ایمان سے سرفراز ہوتے تو کونسا ظلم ہے

جو کفار نے ان پر نہ کیا ہو، مگر کسی بھی صورت کافر اُن پر قابو نہ پا سکے نہ لالچ دے کر، نہ طعن و تشنیع سے اور نہ زبردستی کر کے۔ حتیٰ کہ تیرہ سالہ مکی عہدِ نبوت میں تو مقابلے میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت بھی نہ تھی اور یہ آپ ﷺ کی معیت کی برکات تھیں ہمارا بھی سارا سرمایہ یہی ہے کہ کہتے ہیں ہمیں آپ ﷺ کی معیت حاصل ہے۔ اور یہی مسلمانی بھی ہے،

"تو ہمیں جائزہ لینا ہوگا کہ کیا واقعی کفر کے لئے ہم بھی ناقابلِ تسخیر ہیں، کافرانہ رسومات، عقائد اور کردار ہمیں متاثر نہیں کر سکتے؟ اگر ایسا ہے تو ہم بہت خوش قسمت ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے یا اس میں کچھ کمی ہے تو اس کی تلافی کی فکر کرنی ہوگی"۔

دُوسری بات جو آپ ﷺ کی برکات میں سے ہے وہ ایجابی اور مثبت پہلو ہے یعنی قبول کیا کرتے ہیں مومنوں سے، اسلام سے، اسلامی عقائد سے اور اعمال سے محبت اور اس کی مثال بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں سُورج سے زیادہ روشن ہے اس معاشرے کے افراد جس کی بنیاد لُوٹنے پر تھی، تب بھی ایثار کرنے لگے جب خُود ضرورت مند ہوتے حتیٰ کہ قادسیہ کے میدان کا ایک چھوٹا سا واقعہ بھی مثال پیش کرنے اور معاشرے کا حال سُنانے کے لئے کافی ہے، جب ایک صحابی نے جنگ میں اپنے چچازاد کو زخموں سے چوُر موت کے دروازے پہ پایا تو اسے پانی پلانا چاہا تو اس نے دُوسرے زخمی کی طرف متوجہ کیا کہ اس کی خبر لو! دوسرے نے تیسرے کے پاس جانے کو کہا وہاں پہنچا تو تیسرا اللہ کو پیارا ہو چکا تھا واپس پلٹا تو دوسرا شہید ہو چکا تھا۔ بھائی کے پاس آیا تو وہ بھی سفرِ حیات پورا کر چکا تھا،

"زخموں کی آگ، دُھوپ کی تمازت اور سکراتِ موت کی تلخی میں بھی دُوسرے مسلمان بھائیوں کی فکر رہی۔ کیا یہ محبت کی معراج نہیں ہے؟ اور اس میں ہم سب کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ کیا ہمیں بھی اسلام اور مسلمانوں سے ایسی ہی محبت ہے یا اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے اور اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے ان سے نفرت کرتے ہیں جس کا اظہار کبھی زبان سے اور کبھی کردار سے ہوتا رہتا ہے اگر یہ مرض ہے تو اس کی دوا چاہیئے"۔

تیسری بات کہ جب دیکھو عبادت، رکوع و سجود ہی کر رہے ہوتے ہیں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عبادت بھی کی، مگر دُنیا کے سارے کام بھی تو کرتے رہے اور ہر شعبۂ زندگی میں انسانیت کو قیادت بخشی تو اس سے مُراد یہ ہے کہ انھوں نے جو کام بھی کیا پُورے خلوص سے احکامِ الٰہی کے مطابق کیا اور سارا ہی عمل رکوع و سجُود کا درجہ پا گیا۔ (یہاں ہم اپنا کردار پرکھ سکتے ہیں۔) اور وہ اس مقام پر پہنچے کہ ہر کام میں اللہ کی رضا ہی ان کا مقصدِ اصلی ٹھہری اور محض تکمیلِ خواہشات کے لئے کام نہ کرتے تھے۔ اس سے بہت بلند ہو گئے۔ کیا ہمارا جینا مرنا، گھر سے سفر اور یہ دُور دراز قیام، اللہ کی خاطر ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ برکاتِ نبوت اور آپ ﷺ کی معیت کا کرشمہ ہے اور اگر ہم اس سے خالی ہیں تو پھر شاید معیتِ رسالت بھی حاصل نہ ہو۔ بلکہ وہ صرف طالب ہی نہیں رہتے اسی دارِ دنیا میں اُنھیں یہ عظمت حاصل ہوتی ہے کہ ان کی پیشانیاں میری تجلیات کا مہبط بن جاتی ہیں۔ اللہ کرے، ہمیں بھی یہ دولت نصیب ہو اور ہم محض رواجی اسلامی ناموں کی بجائے کردار اور عمل سے پہچانے جائیں کہ یہ مسلمان ہیں۔

کچھ اس طرح سے بات مکمل کر کے اجازت لی۔ بھلا کس کی اجازت، چند ہی تو لوگ تھے مگر الحمدُللہ! وہ خوش تھے۔ غالباً بات انھیں پسند آئی کہ رخصت بڑی گرمجوشی سے کر رہے تھے۔ حالانکہ آمد اُنھیں بھی کوئی خوش گوار محسوس نہ ہوئی تھی۔

بہرحال ایک دوست کے گھر کھانا تھا، وہاں پہنچے اور وہاں سے فارغ ہو کر مرکز کو روانہ ہوئے۔ دوسرے شہروں سے آئے ہوئے دوستوں نے بھی رخصت لی۔

اتفاق ایسا ہے کہ ہم انہی دنوں یہاں آتے ہیں اور یہاں یہ موسم بہار کا ہوتا ہے ہر طرف سبزے کی بہتات ہوتی ہے۔ سبزہ تو سارا سال ہوتا ہے مگر سردیوں میں برف سے ڈھک جاتا ہے۔ آجکل بھی اگرچہ سارا دن کمروں میں ہیٹر چلتے ہیں اور سونے کے لئے رضائی بھی لینا پڑتی ہے مگر یہاں گرمی کا یہی موسم ہے لہٰذا بہت خوبصورت علاقہ ہے سڑک کے دونوں طرف فارم ہیں۔ گھوڑوں کے، گایوں کے اور بھیڑوں کے یا فصلیں ہیں اور گھاس۔ بھینس، بکری اور اونٹ چڑیا گھر کے علاوہ نظر نہیں آتے بلکہ بھینس تو شاید میں نے چڑیا گھر میں بھی نہ دیکھی تھی۔ بھیڑیں، اُون اور گوشت مہیا کرتی ہیں۔ دُودھ سے گایوں نے بے نیاز کر دیا ہے اور گھوڑے آج بھی بہت پسند کئے جاتے ہیں اور یہ لوگ محض دردِ سر کے لئے کچھ نہیں پالتے۔

بڑی سڑکیں دو رویہ ہیں صاف اور خوبصورت۔ اور کاروں کا ہجوم ایسے ہوتا ہے جیسے بازار میں ہو یا شہر کی مصروف سڑکوں پر اور بہت تیز چلتے ہیں۔ ٹریفک کے قواعد کی پابندی بڑی سختی سے ہوتی ہے اور اگر کوئی ایک گاڑی ٹکرا جائے تو سنبھلتے سنبھلتے ساٹھ ستر تک کاریں ٹکرا چکی ہوتی ہیں۔

ان سب میں ایک عجیب بات نظر آئی۔ تقریباً سب ہی کاروں میں ایک جوان لڑکی یا عورت اور ایک جوان لڑکا یا مرد نظر آیا۔ بہت کم میں دو عورتیں دو مرد اور ایک سو بیس میل کے سفر میں دو کاروں میں بچے بھی ساتھ نظر آئے جبکہ ایک کار میں ایک نوجوان خاتون کے ساتھ ایک بڑھیا کو دیکھا تو پوچھ لیا کہ ان لوگوں کا آگا پیچھا نہیں ہوتا یعنی والدین یا اولاد؟ تو پتہ چلا کہ یہاں یہ مصیبت نہیں ہوتی، ہوسٹل بنے ہیں جن میں والدین کو بھی چھوڑ دیا جاتا

ہے اور بس۔ ہاں! اگر کوئی ہوسٹل میں نہیں رہنا چاہتا تو یہ اس وقت تک ممکن ہے جب تک وہ خود کام کرتا ہے۔ اگر کام سے گیا تو پھر اولاد کو پریشان نہیں کر سکتا، ہوسٹل جائے گا۔ اسی لئے جب تک بڈھوں کی ہڈیاں چلتی ہیں کام کرتے رہتے ہیں مرد بھی عورتیں بھی۔ بچوں کے بھی ہوسٹل ہیں لہٰذا جوان آزاد ہیں۔ اور شادی کی مصیبت بھی کم ہی مول لیتے ہیں، برسوں اس کے بغیر بھی مل جل کر رہ سکتے ہیں۔ یہی ان کی عمومی زندگی ہے۔

جیسے اُن کے حالات ہم اہلِ مشرق کے لئے ناقابلِ یقین ہیں اس سے بڑھ کر اُن لوگوں کے لئے مشرقی روایات ناقابلِ یقین ہیں اور جو لوگ مشرق سے آ کر یہاں بس گئے ہیں وہ چاہے جو کر لیں، ان کی اولاد مغربی ہی بنتی جا رہی ہے۔ اِلّا ماشاءاللہ! ابھی تک میں یہ نہیں جان پایا،

"لوگ محض پیٹ بھرنے کے لئے دین، مذہب، ضمیر اور مزاج یا سارا سرمایۂ حیات کیوں داؤ پر لگاتے پھرتے ہیں؟"

اور جسے دیکھو، اسے باہر کے ملک جانے کا جنون سوار ہے۔ پتہ نہیں کیوں؟ مگر قیمت بہت ہی بھاری ہے۔

اب اجازت، باقی آئندہ انشاءاللہ العزیز۔

۲۳، مئی

کل کا دن فارغ تھا اور صرف اُن لوگوں کے لئے مختص تھا جو یہاں مرکز میں آ کر ملنا چاہتے ہوں، لہٰذا دن بھر گھر پہ رہے۔ عصر کے بعد ذرا باہر جانے کا پروگرام بنا تو بریڈ فورڈ کے مختلف حصّے موٹر میں بیٹھ کر دیکھے۔ بہت سی وادیوں کا سنگم ہے اور تیز اُترائیاں اور چڑھائیاں ہیں مگر خوبصورت سڑکوں، روشنیوں اور سجی سجائی دکانوں سے بھری ہوئی، بڑے خوبصورت رہائشی حصّے اور نظر فریب پارکیں ہیں۔ کہیں کرکٹ کھیلا جا رہا ہے تو دوسری جگہ گھوڑ سواری کی مشق ہو رہی ہے۔ ایک جگہ پولو کھیلا جا رہا تھا۔

آخر کار ایک گاف کلب میں جا پُہنچے۔ ۱۸، ہولز کا بہت بڑا گاف کھیلنے کا گراؤنڈ پہاڑی کے گرد سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ نہایت سلیقے سے گھاس کٹی ہوئی تھی تھوڑے سے لوگ کھیل رہے تھے۔ دراصل مغرب کا وقت قریب ہو چلا تھا اور مغرب کے بعد گھر سے باہر ہر آدمی غیر محفوظ ہوتا ہے۔ یہ امن کی علمبردار قوموں کے گھر کی حالت ہے۔

بہر حال ایک بات موضوعِ گفتگو رہی کہ سب ہی بوڑھے تو ہوسٹلوں میں نہ جاتے ہوں گے کچھ تو گھروں میں بستے ہوں گے۔ تو پتہ چلا، ضرور! گھروں میں رہنے والوں کی

تین اقسام ہیں۔ اوّل اُمراء۔ جن کے پاس دولت ہوتی ہے وہ بچوں کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیتے ہیں اور پیسے حاصل کرنے کے لئے اولاد ان کے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ دوسرے وہ جو اولاد کا کام کر دیتے ہیں اور ماہانہ وظیفہ لیتے ہیں۔ مثلاً کپڑے دھو کر تیار کر دینے وغیرہ تو وہ ساتھ رہ کر بچوں کی ملازمت کرتے ہیں۔ اور تیسرے وہ جو اکیلے ہوں بُڈھی بُڈھا ایک چھوٹا سا گھر لے کر پڑے رہتے ہیں، ایک مر جائے تو دُوسرا خبر کرتا ہے اس کی نعش دفن کرنے والا محکمہ لے جاتا ہے مگر دُوسرا مرے تو اس کا کتا بھوک سے مجبور ہو کر دوسرے دن شور کرتا ہے تو پولیس خبر لیتی ہے یا پھر نعش کا تعفن اس کی اطلاع کا باعث بنتا ہے۔ یوں نعش تدفین کے لئے کمیٹی کہہ لیں یا میونسپلٹی والے لے جاتے ہیں اور گھر کا سامان ورثا۔

"یہاں انسانوں کو ہلانے والی صرف دو طاقتیں ہیں دولت یا جنس، اور بس۔

صاف ستھرے شہروں، خوبصورت سڑکوں سجے سجائے بازاروں، مشہور شہروں کی جگمگاتی روشنیوں میں یہ قابلِ رحم مخلوق بستی ہے بحیثیت انسان سب سے ہمدردی ہوتی ہے مگر مسلمانوں کو اس سیلاب میں بہتے دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا ہے جن کو ڈبونے میں علماء اور پیروں کی کوششیں بھرپور کردار ادا کر رہی ہیں۔

اللہ کریم سب کو ہدایت دے، آمین۔

انسانوں کی تقسیم بھی عجیب ہے۔ آج ایک خاتون کا فون آیا کہ وہ ذکرِ الٰہی سیکھنا چاہتی ہے اس کے خیالات سُن کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ اس ظلمت کدے میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ ورنہ تو مسلمان عموماً دو طبیعتوں میں بٹ چکے ہیں۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو مولویوں اور پیروں کے ہاتھوں رسُومات میں پھنسے ہوئے ہیں اور پاؤنڈ دے کر خود فارغ ہو جاتے ہیں۔ دُوسرے وہ جو اس سارے کھیل سے متنفر ہو کر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی معاشرے کا حصّہ بن رہے ہیں مگر اس بچی کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ مولوی اور پیر جو جبّہ و دستار

پہن کر درشن کراتے اور چُپ چپ رہ کر نیم باز آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ اپنی تنہائیوں میں اتنی عیش کرتے ہیں کہ بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں۔ مگر صرف یہی کچھ نہیں، دُنیا حق سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اہلِ حق کو تلاش کرنا اور ان سے دردِ دل اور دوائے دل حاصل کرنا بھی بہت ضروری ہے کہ اس کے بغیر عبادت بھی محض اداکاری ہی رہ جاتی ہے اور وہ اثرات مرتب نہیں ہوتے جو ہونے چاہئیں۔

یہ وہ بات ہے جو بڑی محنت کر کے سمجھانی پڑتی ہے کسی خاتون کا یہ تجزیہ بہت خوشی کا باعث بنا مگر ساتھ ایک خوف سا بھی ہے کہ غالباً اس کے میاں دینی اعتبار سے نہ صرف کمزور ہوں گے بلکہ شاید اُسے بھی کام نہ کرنے دیں کہ اس طرح کے تجربے پہلے سے بہت ہیں جو خواتین کچھ کر سکتی ہیں ان کے شوہر راستے کی دیوار بن جاتے ہیں۔ اور جو شوہر کسی قابل ہوتے ہیں ان کی بیویاں پاؤں کی زنجیر۔ بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں کہ میاں بیوی دونوں میں کام کرنے کی تڑپ ہو۔ بہرحال مرد تو پھر بھی کچھ کرتا رہتا ہے مگر خواتین بہت مجبور ہوتی ہیں،

"مرد حضرات کلب جانے، بازار پھرنے اور سینما تک دیکھنے پہ خوش ہوتے ہیں مگر جب دین کی بات ہو تو کہتے ہیں کسی سے ملنا، بات کرنا اور سیکھنا شرعاً جائز نہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ اگر وہ ان کا یہ کام کر دیں تو یقیناً انھیں کسی سے ملنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے"۔

مگر مرد آخر مرد ہے اسے کون روک سکتا ہے۔

بہرحال، آج اب تک کے لئے تو یہی کافی ہے اگر ضرورت محسوس کی یا کوئی بات قابلِ ذکر ہوئی تو پھر لکھوں گا۔ انشاء اللہ! تب تک اللہ حافظ۔

۲۴، مئی

کل بعد عصر مانچسٹر جانا تھا۔ وہاں ایک ساتھی کے گھر پہ ذکر تھا، یہاں سے روانہ ہونے میں کچھ دیر لگی۔ بریڈفورڈ سے نکلے تو بارش نے آلیا بہت زوروں کی بارش تھی۔ یہاں ضرب المثل ہے کہ،

'Never trust the three Ws,

Woman, Weather, and Word in Britian.

کہ تین ڈبلیو پہ اعتبار کم از کم برطانیہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ موسم، عورت اور وعدہ۔

یہی ہوا سارا دن دھوپ تھی۔ شہر سے باہر نکلے تو بارش نے آلیا۔ آگے گئے تو مطلع پھر صاف تھا۔ راستے میں باتوں باتوں میں بوڑھوں کی ایک اور قسم دریافت ہوئی جسے نہ لکھنا بہت زیادتی ہوگی۔ وہ ایسے بوڑھے جوڑے جو اولاد سے فارغ، کام کے قابل نہیں رہنے کو حکومت یا کونسل اُنھیں چھوٹا سا مکان مہیا کرتی ہے اور گزارے کی رقم بھی، مگر ان کی زندگی بھی بہت دشوار ہوتی ہے۔

بہرحال مانچسٹر پہنچے تو پتہ چلا صُبح بارش ہوئی تھی، دن بھر دھوپ رہی۔ آخر برطانیہ کے موسم ہیں ان کا مزاج بھی شاہانہ ہوگا۔

مزید اسی خنکی تھی، اور شام بہت سہانی تھی مگر یہاں سرِشام ویرانیاں ڈیرہ جما لیتی ہیں ہر کوئی اپنے ڈربے میں گھس جاتا ہے کہ زندگی محفوظ نہیں رہتی۔ اگرچہ پولیس بھی چپے چپے پر پھرتی ہے مگر امن نہیں۔ کوئی بھی بے فکر ہو کر گھوم نہیں سکتا۔ بس بازار بند۔ لوگ غائب۔ ہم مانچسٹر کے بازار سے گزرے تو دوست بتا رہے تھے کہ دن کو اسے عبور کرنے میں کم از کم دو گھنٹے لگتے ہیں۔

یہاں کپڑے کی بہت بڑی صنعت ہے۔ اسی لئے فیصل آباد کو "پاکستان کا مانچسٹر" کہا جاتا ہے۔ یہاں کی سات ایم ایم کی رائفل بھی دنیا کی بہترین رائفل ہے۔ بہت بڑا شہر ہے اور وہی بلند بالا عمارتیں کھلی سڑکیں اور روشن راہیں، جو بھیگی شام کو ویران تھیں بس پورے شہر میں چند جوڑے نظر آئے جو تیزی سے کسی سمت جا رہے تھے۔

گھر پہنچے، مغرب ادا کی۔ مقامی ساتھی بھی چھ یا سات ہوں گے اتنے ہم بھی تھے مل کر ذکر کیا۔ کھانا کھایا اور عشاء پڑھنے لگے کہ واپس پہنچنا تھا۔ نماز سے فارغ ہوئے تو کچھ لوگ ملنے آگئے جنہیں مسجد میں ہمارے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ گھنٹہ بھر محفل رہی۔

پہلا سوال رشدی کے بارے تھا جس کے متعلق وہ میری رائے کے طالب تھے عرض کیا، کہ میرے خیال میں تو اس کی خرافات کا جواب ان مستشرقین کی تصانیف سے جنہوں نے اسلام اور آپ ﷺ کی ذات گرامی کے بارے محققانہ رائے دی ہے دیا جانا چاہیئے تھا۔ کہ یہ طریقہ جو لوگوں نے اپنا لیا ہے مناسب نہ تھا۔ اس سے نہ صرف اس کو شہرت اور دولت ہاتھ آئی بلکہ برطانوی لوگوں اور عالمی کفر کی ہمدردی بھی لے گیا۔ کتاب لوگوں نے خواہ مخواہ پڑھی اور مسلمانوں کی اپنی نئی نسل ڈگمگا رہی ہے کہ کیا واقعی اس کا کوئی جواب نہیں؟ دوسری طرف یہ مراد ہوا کہ اس نے نعوذ باللہ ٹھیک لکھا ہے اب بھی یہ طریقہ ضرور اختیار کرنا چاہیئے۔

رہی یہ بات! کہ ۲۷ مئی کو لندن میں مسلمانوں نے مظاہرے کا پروگرام بنایا ہے تو اب چونکہ اعلان کر چکے ہو، لہٰذا اسے کامیاب بناؤ! ورنہ مسلمانوں کی کمزوری ثابت ہو گی۔ اس آگ کو بھڑکانے میں جہاں علماء کی سادگی تھی وہاں خمینی صاحب کی عیاری نے زیادہ کام کیا۔ کہ جو کچھ انھوں نے "کشف الاسرار" اور "ولایت فقیہ" میں لکھا ہے رشدی تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں لکھ سکا۔ مگر اس کے قتل کا فتویٰ دے کر سیاسی فوائد حاصل کر لئے۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو بغیر اعلان اسے قتل کروا سکتے تھے۔

ایک مسئلہ ان کا یہ تھا کہ ایک معروف پیر صاحب نے جو عالم بھی ہیں فتویٰ دیا ہے کہ برطانیہ "دار الحرب" ہے یہاں شراب کا کاروبار جائز ہے، لاحول ولا قوۃ الا باللہ، یہ سب پیٹ کے دھندے ہیں۔ بھئی! دار الحرب ہے تو تم دار الاسلام میں چلے جاؤ! کیوں یہاں بیٹھے ہو؟ اور اگر یہاں ہو تو خود کو مسلمان ثابت کرو کہ ان لوگوں کو بھی اسلام سے رغبت پیدا ہو، پیر کو چندہ دیتے رہو مگر شراب کو حلال مت جانو کہ حرام شرعی کو حلال سمجھنا کفر ہے اور حرام سمجھ کر مرتکب ہونا گناہ ہے۔

محفل رات بارہ بجے تک رہی اور دعا کر کے فارغ ہوئے رات ایک بجے واپس پہنچے یہاں اڑھائی بجے فجر ہو جاتی ہے۔ یہاں کے دن رات بھی نرالے ہیں سردیوں میں رات سترہ گھنٹے اور دن سات گھنٹے، گرمیوں میں دن سترہ گھنٹے اور رات سات گھنٹے، مگر یہ لوگ کام میں کمی نہیں آنے دیتے۔ تمام خرابیوں کے باوجود کام کام ہے۔ وہ اپنے وقت پر ضرور پورا ہو گا۔ ان کافروں نے اسلام کی یہ ادا اپنا رکھی ہے۔

بہر حال ایک ادنےٰ سی کوشش ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ کاش! علماء اور پیر حضرات یہ کام اپنا لیں اور خلوص سے انجام دینے لگیں تو اس قوم کو سنبھلنے کا موقع نصیب ہو۔

۲۵، مئی

کل بعد عصر یہاں بریڈ فورڈ میں مسجد میں بیان تھا لہٰذا ہم گئے بارش بدستور لگی ہوئی تھی۔ تقریباً سارا دن وقفے وقفے سے چلتی رہی۔ یہاں بھی بھیگتی ہوئی شام اداس اور تنہا تھی مسجد میں بہت سے لوگ تھے مگر جوان اوّل تو کم ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہ سُننے کم ہیں چلے جاتے ہیں۔ کہ علماء اور پیر حضرات نے لوگوں کو تھکا دیا ہے۔ بہر حال اللہ کا نام لے کر بیان کیا جس کا خلاصہ سپردِ قلم ہے۔

آیہ کریمہ تلاوت کی جس کا مفہوم ہے کہ تم بہترین اُمّت ہو جو دُوسروں کی بھلائی کے لئے کھڑے کِئے گئے ہو۔ نیکی کی تلقین کرتے ہو اور بُرائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر یقین رکھتے ہو۔ دُنیائے ہست و بُود میں بے شمار قومیں گزری ہیں اور بہت سی موجود ہیں۔ ابھی لوگ آ بھی رہے ہیں مگر اس جم غفیر اور اقوام کی بھیڑ بھاڑ میں مسلمان ایک بہترین قوم ہے اور اس بات پہ خود اللہ کریم نے گواہی دی ہے۔ اس کی خوبی کی وجہ یہ ہے کہ آپ سے پہلے مسلسل نبی مبعُوث ہوتے چلے آئے جب بھی ضرورت ہوتی نبی مبعوث کر دیا جاتا مگر آپ ﷺ کی بعثت نے نبوّت کی ضرورت باقی نہ چھوڑی اور جو انعامات اپنے خالق سے حاصل کرنے کی استعداد انسان لایا تھا وہ آپ ﷺ کی وساطت

سے عطا کر دیئے گئے اب انسان کی ہمّت ہے کہ وہ کہاں تک اور کیا کچھ حاصل کرتا ہے چنانچہ کسی نئے نبی کی ضرورت نہ رہی۔ البتہ یہ نورِ ہدایت پھیلانے کا کام مسلمان قوم کے سپرُد کر دیا گیا اور یہی ختمِ نبوت کا راز ہے کہ جو نبی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے گویا اس حقیقت کا بھی انکار کرتا ہے۔ اس کے دعوے کے مطابق کچھ انعامات باقی ہیں جو اس کے طفیل نصیب ہوں گے اور یہ باطل ہے۔ اس کو آپ یوں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ آپ ﷺ ساری انسانیت کے لِئے مبعوث ہوئے مگر جزیرہ نمائے عرب سے باہر تشریف نہیں لے گئے تو فرائض نبوّت میں یہ بات بھی شامل تھی کہ آپ ﷺ جہاں جہاں انسان بستے تھے وہاں وہاں اپنی دعوت پہنچاتے۔ اللہ کریم نے یہ خدمت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لی۔ جو مثالی خیر اُمّۃ کا مصداق تھے۔ کہ

"تیئس برس میں نزولِ قرآن مکمّل ہوا تو آپ ﷺ نے صحابہ کے سپرُد فرما کر دُنیا سے پردہ فرما لیا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے وصالِ نبوی کے بعد ٹھیک تیئس برسوں میں یہ پیغام روئے زمین کی تمام آبادیوں تک پہنچا دیا"

جو ایک تاریخی کارنامہ اور خیر اُمّۃ ہونے کی دلیل ہے اور یہی وصف اس اُمت کا امتیازی وصف قرار پایا کہ تم دوسروں کے لِئے جیتے ہو۔ اپنے لِئے تو ایک حیوان بھی جیتا ہے۔ مگر مسلمان تو افرادِ انسانیت کی فلاح کے لِئے اپنی قوّت صَرف کرتا ہے، کہ انھیں نیکی اور بھلائی کی تلقین کرتا ہے اور بُرائی سے منع کرتا ہے اور اللہ پر ایمان رکھتا ہے یہ ایمان و یقین اور قربِ الٰہی کی لذّتیں ہی اس کا اجر ہیں۔

یہ بات خود عجیب لگتی ہے کہ ایمان تو سارے کردار کی بنیاد ہے۔ یہ کام ہی تب ہو سکتا جب پہلے ایمان نصیب ہو، پھر ماحصل بھی ایمان باللہ کیسے ٹھہرا؟ تو محترم! ہر

درخت کی بنیاد بیج ہی ہوتا ہے پھر درخت بنتا ہے اور پھل دیتا ہے تو اس کا ماحصل وہی بیج ہوتا ہے مگر بویا ایک تھا اور حاصل لاکھوں گنا ہوگیا۔ ایسے ہی اعمال کے نتیجہ میں ایمان بطور پھل نصیب ہوتا ہے جس میں قرب اور جمالِ باری کی لذتیں شامل ہوتی ہیں۔

اب ہم اپنی حالت پہ نگاہ کریں تو یہ عمل کس بات کی غمازی کرتی ہے اور ہم نہ صرف عمل سے محروم ہوتے جا رہے ہیں بلکہ اُلٹا کفار کی ادائیں اپناتے چلے جاتے ہیں جو ہماری محرومیوں کی دردناک صورتِ حال کا پتہ دیتی ہیں۔ اگر یہ صورتِ حال رہی تو ہم شاید خیرِ اُمّتہ نہ کہلا سکیں اور دوسرے لفظوں میں اس کمال سے دُوری دراصل اسلام ہی سے دُوری کا نام ہے۔ اس لیے ہمیں خلوص سے توبہ کر کے اپنے اصل مقام پر مضبوطی سے قدم جمانا ہوں گے اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر مسلمان اپنا جائزہ لے کر اپنی اصلاح کی فکر کرے اور دوسروں پر فتویٰ بازی اور طعن و تشنیع سے اجتناب کیا جائے۔ بلکہ دردِ دل کے ساتھ ان کی اصلاح کی کوشش جاری رکھی جائے۔

دہلی کے آخری ایّام میں قلعہ کے اندر ہی تک شاہی اختیار سمٹ چکا تھا اور وہ بھی بادشاہ کی پھوپھی نے چھین رکھا تھا۔ خود پس پردہ دربار کرتی تھیں اور بہت سخت خاتون تھی۔ اُس نے ایک رسم شروع کر دی "بی بی کی صحنک" روٹی کو گھی اور شکر میں گوندکر لوگوں میں بانٹا جاتا اور یہی شرطِ اسلام بن گیا تھا۔ امراء میں اور پھر عوام میں یہ رسم طاعون کی طرح پھیل گئی تو شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جمعہ کے خطبہ میں اس کے رد میں نہایت مدلل تقریر فرمائی۔ لوگوں نے بادشاہ بیگم کو خبر کی کہ یہ مولوی وہابی ہے اور "بی بی کی صحنک" سے منع کرتا ہے کچھ اپنے پاس سے لگا کر بتائیں۔ انھوں نے طلبی کر لی۔ دوسرے دربار میں پیش کیے گئے ملکہ نے برہمی سے پوچھا،

"سُنا ہے۔ تم بی بی کی صحنک سے منع کرتے ہو؟"

فرمایا، "ہرگز نہیں، آپ کو غلط خبر دی گئی ہے۔"

اب خبر دینے والوں نے شور مچایا کہ جمعہ کی تقریر میں آپ نے ایسا کہا تھا۔ تو فرمایا،

"اچھا! وہ بات، بھئی! وہ میری ہرگز نہ تھی میں تو محض ایک خادم ہوں۔ بی بی جی کے والد ماجدؐ کے ارشادات سُنا رہا تھا، اگر وہ منع کریں تو کر بھی سکتے ہیں، میری یہ مجال نہیں۔"

ملکہ نے کہا، "پھر وہ ارشادات ہمیں بھی سناؤ!"

اور سُن کر حکماً یہ خرافات بند کرادی۔

ایک معقول طریقۂ کار نے کتنا بڑا کام کیا حالانکہ محض شہرت حاصل کرنے کے لئے تو سخت باتیں کر کے جیل بھی جا سکتے تھے مگر مقصد اصلاح کرنا تھا۔ اور،

"ہم دوسروں کو رُسوا کرنے کے لئے فتوے صادر کرتے اور لوگوں کو مساجد میں لڑاتے ہیں۔ یہ نہ اسلام ہے نہ اسلام کی کوئی خدمت، ہاں! اسلام یقیناً ایسا خوبصورت اور پُرسکون راستہ ہے کہ جس پر اولاً تو ہم خود پورے اعتماد سے گامزن ہوں اور پھر پیار اور دردِ دل سے دوسروں کو بھی اس پہ لانے کی کوشش کریں۔"

میرے محترم احباب آپ نے تو ایک سودا کیا ہے گھر بار، ملک، دوست احباب رشتہ دار، یہ سب کچھ دُور بہت دُور چھوڑ کر اس ظلمت کدۂ کفر میں قدم رکھا ہے۔ یہاں صرف دو وقت کا کھانا اور پہننے کا کپڑا مل گیا اور اس سودے میں دین ہاتھ سے گیا تو یہ سودا بہت مہنگا ہے یہ تو اپنے آپ کو تباہی کے غار میں دھکیلنا ہے۔

ہاں! اگر یہاں رہ کر خود دین پر عمل کر کے اپنے عمل سے اسلام کی عظمت ثابت کریں اور ساتھ دوسروں کو بھی دعوت دیں تو یہ ہجرت الی اللہ بھی ہے اور للہ فی اللہ بھی اور اس پر جمالِ باری کی لذتیں نصیب ہو سکتی ہیں۔ اللہ کریم ہمیں اس کی توفیق بخشے، آمین۔

مغرب وہیں ادا کی پھر ایک دوست کے ہاں کھانا تھا۔ اس کا بہت بڑا گھر متعدد موٹریں اور شاندار رہائش دیکھ کر خوشی اس لیے ہوئی کہ وہ بہت باکردار پکا نمازی اور چہرے پر داڑھی بھی سجائے ہوئے تھا عشاء واپس آکر پڑھی دوست جمع تھے ذکر بھی کر لیا۔

اگرچہ باہر بارش اور سردی تھی مگر کمرے گرم رہتے ہیں ہر کمرے میں اس کے سائز کے مطابق ایک یا متعدد ریڈی ایٹر جیسے دیواروں کے ساتھ لگے ہوتے ہیں جن کا نظام مرکزی ہوتا ہے اور شہر کی میونسپلٹی وغیرہ کرتی ہے ان میں سخت گرم پانی گردش کرتا رہتا ہے اور یوں پورے کمرے کی فضا گرم رہتی ہے۔ برفباری کے دنوں میں لوگ اپنے گیس یا بجلی کے ہیٹر بھی چلا لیتے ہیں۔

بہرحال یہاں اس قسم کی سہولتیں بہت زیادہ بھی ہیں اور باقاعدگی سے ملتی بھی ہیں اگر یہاں لوڈ شیڈنگ شروع ہو جائے تو لوگ تو مر جائیں۔

اب آج کا دن شاید فارغ ہے دیکھیں کچھ ہوا تو آپ کو ضرور بتاؤں گا۔

اب اجازت، اللہ حافظ۔

۲۶، مئی

کل شام ہم ہیلی فیکس چلے گئے۔ بس یوں جانئے کہ بریڈ فورڈ کا جڑواں شہر ہے۔ ایک وادی عبور کریں تو آگے شروع ہو جاتا ہے۔

بہت گہری وادی ہے کافی اُترائی اترنا پڑتی ہے تو آگے خوبصورت پُل آتا ہے جو شہر میں داخل کر دیتا ہے میں سمجھا نیچے کوئی دریا ہے کہ یہ بھی اہلِ برطانیہ کا کمال ہے جسے ہم ندی کہتے ہیں اس پر یہاں دریا کا نام لکھا ہوتا ہے اور یہ تو کافی لمبا پُل بھی تھا۔ اور نیچے گہرائی بہت تھی۔

کچھ شام کا دھندلکا سا تھا اور دن بھر کی بارش کے باعث خنکی بہت تھی۔ ہم نے گرم جیکٹ اور شلوار تلے گرم پاجامہ پہن رکھا تھا۔ مگر ہمت کر کے باہر جھانک لیا تو ہم سڑک کی تیسری منزل سے گزر رہے تھے یعنی نیچے شہر کی سڑکیں تھیں اور اوپر تلے دو تھیں۔ خوبصورت سڑکوں اور روشنیوں کے سیلاب میں یوں لپٹا یہ شہر اپنا ایک الگ احساس رکھتا ہے اور اپنی علیحدہ بہار دکھا رہا تھا۔ مگر افسوس! کہ انسان اس پُرلطف موسم کو اندر بیٹھ کر ہی دیکھ سکتے ہیں۔ باہر نکل کر لطف اندوز نہیں ہو سکتے کہ جان کو خطرہ ہوتا ہے۔

بہرحال ہم ایک دوست کے گھر پہنچے، بہت شاندار گھر تھا اور بہت بڑا، خوبصورت

سجا ہوا۔ دراصل یہ شہر لندن کے بعد برطانیہ کے خوبصورت ترین شہروں میں دوسرے نمبر پر ہے اور ہمارے یہ دوست یہاں لوکل کونسل میں اہم عہدے پر فائز ہیں جو ایشیائی لوگوں کو بہت کم نصیب ہوتا ہے یہ اگرچہ پاکستان سے ایم اے کر کے آئے تھے مگر یہاں آکر پھر اس ملک کی یونیورسٹی سے کیا اور اب عرصے سے یہاں کام کرتے ہیں۔ ان کا بڑے سے چھوٹا لڑکا بھی ذکر کرتا ہے وہ بھی موجود تھا۔

شہر کی خوبصورتی سے زیادہ مجھے یہ بات خوبصورت لگی کہ اپنا ایک آدمی تو ثابت کر سکا کہ ہماری صلاحیتیں کسی سے کم نہیں۔

مغرب قریب تھی لہٰذا مسجد کو سدھارے، واقعی خوبصورت مسجد تھی۔ گنبد نما چھت اور چپٹا سا گنبد تھا یعنی باہر کی دیواروں سے شروع ہو کر آہستہ آہستہ بلند ہوتا جاتا تھا اور چاروں کونوں کی جگہ گولائی آتی جا رہی تھی۔ عین مرکز میں خوبصورت گول اُبھار کے اوپر چمکدار ہلال لگا ہوا تھا سامنے ایک مینار جس کی بلندی پر ہلکا سا گنبد اور اوپر ہلال تھا۔ مسجد کے گنبد نما چھت پہ سبز رنگ بہت پیارا لگ رہا تھا۔

پتہ چلا کہ اس مسجد میں ظہر کی اذان بلند آواز سے کہنے کی اجازت ہے۔ ورنہ یہاں اذان ہو یا خطبہ، درس ہو یا تقریر، سب کچھ مسجد کے اندر ہی ہو سکتا ہے۔ اور وہ دوست بتا رہے تھے کہ یہاں ارد گرد مسلمانوں ہی کے مکان ہیں۔ ساتھ ایک سمت نئے مکان بن رہے تھے جو لوکل کونسل ہی بنوا رہی تھی۔ اور وہ بتا رہے تھے کہ کوشش کر رہا ہوں کہ یہ سب بھی مسلمانوں کو دیے جائیں اور پھر ہم اجازت لیں گے کہ یہاں کسی کے آرام میں خلل واقع نہیں ہوتا لہٰذا پانچ وقت اذان کی اجازت دی جائے۔

لوکل کونسل یہاں ہر شہر یا علاقے کی مقامی حکومت ہے جو ایک با اختیار ادارہ ہے ٹیکس بھی لیتی ہے اور حکومت سے گرانٹ بھی۔ اور آبادی کی بہبود اس کی ذمہ داری ہے

اگر پارلیمنٹ قانون بنائے اور لوکل کونسل قبول نہ کرے تو بے اثر رہتا ہے بعض اوقات کونسل عدالت میں لے جاتی ہے۔ جو عموماً کونسل کی بات مان کر قانون کالعدم قرار دے دیتی ہے کہ ان لوگوں کو براہ راست متاثر ہونا ہے لہٰذا ان کا حق ہے کہ اپنی بہتری کے لئے سوچ کر قدم اٹھائیں اور یہ کونسلیں بہترین انتظام کرتی ہیں۔ اپنے یہاں کی یونین کونسلیں انہی کی نقل ہیں مگر صرف چلے ہوئے کارتوس اور حکومت کی خوشامد کے ساتھ عوام کے لئے نئی نئی مصیبتیں ایجاد کرتی رہتی ہیں۔ یہاں اصلی والی ہیں اور مفید و مؤثر بھی۔

یہاں مغرب کی ایک اور ادا بہت نرالی ہے شہر، محلے، مکان یا گھر سے کوئی محبت نہیں کرتا، جب والدین کی محبت نہیں، اولاد سے پیار نہیں، بہن بھائی کا رشتہ نہیں، تو دیواروں سے اُلفت کیا معنی رکھتی ہے۔ لہٰذا یہاں لوگ بڑے آرام سے مکان بیچ کر دوسرا خرید لیتے ہیں اور ملازمت یا روزگار کے لئے محلے کیا شہر بدل لیتے ہیں۔ نیز حالات کے ساتھ ساتھ بھی ان کو بدلتے رہتے ہیں پیسہ آگیا تو چھوٹا بیچ کر بڑا خرید لیا اور کم پڑ گیا تو بڑا گھر بیچ کھایا کبھی چھوٹے اور سستے گھر میں چلے گئے۔

عمارتوں کی دیکھ بھال بہت ہوتی ہے صدی سوا صدی پرانے مکان عام ہیں جس مکان میں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں یہ ۱۹۰۸ء کا بنا ہوا ہے کل ایک مکان پر ۱۷۹۴ء پڑھا جس کا بڑا دروازہ بڑے بڑے پتھر تراش کر مغل طرز تعمیر پر بنا ہوا تھا شاید صاحب بہادر ہندوستان سے کاریگر پکڑ لائے ہوں اور مزے کی بات یہ ہے کہ سب مکان زمانے کا ساتھ دیتے ہیں اس لئے کہ باہر کی چار دیواری اور چھت کے علاوہ سب کچھ اندر اندر تبدیل ہوتا رہتا ہے اور کمروں کی تقسیم عارضی دیواروں سے ہوتی ہے جن پر خوبصورت کاغذ چڑھا دیتے ہیں۔ آپ وقت کی ضرورت اور رواج کے مطابق کمروں کا سائز، تعداد اور اندر کی منازل بدل سکتے ہیں لہٰذا یہ گھر کبھی پرانے نہیں ہوتے اگرچہ باہر کی دیواریں اپنے گزرے ہوئے سالوں کی غمازی کرتی

ہیں۔ بہر حال چلئے! مسجد کے اندر چلتے ہیں۔ واقعی اندر سے تو اور زیادہ حسین ہے بریلوی مکتبِ فکر کے احباب ہیں لہٰذا رنگ برنگے چارٹ اور خوبصورت سلوگن لکھے ہوئے ہیں۔

مغرب ادا کی، ایک نوجوان مولانا صاحب نے پڑھائی اور پھر آدھ گھنٹہ فقیر کا خطاب تھا۔ آیہ کریمہ تلاوت کی جس کا مفہوم ہے "اللہ وہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا کہ اسے تمام ادیانِ عالم پر غلبہ حاصل ہو اور اس بات پر اللہ ہی کافی گواہ ہے" عرض کیا کہ،

"معرفتِ الٰہی انسان کی تخلیق کا مقصد ہے اور اس کا دروازہ معرفتِ نبوت ہے۔"

ذاتِ باری ہو یا صفاتِ باری، اللہ کا کلام ہو یا اس کی پسند و ناپسند، سب کا پتہ صرف اور صرف نبیِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ملتا ہے۔ علاوہ اس کے کوئی دروازہ ہی نہیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے حبیب ﷺ کو ہدایت یعنی ہر کام کے کرنے کا صحیح طریقہ عطا فرمایا ہے حتیٰ کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ہو اس کا جو سلیقہ وہ بتاتے ہیں وہی درست اور حرفِ آخر ہے۔ اور یہ بات سورج کی طرح واضح اور روشن ہے کہ دُنیا کا کوئی شخص ہو کسی ملک میں بستا ہو کوئی زبان بولتا ہو کسی استعداد کا انسان ہو آقائے نامدار ﷺ نے جو ادا ارشاد فرما دی ہے اسے اختیار بھی کر سکتا ہے اور اس پر کوئی اضافہ بھی نہیں کر سکا بلکہ آپ ﷺ کے ارشاد کے خلاف اُٹھنے والا ہر قدم بجائے خود غلط پڑتا ہے اور زندگی کو دشوار تر بناتا چلا جاتا ہے اور لُطف یہ ہے کہ آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق کام انجام دینا ہی دینِ برحق ہے۔ یعنی کرم کی انتہا یہ ہے کہ عبادات تو ایک طرف دنیا کے سارے کام بھی اطاعتِ الٰہی کا درجہ پا لیتے ہیں اور آپ ﷺ کو یہ نعمت اسی لئے عطا ہوئی ہے کہ مختلف ادیانِ باطلہ میں جکڑی ہوئی انسانیت کو اس

میں سکون ملے اور وہ اسے اپنا تی چلی جائے اور دو عالم کا سکون اور اطمینان حاصل کرے۔

تاریخِ انسانی اس پر گواہ ہے کہ آپ ﷺ نے اعلانِ نبوت فرمایا تو دنیا کا کوئی فرد اللہ کے نام سے آشنا نہ تھا بلکہ اپنی طرف سے اندازے مقرر کر رکھے تھے، پھر رفتہ رفتہ نورِ نبوت دِلوں کو منور کرنے لگا۔ تو ایک ایک کر کے آنے والے انسان آخر کار روئے زمین چھا گئے اور واقعی آپ ﷺ کے ارشاد کردہ طرزِ حیات نے روئے زمین پر مروجہ ادیان پر غلبہ حاصل کر لیا۔ یہ سب ایک تاریخی حقیقت ہے۔

"مگر اب ہمارا مسئلہ ذرا مختلف ہے اور وہ یہ کہ ہم اس نعمت سے محرُومی کے خطرے سے دوچار ہیں خصوصاً آنے والی نسل کو ہم منتقل کرتے نظر نہیں آتے نہ صرف یہاں بلکہ ملک میں بھی ایک تجربہ بتاتا ہے کہ اب آنے والے بچے ہم سے کچھ حاصل کرنے کی بجائے خود ہمیں بھی سادہ لوح اور دُنیا کی نعمتوں سے محرُوم تصور کرتے ہیں اور کچھ سیکھنے کی بجائے خود مشورہ دیتے ہیں آخر وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

یہ سوال سعودی فرمانروا شاہ فہد نے مولانا ابوالحسن علی ندوی سے گذشتہ سال کیا تھا، کہ ہمارے ملک میں حرمین شریفین بھی ہیں ماحول بھی دینی ہے قانون بھی اسلامی، مگر ہماری اولاد دین اسلام سے دُور ہوتی جا رہی ہیں جبکہ آپ لوگوں کو ایسی کوئی نعمت میسر نہیں، پھر بھی اولاد دیندار بن رہی ہے؟"

انھوں نے فرمایا،

"دین کا اصل سرچشمہ وہ قلبی حال ہے جو اہل اللہ کی مجالس سے نصیب ہوتا جس کا اہتمام ہمارے ہاں ہے اور آپ نے اپنی مملکت میں اس پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔"

واقعی یہ بہت درست جواب تھا کہ،

"دین محض الفاظ کا نام نہیں، اس میں کیفیات بھی ہیں جو قلوب کو قلوب
سے منعکس ہو کر نصیب ہوتی ہیں تب راہِ حق کی افادیت کھلتی ہے۔"

اور انسان اسے بے تابانہ اپنا لیتا ہے بلکہ طریقِ سُنّت کے بغیر کسی کام میں لُطف
تو کیا آئے گا بہت تلخی محسوس ہوتی ہے اور جن باتوں کو سجا کر پیش کر کے شیطان دھوکا
دیتا ہے ان کی اہمیت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے لہٰذا انسان کا کردار اتباعِ سُنّت کے
سانچے میں ڈھلتا چلا جاتا ہے ہم نے اس پہلو پر اپنے آپ کو دھوکا دے رکھا ہے اور محض
الفاظ سے دِل بہلانے کو اپنا شعار بنا لیا ہے خانہ پُری کرلی ہے اور فارغ ہو بیٹھے ہیں
یاد رکھیں!

"اللہ کے ایسے بندوں کی تلاش، جن کی مجلس میں دل کو روشنی نصیب ہو
قلب میں زندگی آئے اور اسے شعُور عطا کرے، ہماری ضرورت ہے ہمیں
چاہیئے کہ ہم ہر راہ رَو کے ساتھ چلنا شروع نہ کردیں بلکہ نہایت غور و خوض
سے اور پُوری ذمہ داری سے ایسے لوگوں کو تلاش کریں جو خود نہ صرف جادۂ حق
پہ گامزن ہوں بلکہ ان کی صُحبت جادۂ حق پہ چلنے کی سعادت سے بہرہ وَر
کردے اور ایک لُطف، ایک لگن عطا کرے جسے ہم اپنی آئندہ نسلوں کو
منتقل کرسکیں۔"

اور پھر سے اس چمن کو رونقِ بہار نصیب ہو، قلوب جب زندہ ہو جائیں تو وہ
مقصدِ حیات کی نشاندہی کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، تب وہ پوری قوت سے اُسے
پانے کی سعی کرتے ہیں ورنہ سوئے ہوئے دل اس راہ کی لذتوں سے ناآشنا رہتے ہیں
اور اگر دل مُردہ ہو جائے تو ایمان تک سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ کریم اس مصیبت سے
پناہ میں رکھے اور ایسے بندوں کی مجلس و صُحبت نصیب کرے جو دل کو حیات اور نور عطا

کردیں تاکہ ہم جادۂ حق پر گامزن ہوں۔

اب ساری بات تو حافظے میں موجود نہیں، مگر غالباً میں نے خلاصہ نقل کر ہی دیا
ہے پھر احباب کے ساتھ کھانا کھا کر واپس چلے تو گھر پہنچنے پر رات کے بارہ بج رہے
تھے۔ لہٰذا آرام کیا۔

آج صُبح کچھ سطور لکھی تھیں پھر آسٹر انڈرلین جانا ہوا جمعہ وہاں پڑھنا تھا کھانا بھی
وہیں تھا۔ یہ مضمون ادھورا چھوڑ کر چلا گیا۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو بانچسٹر سے ہو کر واپس
پہنچے عصر ادا کی اور بے سُدھ پڑ رہا۔ نقاہت نے بدن کو چُور چُور کر رکھا ہے۔ اب اٹھ کر یہ سطور
مکمل کیں اور مغرب ہو رہی ہے۔

اب تیاری کرتا ہوں جمعہ کی بات ان شاء اللہ صُبح۔

٢٧، مئی

ابھی تک کل کی تھکان باقی ہے اور اب زیادہ سفر کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ شاید جسمانی ٹوٹ پھوٹ کچھ زیادہ ہی ہو رہی ہے اس لئے کہ امراض نے بدن کو گھیر رکھا ہے اور ڈاکٹروں کے مطابق تو مجھے بالکل اٹھنا نہیں چاہیئے یا اٹھنے کی سکت نہیں ہونی چاہئے تھی مگر یہ اللہ کریم کی ذات ہے جو کام کی ہمت اور توفیق عطا کرتی ہے اور جنونِ عشق کا کمال ہے جو لئے پھرتا ہے ؎

شاد باش، اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب! جملہ علامت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے کہ افلاطون و جالینوس ما

اللہ کریم اس شعلۂ عشق کو سدا فروزاں رکھے! جو خرمن دل کو تو جلاتا ہے مگر راستہ بھی روشن اور واضح کر دیتا ہے اور درِ محبوب کی جھلک دکھا دیتا ہے۔

بہرحال یہ فسانۂ جمال آپ کے کس کام کا؟ دیوانوں کی طرح آپ کو باتوں میں الجھا دیا تو سنئے ہم کل آسٹرانڈرلین گئے۔ مین روڈ سے نکل کر پہاڑوں کے اوپر اوپر

سڑک جاتی ہے ہر طرف سبزہ پھیلا ہے گول گول ابھار سے ہیں اور ہر وادی کے دامن میں خوبصورت جھیل جیسے کسی حسین کے پہلو میں دل ہو۔ اتنی خوبصورت زمین پر ان نعمتوں کے خالق کو جاننے والے بہت کم خوش نصیب ہیں۔ اکثریت ابلیس کی فسوں کاریوں میں گرفتار، ہر آن گناہ کی دلدل میں نیچے ہی نیچے ڈوبتی جا رہی ہے۔

"زیادہ دکھ مسلمانوں کو دیکھ کر ہوتا ہے اور پھر ان میں سے ان نمازیوں پہ افسوس ہوتا ہے جن کے سجدے اپنی انا کے سامنے ہیں یا پھر چند پاؤنڈ حاصل کرنے کے لئے۔"

اس معاشرے میں تو پاؤنڈ ہی معبود کے طور پر لوگوں کا مقصد بن چکا ہے۔ جب مسلمان بھی وعظ کہیں یا سجدے کریں غرض صرف دولت کا حصول رہ جاتا ہے تو غیر مسلم سمجھتے ہیں کہ ہماری ہی منزل کا راہی ہے، ذرا لباس مختلف ہے اور طریقِ واردات میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اللہ کریم سب کو ہدایت دے اور خصوصاً مسلمانوں کو پھر سے دل زندہ عطا فرمائے! آمین۔

آدمی کسی شہر، قصبے یا بستی کی بات کرے یہ ضرور لکھنا پڑتا ہے کہ بہت خوبصورت ہے اور ضروریاتِ زندگی سے بڑھ کر زندگی کی آسائشیں اس کی گود میں پڑی ہیں، سڑکیں شفاف، فضا روشن اور مکان خوبصورت، لوگ صحتمند، چمکتے چہروں والے۔ بس صرف انہیں باطنی نگاہ سے دیکھنا نہ چاہیئے کہ پھر تو خنزیر، بندر اور اژدہے پھنکارتے نظر آتے ہیں وہاں ایک بزرگ نے گرجا خرید کر شاندار مسجد بنوائی ہے۔ پہلے والی مسجد میں ایک مولوی صاحب نے مسلمانوں کو لڑا کر دور کر دیا تھا۔ بہت خوبصورت اور کھلی مسجد ہے۔

قرآن حکیم میں سورۃ بقرہ کی پہلی آیت تلاوت کی جس کا مفہوم ہے، قرآن حکیم ایسی عظیم الشان کتاب ہے جس میں رائی برابر شبہ نہیں۔

اور یہ بہت بڑا دعویٰ ہے اس لئے کہ قرآن حکیم نے زندگی کے ہر موضوع پر اپنی رائے اور فیصلہ دیا ہے خصوصاً دُنیا بھر کے علوم جو فلاسفروں، سائنسدانوں اور کیمیادانوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ انسان کے وجود میں آنے سے شروع ہو کر اس کی موت پر ختم ہو جاتے ہیں جبکہ قرآن حکیم تخلیق ارواح اور عالم امر سے انسانیت کو زیر بحث لاتا ہے اور زندگی موت، مابعد الموت، حشر اور ابدی زندگی تک پوری تفصیل سے بات کرتا چلا جاتا ہے۔ آج تک ان حقائق کو کوئی چیلنج نہیں کر سکا۔

ممکن ہے کہا جائے کہ موضوع ہی ایسا ہے جس پر بات نہیں ہو سکتی تو دوسرے بے شمار موضوع ہیں جو انسانی زندگی سے متعلق ہیں مثلاً جن چیزوں کو قرآن نے حرام قرار دیا ہے آج تک میڈیکلی انھیں انسانی جسم کے لئے مفید ثابت نہیں کیا جا سکا۔ بلکہ اُلٹے اُن کے مضر اثرات روز بروز سامنے آتے جا رہے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ جس دَور میں قرآن نازل ہوا، عرب اہل زبان کا گہوارہ تھا، اگرچہ لکھنا پڑھنا جاننے والے بیشک کم تھے مگر زباندانی میں دُنیا کی تمام قومیں ان سے پیچھے تھیں۔ عام بدو اور کنیزیں تک بات بات پہ شعر موزوں کر دیتے اور اتنے خوبصورت اشعار ہوتے تھے کہ آج تک عربی ادب کی زینت ہیں قرآن کریم نے اعلان فرمادیا کہ اپنے سوا ساری اقوام کو عجم یعنی گونگا کہنے والو! اگر دم ہے تو قرآن کریم کے مقابلے میں ایک جملہ موزوں کر کے لاؤ! اور اپنے مزعومہ خداؤں کو بھی مدد کیلیے بلا لو مگر تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے۔ اور آج تک کوئی ایسا نہ کر سکا۔ حتےٰ کہ قرآن نے فرمایا کہ اللہ کا کلام ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ اور آج تک کفر کی ساری کوششوں اور سر توڑ کوششوں کے باوجود، بحمد اللہ محفوظ ہے اور رہے گا۔

پھر اس کے ساتھ دنیا کے ہر موضوع پر وہ سیاسی ہو، اقتصادی ہو یا تہذیبی سب پر کھل کر بحث بھی کی ہے اور اپنا فیصلہ بھی دیا ہے اور ہمارے سامنے ہے کہ

روزانہ سائنسدانوں کی تحقیقات اور نتائج بدلتے ہیں اور بعد والے پہلوں کو غلط ثابت کرتے رہتے ہیں مگر قرآن کے طے کردہ اصولوں کو کوئی جھٹلا سکا نہ ان سے بہتر رائے پیش کر سکا۔

یہ امر بھی ہمارے سامنے ہے کہ ملک کے نامور لوگ اپنے ملک کے لئے ایک قانون، وہ معاشی ہو یا تہذیبی طے کرتے ہیں مگر وہ کامیاب نہیں ہوتا اور پھر اس میں ترمیم کرنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے مگر قرآن کریم نے روئے زمین پر بسنے والی انسانیت کے لئے سارے نظام بنا کر دیتے جو ہر حال میں، ہر موسم، ہر ملک اور ہر قوم کے لئے اور ہمیشہ کے لئے قابل عمل ہیں۔ اور سب سے بڑا اعجاز خود آپ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ یتیمی کا بچپن سب کے سامنے تھا۔ لڑکپن اور جوانی سے سب آگاہ تھے اور چالیس برس کی عمر عزیز، ان لوگوں کے روبرو تھی جس میں آپ ﷺ نے کسی انسان سے کچھ نہیں سیکھا مگر جب لب ہائے مبارک وا ہوئے تو دنیا و آخرت کی حقیقتیں ارشاد فرماتے چلے گئے جنھیں کبھی کوئی جھٹلا نہ سکا اور نہ ایسا کر سکے گا۔

پھر تاریخی پیش گوئیاں، جو نزول کے وقت بظاہر ناممکن نظر آتی تھیں، مگر وقت آنے پر حرف بحرف سچ ثابت ہوئیں۔

مسلمانوں نے یہ سب کچھ دلوں میں سمویا، اُجڑے دلوں میں بہار آئی اور اسلام کا نغمہ جانفزا ایک عالم میں پھیل گیا۔ مگر آج ہماری حالت قابل رحم ہے اور رشدی کے روپ میں شیطان ہماری دینی غیرت کی دھجیاں بکھیر رہا ہے۔ بڑے لطف کی بات ہے کہ،

"اسی قرآن پاک میں اللہ کا وعدہ ہے کہ اگر تم ایمان پر قائم رہے تو ہر میدان میں کامیابی تمھاری ہے"

اور یہاں حال یہ ہے کہ ناکامیاں مقدر بن چکی ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ دو فریقوں

میں معاہدہ ہے اور دونوں فریق موجود بھی ہیں مگر معاہدے پر عمل نہیں ہو پا رہا تو یقیناً ایک فریق اس کی شرائط پوری نہ کر رہا ہوگا۔ ایک فریق ذاتِ باری ہے اور اس کی ذاتِ والا صفات کی شانِ عالی سے بعید ہے کہ وہ ایسا کرے۔ دوسرا فریق ہم ہیں تو کیا ہم تقاضائے ایمان پورے کر رہے ہیں؟۔

یہ وہ سوال ہے جو ہم میں سے ہر ایک کو اپنے ساتھ کرنا چاہیئے اور جہاں جہاں کمی ہے اس کو دُور کرنے کی بھرپور کوشش کرنا ضروری ہے۔ یاد رکھیں! اگر ہم نے محض ذاتی زندگی تک یہ عہد نباہنا گوارا کر لیا تو ذاتی زندگی کامیاب ہو جائے گی اگر قومی زندگی میں ایسا کر گزرے تو قومی زندگی کامیابیوں سے ہمکنار ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز۔

اب یہ مسلمانوں کی تضحیک کا جرم تو شاید ہمارے اپنے ہی ذمہ پڑ رہا ہے لہٰذا ہمیں پُوری محنت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرنا اور دلوں کو نورِ ایمان سے عمل کو اتباعِ سُنت سے روشن کرنا ہوگا۔ اللہ کریم اس کی توفیق بخشیں، آمین۔

نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھایا اور وہاں سے مانچسٹر گئے احباب کو کوئی کام تھا۔ واپسی چار رویہ سڑکوں پر ٹریفک جام ہو رہی تھی اور میلوں تک بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ ایک گاڑی رُکتی تو دس دس میل پیچھے گاڑیاں رُک جاتیں۔ شاید دو چھٹیاں اکٹھی آ گئی تھیں اور کچھ لوگ تو ویسے ہی شمال کے جو گھروں کو رواں تھے۔ دوسرے باہر چھٹیاں گزارنے جا رہے تھے۔ لہٰذا عصر کو یہاں پہنچے۔

یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے اور عجیب غریب کام ہوتے ہیں بوڑھوں کے لئے "اولڈ ہوم" اچھی تجارت ہے اسی طرح بچوں کی نگہداشت کے مراکز ایک تجارت ہے ساتھ جوان لڑکیوں کے لئے دارالامان قسم کا اجازت نامہ حاصل کر لینا بھی ایک فائدہ مند کاروبار ہے مثلاً جوان بچیاں گھروں سے بھاگ جاتی ہیں تو پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر وہ

خوشی سے کسی کے ساتھ رہ رہی ہیں تو پولیس انہیں پریشان نہیں کرتی بلکہ والدین کی اطلاع پر انہیں تلاش کر کے پتہ کرتی ہے اگر وہ ناخوش نہ ہوں تو والدین کو خیریت بتا دیتی ہے پتہ نہیں دیتی۔ کہ انہیں پریشان نہ کریں پھر بعض اوقات انہیں دوست دھوکا دے جاتے ہیں یا اُن سے خوش نہیں رہتیں تو پولیس کو اطلاع کرتی ہیں وہ انہیں اس آدمی کے گھر چھوڑ آتے ہیں جس کے پاس کونسل سے دارالامان کا اجازت نامہ ہو اور یوں زیادہ سے زیادہ دو ہفتے وہ وہاں رکھی جاتی ہیں اور جتنے روز وہ اُس کے گھر رہتی ہیں کونسل اُن کا بل ادا کرتی ہے پھر ان کی پسند کے مطابق کونسل فیصلہ کرتی ہے کہ انہیں کس جگہ چھوڑا جائے؟ کبھی دوست کے ساتھ واپس چلی جاتی ہیں کبھی والدین کے ساتھ اور کبھی کبھی اس گھر پہ کئی دعویدار آ دھمکتے ہیں پھر گھر والوں کو پولیس بُلانا پڑتی ہے۔

جہاں ہم ٹھہرے ہوتے ہیں سامنے ہی ایک ایسا گھر ہے وہاں پولیس وغیرہ دیکھ کر پوچھا تو پتہ چلا کسی لڑکی کے پیچھے کوئی لڑکے آئے ہیں تو انھوں نے پولیس طلب کی ہے۔

بہرحال یہ یہاں کی زندگی ہے اسی لئے جس پاکستانی کی بچی جوان ہو جائے اُسے بھتیجے اور بھانجے پیارے لگتے ہیں۔ اور فوراً پیچھے سے بُلانے کی سعی کرتا ہے۔ مگر اب دامادوں کی درآمد پہ پابندی لگ گئی ہے اور باہر کے آبادکاروں کی پریشانی اور زیادہ ہو گئی ہے پہلے تو پاکستان جا کر نکاح کرتے اور بچی چونکہ برطانیہ کی شہری ہوتی تھی لہٰذا خاوند کو ساتھ لا سکتی تھی یا بچہ وہاں شادی کر کے بیوی کو لا سکتا تھا مگر اب صُورتِ حال بدل گئی ہے۔ اب شرط یہ ہے کہ جو بھی ایسا کرنا چاہے وہ کم از کم ایک سال سے برسرِ روزگار ہو اور دُوسرے کا خرچہ برداشت کر سکتا ہو، نیز اس کا ذاتی مکان بھی ہو۔ اس شرط نے تمام بچیوں کو کارخانوں میں مزدوری پہ مجبور کر دیا ہے اور ایسے لوگ بھی جو ابھی تک بچیوں کو مردوں کے ساتھ مخلوط طور پر کام پر لگانے کے حق میں نہ تھے بے بس اور مجبور ہو چکے ہیں۔

آج احباب کا خیال تھا کہ بازار چلیں مگر طبیعت نہ چاہی تو نہ جا سکا کہ بہت کچھ دیکھ رکھا ہے اب مزید کیا دیکھیں گے؟

رات ایک پاکستانی خود ساختہ جلا وطن سے ملاقات ہوگئی تو ایسے سیاسی پناہ گیروں کے حالات سُننے کا اتفاق ہوا، جو میں نے سُن تو لیا مگر لکھ نہیں سکتا۔ شاید مجھ میں بات دُہرانے کا حوصلہ نہیں اور اس سے مُلکی قیادت کے اخلاقی پہلو کی تصویر کی جھلک نظر آئی۔ اللہ کی پناہ! کیا ہم اتنے ہی بے حس، ضمیر سے عاری اور عقل کے اندھے ہو چکے ہیں واقعی ؎

یہ کام ہیں اُنھیں کے کہ جن کے حوصلے ہیں زیادہ

۲۹ مئی

کل کچھ نہیں لکھ سکا، اس لئے کہ کل میں باہر (یعنی Outing) پر گیا تھا۔ باقی سارے احباب گلاسکو گئے تھے۔ وہاں مسلمانوں کے بچوں نے جو یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں اپنی تنظیم بنا رکھی ہے جو ہے تو سارے برطانیہ میں۔ مگر وہاں کے احباب نے دعوت دی تو میں نہ جا سکا کہ بہت لمبا سفر ہے اور صُبح جا کر شام واپس آنا بہت تھکا دینے والا کام تھا اور میرے بس سے باہر۔ چنانچہ باقی احباب گئے رات بارہ بجے واپس آئے ان کی ملاقات ہوئی ذکر کی اہمیت و ضرورت بتائی اور ان بچوں کو ذکر کرنا سکھایا۔ کچھ دوسرے لوگوں سے ملے جو پچھلے سال سے واقف تھے۔ بہرحال جو ان کے بس میں تھا کر آئے ہیں۔ نتائج پیدا کرنا اللہ کریم کا کام ہے۔

یہاں سے شمال کو چلتے جائیں تو آبادی کم ہوتی جاتی ہے اور دُور دُور تک سبز وادیاں، بہت پُرلطف نظارے پیش کرتی ہیں اور جنگل بھی ہیں جن میں کہتے ہیں شکار بھی ہوتا ہے مگر یہ سب کچھ دیکھ نہیں سکا۔ اور سُنی سنائی کا کیا بھروسہ، بہرحال شنید ہے ضرور، اور ہاں! ہم کل باہر گئے تین احباب مقامی تھے اور میں اکیلا۔ یہاں سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ایک پُرانا محل ہے جو کسی نے خرید کر وہاں "ڈزنی لینڈ" جیسی تفریح گاہ بنائی ہے، ڈزنی لینڈ

تو خیر بہت عجیب ہے بہر حال یہاں بھی اس نے کوشش کی ہے اور بہت خوبصورت تفریح گاہ بنائی ہے۔ اندرون ملک شاداب وادیوں میں گھرا ہوا ایک قدیم محل ہے جو سارا پتھروں سے بنا ہوا ہے اور انگلستان کے محلات کا مخصوص طرزِ تعمیر یہاں بھی نمایاں ہے گرداگرد باغ جھیل اور خوبصورت مناظر ہیں جن میں رنگا رنگ تفریحی سامان لگا دیا گیا ہے خوبصورت کشتیوں اور بچوں کے بے شمار قسم کے مشاغل بجلی کی موٹروں اور جھولوں کے ساتھ کھانے پینے اور کھلونوں کی دکانیں ہیں۔

جب ہم پہنچے، تقریباً ڈیڑھ بج رہا تھا اور تین کار پارک بھر چکے تھے۔ چوتھے میں ہمیں جگہ ملی۔ پچاس گاڑیاں ایک رو میں تھیں اور ہماری باری چوبیسویں رو میں آئی۔ اندازاً تیس رو بن سکتی تھیں۔ اس طرح کاروں کی اوسط چھ ہزار بنتی ہے اور ہزار کے قریب بسیں بھی کھڑی تھیں۔ استقدر بھیڑ شاید دیگر ایام میں تو ممکن نہ ہو مگر چھٹی کے دنوں میں اوسط یہی ہے کم و بیش بیس ہزار مرد خواتین تو ہوں گے جن میں خال خال بچے اور اکا دکا عمر رسیدہ تھے سب جوان لڑکے لڑکیاں ہی تھیں۔ لباس نام ہی کے تھے چھوٹی سی جانگیا اور انگیا یا ہلکی بنیان، اور جوانوں کا لباس ایک مختصر جانگیا تھا۔

زمین کے خوبصورت قطعات پر انسان کی غیرت ابلیس کے پاؤں تلے تھی، اور تہذیب مغرب کی بدتہذیبیاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر کوئی ایک ہی رنگ میں مست تھا اور کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ اپنی تمام تر بے حجابیوں کے باوجود ابھی امریکی معاشرے سے یہ لوگ پیچھے ہیں۔ وہ اس ذلت میں بہت آگے نکل چکے ہیں۔

ہم نے بھی ساری سیرگاہ کا ایک چکر لگایا اور واپس روانہ ہوئے۔ کار پارک سے سیرگاہ تک تو نئی قسم کی ریل کار کا سفر تھا۔ پھر بھی ہم چار بجے کار کے پاس پہنچے کھانا نکالا وہیں پارک میں کھانا کھایا ظہر ادا کی اور واپس چلے۔ عصر گھر پہنچ کر ادا کی اور بہت سی تھکاوٹ

ساتھ لائے، ذہن اور ضمیر بھی تھک چکا تھا اور بدن بھی چور چور ہو رہا تھا۔

دراصل ان لوگوں کا مقصدِ حیات ہی یہ آزاد سیرگاہیں بن چکی ہیں اور یہ اسی لئے پس انداز کرتے ہیں جو زیادہ بچا لیتا ہے وہ کسی دوسرے ملک چلا جاتا ہے۔ ورنہ ملک کے اندر ایک دن مل جائے یا زیادہ۔ بڑے پُرجوش انداز میں چھٹی منا کر خوش ہوتے ہیں، سیر کرتے ہیں کھاتے ہیں اور غمِ زمانہ کو خود سے دُور رکھنے کے مختلف حیلے بھرپور طریقے سے کرتے ہیں اگر متعہ عبادت ہے تو یہ سارے اوّل درجے کے مقبول بندے کہے جا سکتے ہیں۔ یہ حال مقامی لوگوں کا ہے،

"باہر سے آنے والوں کے لئے صرف ایک ہی صورت ہے، کام، کام اور بس کام، جو ملے اس میں سے کچھ کھا کر کچھ پس انداز بھی ضروری ہے کہ ملک میں برادری رشتہ دار، سب یہی جان رہے ہوتے ہیں کہ ولایت میں کام کرتا ہے بہت امیر آدمی ہے اور ایسا ہوتا بھی ہے۔ یہاں سے پاؤنڈ بچاؤ تو وہاں روپوں میں تبدیل ہو کر وہ بہت زیادہ ہو جاتے ہیں لہٰذا یہاں کی تھوڑی تھوڑی بچت بھی وہاں بنک بھر دیتی ہے لیکن دیکھا یہ ہے جب ان لوگوں نے واپس جا کر وہاں آباد ہونے کی کوشش کی تو بنک بہت جلد خالی ہو گئے اور کام بھی نہ چل سکا۔ لہٰذا اکثریت کو پھر واپس بھاگنا پڑا۔"

میرپور کے ایک آدمی نے یہاں سے جا کر وہاں بھٹہ خشت بنایا تھا۔ ہم سے کوئلہ خریدا کرتا تھا چھوڑ کر بھاگا تو اطلاع تک نہ دی۔ ہماری رقم بیس ہزار روپے ابھی تک اُس کے ذمہ ہے۔ جو ادا کرنے کے لئے شاید اب وہ کبھی نہ جا سکے گا۔ کہ وہ پہلا تجربہ دُہرانے کی حماقت کیوں کرے گا؟

بہر حال یہ برطانیہ ہے اور یہاں ایسا ہی ہوتا ہے اور ہمارے ہاں بفضل اللہ پاکستان ہے اور وہاں کے اپنے مسائل ہیں جن میں سرِ فہرست حصولِ زر ہے جس سے بلے اور جیسے بن سکے۔ صرف ایک طبقہ مادی لحاظ سے بہت فائدے میں رہتا ہے جس کی دو کلاسیں ہیں (الف) پیرانِ عظام۔ اور (ب) علمائے کرام۔ ان کو فائدہ یہ ہے کہ انھیں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ بس باتیں کرتے اور ان کی اُجرت پاتے ہیں اور جتنا بھی کما لیں وہ سارے کا سارا خالص منافع ہوتا ہے۔ ہر طبقے میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یقیناً اچھے اور مخلص لوگ اس طبقے میں بھی ضرور ہوں گے مگر اکثریت پیشہ ور حضرات کی ہے جن کے متعلق میں نے پچھلے سفر میں ایک چھوٹا سا تجزیہ لکھا تھا، "فاتحین کی جولانگاہیں اور برطانوی مسلمانوں کا مستقبل" کوشش ہو گی کہ وہ بھی اِس کتابچے کا حصّہ بن جائیں۔

بہر حال پاکستانیوں کی ایک نسل جو عمر کے آخری مراحل میں ہے اور پنشن پاتے ہیں یا کاروبار کرتے ہیں ان کی سوچ یہ ہے کہ کسی طرح ملک واپس جا کر اگر وہاں کوئی صورت گذارہ کی بن سکے تو بہتر اور آخری طریقہ ہے۔ اس لئے کہ ان کی اولاد جو یہاں پیدا ہوئی، پلی بڑھی وہ بھی بمشکل ہی اُن کے ہاتھ میں ہے لیکن اگلی نسل، جو اس اولاد سے ہو گی، کا انھیں قطعاً کوئی بھروسہ نہیں۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ نسل کسی اسلامی قدر کو اپنا لے گی؛ لہٰذا اب وہ اگر یہاں سے وطن چلے جائیں تو کم از کم اپنی آئندہ نسل کو بچانے کی مثبت کوشش کر سکتے ہیں۔ مگر ملک کے حالات اِتنے مشکل ہوتے جا رہے ہیں کہ جو لوگ وہاں ہیں وہ کسی اور طرف نکل جانے کی سوچتے ہیں۔ باہر رہنا اتنا آسان بھی نہیں۔

آج یہاں کمیونٹی سنٹر میں بیان کرنا ہے جس کا وقت غالباً ظہر کے بعد رکھا گیا ہے اللہ کریم نیک توفیق عطا فرمائیں! آمین۔

اب سُنیئے! کمیونٹی ہال کے بارے، تو جناب! ہم ٹھیک تین بجے اپنے پروگرام کے

مطابق وہاں پہنچے۔ برطانیہ کے ماحول کے مطابق اجتماع بہت اچھا تھا۔ تقریباً ساڑھے تین بجے بات شروع ہوئی پہلے کچھ دیر ویڈیو کیمرہ والے نے لے لی پھر تلاوت ہوئی۔

القصہ بات کا موضوع "عبادات اور ان کا ماحصل" تھا۔ آیہ کریمہ سورۃ بقرہ سے تلاوت کی جس کا مفہوم ہے کہ "اے اولادِ آدم! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تمھیں پیدا کیا، تم سے پہلوں کو بھی تاکہ تم متقی بن سکو۔"

قرآن حکیم کے اس اندازِ بیان نے تقویٰ کو عبادات کا حاصل قرار دیا ہے جس کا معنی اُردو میں "ڈر" کیا جاتا ہے۔ یہ بات اس حد تک تو دُرست ہے کہ ڈر ہی مراد ہے مگر ڈر کی کونسی قسم؟ تو یہ ڈر ایک محبت اور پیار کے تعلق کو چاہتا ہے۔ ایسا ڈر جو کسی کے رُوٹھ جانے کا ہو اور جس کا روٹھ جانا گوارا نہ ہو۔ مثلاً آپ لوگ یہاں سے دور دراز بستے ہیں۔ مُلک میں اگر کسی کو آپ سے ایسا تعلق ہو کہ وہ کام کرنے سے پہلے آپ کی پسند کا خیال کرے اور اگر آپ کو پسند نہ ہو تو آپ کے خفا ہونے کے ڈر سے اُسے چھوڑ دے خواہ خود پسند بھی کرتا ہو۔ یہ کیفیت، جب اللہ کریم کے ساتھ نصیب ہو تو اِسے تقویٰ کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں، عام طور پر مشہور ہے کہ عبادت اُدھاری مزدوری ہے۔ دُنیا میں صرف مشقت کرنا ہے آخرت میں اس کا بدلہ ملے گا۔ میں اِس بات کا قائل نہیں ہو سکا اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ربِ جلیل نے انسان کو یہ حکم دیا ہے کہ مزدُور کو پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی اُجرت دے دی جائے تو خود اُدھار کیوں کرنے لگا؟ اور یہ آیہ کریمہ بھی اسی بات پہ دلالت کرتی ہے کہ،

"تمام عبادات کا فوری بدلہ جو انسان پاتا ہے وہ یہی صفت ہے جسے تقویٰ کہا گیا ہے۔"

اِس لئے کہ ساری تخلیق انسان کی خدمت پہ لگی ہے اور انسان کا مقصدِ تخلیق

اللہ کی ذات اور اس کی صفات کی پہچان ہے جس کا اسے شعور عطا ہوا ہے اور اِس پہچان (یا اصطلاح میں جسے معرفت کہتے ہیں۔) کا مدار قلبی کیفیت پر ہے ورنہ حواسِ ظاہری کے ادراک سے وہ ذات بہت بلند ہے اور جو ذات حواس کی قوت سے بالاتر ہے۔ انسان اس کے ساتھ بھلا کیسے رشتہ قائم کر سکتا ہے؟ اور رشتہ بھی اتنا نازک کہ محبت کہیں جسے لہٰذا اس کے قیام کے لئے عبادات عطا فرمائیں۔ کہ ان کے نتیجے میں دل میں ایسی کیفیت پیدا ہو جائے کہ انسان آنکھوں سے نظر نہ آسکنے والی ذات کو دیکھ رہا ہو۔ کیسے؟ پتہ نہیں! اپنے پاس محسوس کر رہا ہو۔ اس کے جمال پر فدا اور اس کے کرم کا شیدائی ہو۔ اور فریفتگی کمال اطاعت پیدا کر دے۔

اس کے حصول کے دو ہی طریقے ہیں۔ برکاتِ نبوی اور تعلیماتِ نبوی۔

چونکہ فرائضِ نبوت میں ہے کہ دعوت الی اللہ، تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت۔ لہٰذا دعوتِ عام ہے جو قبول کرے اس کا تزکیہ اور پھر تعلیم کہ عمل کر سکے۔

ان برکات کے حصول کا سبب صحبتِ نبوی تھی کہ جسے ایک پل نصیب ہو گئی۔ اس کا تزکیہ ہو گیا اور وہ صحابی کہلایا۔ دوسرا طریقہ تعلیماتِ نبوت ہیں کہ کسی تک پہنچیں تو اس نے ان پر خلوص سے عمل کیا اور اپنی حیثیت کے مطابق متقی تو بن سکا، صحابی نہ بن سکا۔ شرفِ صحابیت کا کمال یہ ہے کہ تعلیمات ہی اس کی جان بن گئیں اور وہ ان سے باہر جانے کی سوچ بھی نہ سکا۔ لہٰذا یہ طریقہ زود اثر بھی ہے اور زیادہ مؤثر بھی۔ اسی طرح صحابہ کی صحبت میں تابعی اور سینہ بسینہ اولیاء اللہ کا تذکرہ ملتا ہے جو دلوں کی روشنی صحبت اور مجلس میں رہ کر حاصل کرتے رہے۔ اس طرح جو کیفیت نصیب ہوئی وہ زیادہ مؤثر بھی ثابت ہوئی اور درجہ کے لحاظ سے بھی بہت بلند۔ یا پھر دوسرا درجہ کہ صحبتِ صالح تو نصیب نہ ہوئی مگر خالص تعلیمات حاصل ہوئیں اور ان پر خلوص سے عمل کرنا شروع کیا تو رفتہ رفتہ

ایک تعلق جو محبت کا تھا۔ ذاتِ باری سے بڑھتا گیا اور یوں انسان نے اپنا مقصدِ تخلیق پا لیا۔ جہاں تک اُخروی اجر کا تعلق ہے وہ درست اور بجا مگر درحقیقت وہ سارا محض اللہ کا انعام ہے۔ کہ اس آیہ کریمہ میں جو فلسفہ دیا گیا وہ یہ ہے کہ اللہ تمہارا خالق بھی ہے اور رب بھی۔ یعنی پیدا کرنے والا بھی اور پالنے والا بھی۔ اس کی اتنی نعمتیں تمہیں پہلے سے حاصل ہیں کہ عمر بھر سجدہ ریز رہو تو صرف ان کا شکر ادا نہیں کر سکتے۔ ہاں! عبادت سے تمہیں جو محبت نصیب ہوگی اس پر آخری دائمی اور حقیقی زندگی میں بھی بے شمار انعامات عطا ہوں گے۔

اس لئے ہمیں اپنی عبادات کا جائزہ اس انداز سے لینا چاہیئے کہ اگر ان کے طفیل میرے دل میں اللہ کی محبت، اطاعت کی رغبت اور گناہ سے نفرت پیدا ہو رہی ہے تو پھر تو نتیجہ حاصل ہو رہا ہے۔ مگر سب کچھ کر کے بھی اگر ہمیں نہ عقیدہ کی اصلاح نصیب ہو نہ عمل کی درستی، تو پھر شاید ہم عبادت کے نام پر محض رسومات نبھا رہے ہیں۔ اور اس بارے میں دوسروں پر تنقید محض بے کار ہے کہ اپنے دل کا حال ہر شخص خود ہی بہتر جان سکتا ہے اور اس کی اپنی رائے ہی اپنے متعلق زیادہ صحیح ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنا اور اپنی عبادات کا جائزہ لینا ہوگا،

"اسلام انسانیت سے محبت کا مذہب ہے گناہ سے دُور کرتا ہے مگر انسانوں کے قریب لاتا ہے۔"

اور ہم بحیثیت اُمت اس بات کے مکلف ہیں کہ اللہ سے دُور اور اس کے نام سے محرُوم لوگ ان کے پاس اجازت حاصل کرنے آتے ہیں۔ مولوی ملازمت لینے آتا ہے۔ پیر اپنا کام چلانے میں ان کے تعاون کا محتاج ہوتا ہے۔

یہ لوگ پھر بھی ان کی زبان سے اپنے ناپسندیدہ اشخاص پر فتووں کے گولے برساتے :

اور خوش ہوتے ہیں۔ ان کی انا تسکین پاتی ہے خواہ اُمتِ مُسلمہ کا خون بہتا رہے
انھیں اپنے کام سے کام ہے۔ اللہ کریم سب کو ہدایت ہی نصیب فرمائیں!
اب ممکن ہے لندن میں کچھ لکھ سکوں، یا پھر جہاز میں، ورنہ نیویارک۔
اللہ حافظ۔

۳۱، مئی

TWA کی فلائٹ نمبر ۷۰۳ پر لندن سے پرواز کئے ڈیڑھ گھنٹہ گذر چکا ہے اوپر آسمان نیچے سمندر ہے۔ سات گھنٹے پرواز کے بعد جب سمندر ختم ہوگا۔ ہم نیویارک پہنچ چکے ہوں گے، انشاءاللہ العزیز۔

کل صبح پانچ بجے بریڈفورڈ سے روانہ ہوا، باقی احباب پرسوں شام روانہ ہو چکے تھے مگر مجھے بھی ساتھ چلنا تھا اور ہمیں وٹ فورڈ میں جو لندن کا ہی حصہ ہے، قیام کرنا تھا مگر تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی لہٰذا صبح روانگی کا پروگرام بنایا اور ساڑھے آٹھ بجے وٹ فورڈ پہنچ گئے۔ ناشتہ وہاں کیا اور کل کے ملاقاتیوں میں سے جو دوبارہ آسکے تھے ملاقات ہوتی۔ ذکر کی محفل کی سعادت نصیب ہوئی اور یوں گیارہ بجے چل کر ایک بجے وہاں پہنچے جہاں لندن ہی میں دوپہر کا کھانا تھا۔ گھنٹہ بھر آرام کا مل گیا۔ زاہد اور منیر کے بچے بھی ساتھ تھے کہ خواتین ہی خواتین کو بات پہنچائیں۔

اڑھائی بجے سب احباب وہاں پہنچے، انھیں کچھ کام کرنے تھے، کچھ رقوم ڈالرز میں تبدیل کرانا تھیں، شاید خریداری بھی کرنا تھی۔ یوں انھوں نے ملکہ کا محل بھی دیکھا۔ ٹاور برج سے گزرے جو ایک عجوبہ ہے۔ دریائے ٹیمز لندن شہر میں بہتا ہے۔ کئی جگہ

سے اس کے نیچے سے سڑک گزاری گئی ہے اور اُوپر بھی پل ہیں، مگر ٹاور برج بہت خوبصورت بُرجوں کے درمیان بہت کشادہ بنا ہوا ہے۔ اگر جہاز گزارنا ہو تو اسے اُٹھا دیا جاتا ہے۔ درمیان سے آدھا ایک طرف اور آدھا دوسری طرف بُرجوں کے ساتھ استادہ ہو جاتا ہے پھر گرادیں تو پُل اور سڑک بن گئی۔

وزیرِ اعظم کی سرکاری رہائش گاہ اور آکسفورڈ سٹریٹ بھی یہ لوگ دیکھ کر آئے۔ یہ بازار تقریباً میل بھر لمبا مگر بہت بڑا مرکزی اور مصروف بازار ہے۔ لاکھوں لوگ، بڑے بڑے سٹور، بنک اور تجارتی کمپنیاں اسی کی زینت ہیں۔ یہاں برطانیہ کی تہذیب جدید کا ہر پہلو سامنے آجاتا ہے۔ نیم برہنہ بھی اور برہنہ بھی۔ یوں تو لندن اور برطانیہ کی آبادی میں پب (PUB) موجود ہیں مگر اس بازار کے پب بے حیائی کی تمام حدود سے بے نیاز ہیں، ویسے بھی وہاں باپ بیٹی، ماں بیٹا، بھائی اور بہن بیک وقت دیکھے جا سکتے ہیں جو تمام تہذیبی اور اخلاقی قیود سے آزاد اپنے اپنے حال میں مست جام پہ جام لُنڈھا رہے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود پاکستان سے یہاں آنے کا شوق پاکستانیوں میں تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں کسی کی والدہ فوت ہو گئی۔ اُس نے میت پاکستان روانہ کرنے کے لئے تیار کرائی تو کفن میں برطانوی پاسپورٹ رکھ دیا کہ کوئی (جس کے لئے تھا۔) پاکستان سے آسکے مگر اس قدر بیہودگی کے باوجود کامیاب نہ ہو سکا۔ کہ ہوائی اڈے پر بکس اور کفن کھول کر وہ نکال لیا گیا۔

ایک مسلمان سگی بہن کا فرضی نکاح ظاہر کر کے اور کاغذات میں اُسے بیوی بنا کر لے آیا کہ کونسل کی طرف سے مکان اور الاؤنس ملے گا۔ پھر یہ بھی کہیں مزدوری کر لے گی مگر لوگ کب کسی کو جینے دیتے ہیں۔ کسی پاکستانی نے شکایت کر دی۔ اب تحقیق کے مراحل سے گزر رہا ہے غالباً دونوں کو یہاں سے نکال دیں گے۔

بہرحال لوگوں کا ذوق ہے جو جنوں سے گزر گیا ہے اور پاؤنڈ کی چاہت میں دین و ایمان، عزت و ناموس سب داؤ پہ لگا رکھا ہے اس کے باوجود سنجیدہ لوگ بھی ہیں جو بحمد للہ برطانیہ میں رہ کر اس تہذیب کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ مساجد کی رونق ہیں اور اسلام سے محبت کرتے ہیں۔ عملی زندگی میں اتباعِ سُنت کا نمونہ ہیں۔ اگرچہ حالات ان سے موافقت نہیں کر رہے۔

ایسے ہی ایک دوست سے بات ہوئی تو کہنے لگے پاکستان واپسی کا سوچ رہا ہوں بچے جوان ہیں اگرچہ بہت محنت کی ہے اور یہ فی الحال نیک بھی ہیں مگر اعتبار نہیں کہ کب فحاشی کی دلدل کسی کو لے ڈوبے اور جو نسل آئندہ ان سے چلے گی اس سے کوئی اُمیدِ وفا رکھنا حماقت ہے لہٰذا خاندان تباہ کرنے سے بہتر ہے واپس جا کر کوئی کام کروں۔ مگر پاکستان کے موجودہ حالات نے بھی کوئی اُمید بندھانے والی بات نہیں رہنے دی۔ اللہ کریم رحم فرمائیں!

بہرحال ہم وہاں سے چلے تو تقریباً ایک گھنٹہ کے سفر پر وہ گھر تھا جہاں چار پر کچھ لوگوں سے ملاقات طے تھی۔ اس کورس سے گزرے تو عصر مسجد میں ادا کر کے بیان کرنا تھا۔ لہٰذا یہ سعادت بھی نصیب ہوئی۔

سورۃ مزمل سے آیہ کریمہ تلاوت کی جس کا مفہوم ہے۔ "اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کریں اور اتنا کیا کریں کہ ماسوا ذہن میں نہ رہے اور صرف اللہ باقی رہ جائے"۔

پہلے تعارف کرانا پڑتا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں تقریر کے بعد چندہ مانگے گا۔ لہٰذا عرض کیا کہ ایسی کوئی بات نہیں مزدور آدمی ہوں بفضل اللہ خوشحال ہوں اور ایسے لوگوں میں سے ہوں جو یہاں سیر کو آتے ہیں۔ میں بھی آتا ہوں تو وقت آپ احباب کے ساتھ بسر کر لیتا ہوں اور سیر بھی ہو جاتی ہے اب گذارشات پیش ہیں۔

آج رُوئے زمین پر دو سو کروڑ انسان اسلام کا دعویٰ رکھتے ہیں اور مسلمان کہلاتے ہیں گو کہ خطاکار ہوں گے۔ مگر مسلمان تو ہیں اس کے باوجود عہدِ حاضر کی بے حیائی اور تہذیبِ جدید کی غیر مہذب حرکات کا ہدف بنے ہوتے ہیں۔ مگر چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا تھا کہ روئے زمین پر کوئی فرد اللہ کا نام لیوا تھا نہ اس کی عظمت سے واقف۔ جب آقائے نامدار ﷺ نے اعلانِ نبوت فرمایا اور اللہ کی طرف دعوت دینا شروع کیا، کفر و شرک، جور و جفا اور بدکاری جس عروج پر تب تھی نہ اس سے پہلے کبھی اس حد کو پہنچی اور نہ اس کے بعد آج تک۔ قرآنِ حکیم اس کی خبر یوں دیتا ہے کہ ضلالِ مبین میں گرفتار تھے یعنی گمراہی کی وہ حد جہاں خود اس پر عمل کرنے والا بھی یہ کہہ اُٹھتا ہے کہ جو ہم کر رہے ہیں یہ سراسر باطل ہے۔

آج تو ابھی یہ لوگ اس سب کچھ کو اپنی تہذیب کہتے ہیں نیز اللہ کا نام لینے والے اور حق پرست بھی دنیا پہ موجود ہیں۔ اس تاریکی میں جب آفتابِ نبوت طلوع ہوا تو کوئی مادی طاقت یا تلوار کہاں تھی؟ جو لوگ آج کہتے ہیں اسلام تلوار سے پھیلا' حالانکہ زبردستی مسلمان کرنے کی اسلام سرے سے اجازت ہی نہیں دیتا۔ انھیں یہ ضرور سوچنا چاہیئے کہ اسلام کو اگر تلوار سے پھیلنا تھا تو پھر اسے اس کی ضرورت اس وقت سب سے زیادہ تھی مگر اسلام میں پورے تیرہ برس مکی عہد میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہی نہ تھی پھر پہلے پہل جن کو یہ سعادت نصیب ہوئی اور ایمان لائے وہ غرباء تھے۔ معاشرے میں کمزور اور ناتواں لوگ۔ رؤسائے مکہ نے ایک وقت یہ بھی کہا تھا کہ ہم بات تو ضرور سنتے مگر ان نادار لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے ہماری توہین ہوتی ہے۔ انہی بظاہر تہی دست مگر نورِ ایمان سے روشن دل رکھنے والے لوگوں پر مشرکین نے کونسا ظلم ہو گا جو نہ توڑا اور کونسی سزا ہو گی جو انھیں نہ دی۔ مطالبہ صرف یہ تھا کہ کلمۂ اسلام چھوڑ دو، مگر وہ کٹ گئے

پیٹے گئے، گھسیٹے گئے، سینے پہ گرم پتھر رکھ کر ترم سلاخوں سے داغا گیا، انگاروں پہ لٹایا گیا، مگر کہتے رہے کہ ہم گواہی دیتے ہیں اللہ ایک ہے۔ اور روز بروز اسلام پھیلتا چلا گیا جوں جوں وہ امتحانات سے گزرتے چلے گئے مزید انعامات عطا ہوتے چلے گئے، نماز فرض ہوئی تو زبردست تقویت کا باعث بنی۔ کہ دن میں پانچ بار اللہ سے شرفِ ہمکلامی نصیب ہوا۔ روزہ فرض ہوا تو مزے ہو گئے۔ شیاطین قید اور عبادت کا اجر کئی گنا زیادہ کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ ایک ایک روزہ زندگی بھر کی خطاؤں کی بخشش کا ضامن اور ایک رات کا قیام گزشتہ گناہوں کی معافی کا سبب قرار پایا۔

لیلۃ القدر کی ایک رات ہزار مہینے پہ بھاری قرار دی گئی ایسے ہی حج، زکوٰۃ، حلال و حرام اور تمام احکام مزید قوتِ ایمانی کا باعث بنتے چلے گئے۔ جہاد اپنی بے شمار برکتوں کے ساتھ فرض ہوا تو اسلام بادِ بہاری بن کر انسانیت کے اُجڑے چمن کی آبیاری پہ کمربستہ ہو گیا اور رُوئے زمین پر کفر کے لئے جائے پناہ نہ رہی ظلم و جور صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور عدل و انصاف کی بہار آئی، نغمۂ توحید گونجا اور اُجڑے دلوں کو گلستاں بناتا چلا گیا اپنے تو اپنے غیروں نے بھی اماں پائی۔

ان سب عبادات کے ساتھ ایک بہت بڑا انعام اور قربِ الٰہی کا خصوصی سبب عطا ہوا اور وہ تھا پروردگار کے ذاتی نام کا ذکر اللہ، اللہ کی تکرار، جو اس آیہ کریمہ میں ارشاد ہے اور ہر مسلمان مرد و عورت پر واجب ہے۔

آج اگر ہم اندازہ کرنا چاہیں تو ہماری موجودہ زبوں حالی کا سبب یقیناً انہی انعامات میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ سے محرومی ہے تو آیئے! جائزہ لیں کیا مسلمانوں نے نماز ترک کر دی ہے؟ روزہ چھوڑ دیا ہے، حج نہیں کرتے۔ زکوٰۃ نہیں دیتے یا جہاد سے کنی کتراتے ہیں؟۔ ہرگز نہیں! اگرچہ نہ کرنے والے بھی کافی ہیں مگر ان سب پر

عمل کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ہاں! اگر چھوٹ گیا تو اللہ کا ذکر، جس کے کرنے والے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگرچہ نابود نہیں مگر کمیاب ضرور ہو چکے ہیں۔

کیوں، آخر کیوں؟

غالباً اس لئے کہ ایک بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہیں۔

یکم جون، نیویارک

مضمون اُدھورا چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے کہ میں تھک چکا تھا اور سر درد کرنے لگا دوسری وجہ یہ تھی کہ کھانا بھی کھانا تھا جو جہاز میں تقسیم ہونے لگا مگر ہمارے ساتھ لندن کے دوستوں نے گھر سے پکا کر دے دیا تھا لہٰذا تہذیب مغرب کے حلال سے بچ ہی گئے یہ تو امریکن کمپنی تھی۔

خود لندن کے مسلمان جو سب سے بہتر حلال کرتے ہیں اُس کا طریق کار یہ ہے، کہ کنویں کی ماہل کی طرح سے ایک زنجیر اُوپر سے نیچے کو اُتر رہی ہوتی ہے اُوپر مرغ لٹکانے والے کھڑے ہوتے ہیں جو ایک ایک مُرغ کی ٹانگیں اس کے کنڈوں میں پھنساتے جاتے ہیں اور یوں کنویں کے لوٹوں کی جگہ مُرغ اُلٹے لٹکے آ رہے ہوتے ہیں نیچے ذبح کرنے والا آدمی کھڑا ہوتا ہے جس کے سامنے سے مُرغ گزرتے ہیں تو وہ فوراً چھری پھیرتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ مشین تو رُکتی نہیں لہٰذا وہ جلدی جلدی بس ایک ہی بار چھری چلاتا جاتا ہے اور تڑپتے پھڑکتے مُرغ زنجیر میں بندھے گرم پانی کے ٹب میں ڈوب جاتے ہیں۔ وہاں سے نکلتے ہی دوسری مشین لے لیتی ہے جو کھال کھینچ کر پیٹ بھی صاف کر کے سٹور روم میں پہنچاتی چلی جاتی ہے اور خالی کُنڈے نئے مُرغوں کو لینے چلے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کس کے حصے میں کتنی تکبیر آتی

ہے اور رگیں بھی کٹتی ہیں یا کوئی رہ جاتی ہے۔ نیز خون کے مکمل اخراج کا تو سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا جو ذبح کا اصل مقصد ہے آگے اندازہ خود کر لیجئے!

یا پھر مسلمان "کوشر" کھا لیتے ہیں جو یہود کا ذبح ہے اور حلال جان کر کھاتے ہیں
مگر پتہ کرنے پر ظاہر ہوا کہ یہودی تو سبزی، آٹا، دودھ، روٹی ہانڈی وغیرہ سب کچھ کوشر
کرتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ چیز بنا کر رکھ لیتے ہیں۔ دودھ دھو کر یا کھانا بنا کر یا مُرغ
کاٹ کر یا جانور کاٹ کر اور پھر ان کا ربی یعنی "پیر" آتا ہے اور ہر چیز کو چھڑی سے مَس
کرتا جاتا ہے ساتھ عبرانی میں کچھ پڑھتا جاتا ہے غالباً بسم اللہ ہی کا متبادل ہوتا ہوگا اور
وہ چیز کوشر یعنی حلال ہو جاتی ہے یہ حلال بہت عام استعمال ہوتا ہے مگر دراصل دوسرے
درجے کا ہے اور اس سے آگے تو بقول ایک خالصہ کے "بھائی جی! موجاں" سب کچھ
ہی ایک طرح کا ہوتا ہے۔ اگر گوشت مُرغ کا ہو تو پکانے میں خنزیر کی چربی استعمال
کریں گے اور سب کچھ پکانے اور کھانے کے برتن بھی ایک ہی ہیں اور گورے کالے ہاتھ
بھی ایک جیسے، لہٰذا جہاز میں نہ کھانا ہی عافیت ہے۔ یا پھر ساتھ کچھ رکھ لیا جائے
یہ مسلمان ہوائی کمپنیوں کے علاوہ تو از حد ضروری ہے۔

اپنی ہوائی کمپنیاں کیا کرتی ہیں؟ تو گوشت تو وہ بھی درآمد شدہ ہی استعمال
کرتی ہیں سوائے PIA کے۔ خدا جانے۔ PIA والے کیسے ذبح کرتے ہیں، کبھی
کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے آدمی چاول وغیرہ یا مچھلی تو مسلمان ہوائی کمپنیوں میں کھا
ہی سکتا ہے۔ مگر غیر مسلم کمپنیوں کا حال عجیب ہے

تیسری وجہ یہ ہوئی کہ جہاز کچی سڑک پر آ گیا تھا، جی ہاں! ہوائی جہاز کچی سڑک
پر، وہ یوں کہ جب راستے میں بادل اور ہوائی طوفان آتے ہیں تو جہاز اسی انداز سے
جھٹکے کھاتا ہے جس انداز سے موٹر کچی سڑک پر اور طرح طرح کی آوازیں بھی باڈی کے ایک

ایک جوڑ سے نکلتی ہیں تو ایسے میں بھی لکھنا ممکن نہیں رہتا۔ لہٰذا اب پھر وہاں سے بات
شروع کرتے ہیں جہاں بات چھوڑی تھی۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ مسلمان ایک بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہیں۔ وہ
یہ ہے کہ اگرچہ قرآن حکیم میں ذکر الٰہی کی بہت زیادہ تاکید بھی آئی ہے اور ہر حال میں ذکر
کرنے کا حکم موجود ہے۔ مگر آج کے حضرات کی تشریحات کے مطابق، شریعت کے
مطابق عمل کرنا ہی ذکر ہے لہٰذا ساری عبادات بھی ذکر ہیں اور جائز کام بھی، اگر کوئی کسر رہ گئی تو
ہر آدمی مختلف تسبیحات پڑھتا ہے۔ چلو! مقصد حل ہوا۔ مگر میں یہاں خود کو متفق نہیں
پاتا بلکہ میری کمزور رائے بالکل الگ ہے متقدمین سے نہیں، دورِ حاضرہ کے ان حضرات
سے جو مندرجہ بالا خیال کے حامی داعی اور مبلغ ہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ ذکر سے مراد، ذکرِ اسم ذات ہے اور وہ بھی ذکرِ قلبی، اگر یہ
نعمت نصیب ہو تو باقی اذکار یعنی تسبیحات، عبادات اور اعمال میں رُوح پیدا ہو جاتی ہے
جان پڑ جاتی ہے۔ ورنہ محض ظاہر ہوتا ہے بغیر کسی کیفیت کے جیسے بادام بغیر
مغز کے۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے جو میں کہہ گزرا ہوں مگر دلائل اسی طرف راہنمائی
کرتے ہیں۔ آئیے! آپ بھی میرے دلائل کا جائزہ لے لیں۔ پھر فیصلہ آپ کا اپنا ہوگا
کہ میں کسی پر فیصلہ مسلط کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔

تو صاحب! یہاں زیادہ تفصیل کا وقت نہیں ہے لہٰذا فرائض پہ بات کرتے
ہیں بہت بڑا فریضہ صلوٰۃ ہے جسے قرآن حکیم نے ذکر قرار دیا ہے اور فرمایا،

"جب جُمعہ کی نماز کے لئے پکارا جائے تو کاروبار بند کر کے اللہ کے ذکر
کی طرف فوراً پہنچو!"

مگر پھر ارشاد ہوتا ہے، جب نماز ختم کر چکو تو اپنے کاروبار میں لگ جاؤ، مگر

اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو کہ کامیابی حاصل کر سکو تو بے شک نماز بھی ذکر ہے مگر اس کے علاوہ ذکرِ کثیر مطلوب ہے کہ خود نماز میں بھی مقصد نماز یا کامیابی حاصل ہو اس کے بعد اہم فریضہ حج ہے جو زندگی میں صاحبِ استطاعت پہ ایک بار فرض ہے۔ اس کے تمام ارکان ادا کرنے کے ساتھ ذکرِ کثیر کا حکم موجود ہے۔

جہاد ایک اعلیٰ ترین اور کامیابی کا واضح راستہ ہے ارشاد ہوتا ہے، جب کسی لشکر سے مقابلہ ہو، جم کر لڑو اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو۔ یاد رہے اسلام صرف فتح کو کامیابی نہیں سمجھتا، بلکہ اگر کبھی دشمن بھی جیت جائے تو غازی یا شہید کی صورت میں مومن کامیاب رہتا ہے۔ جبکہ عمل خلوصِ نیت سے کر رہا ہو اور یہ خلوص دل کی کیفیت کا نام ہے جو ذکرِ کثیر سے نصیب ہوتی ہے۔

ایک اور بہت اہم فریضہ ہے تبلیغ۔ اور یہ ایسا عظیم الشان امر ہے کہ ربِ کریم نے امتِ مرحومہ کے "خیرِ امہ" ہونے میں اس کو ایک سبب گردانا ہے کہ تم بہترین امت ہو جو دوسروں کی بھلائی کے لئے کمربستہ ہو اور نیکی پھیلانا، برائی سے روکنا اور اللہ پر یقین و اعتماد تمہاری خصوصیات ہیں ورنہ پہلے جب ضرورت پیش آتی، نیا نبی مبعوث ہو جاتا۔ مگر نبی اکرم ﷺ کی بعثت پر جس قدر عطا یا انسان پا سکتا تھا، بارگاہِ الوہیت سے عطا کر دیئے گئے اور مقصدِ نبوت اپنے کمال کو پہنچا۔ نبوت کی ضرورت باقی نہ رہی۔ تو یہی مسئلہ ختمِ نبوت کہلاتا ہے۔ جس پر بہت بحثیں ہوتی ہیں حالانکہ سمجھنے کے لئے بالکل صاف بات ہے۔

اب ان انعامات کو انسانوں تک پہنچانے کا کام تو ہمیشہ باقی رہنا تھا لہٰذا یہ نعمت امتِ مرحومہ کو عطا ہوئی اور اسی کا نام تبلیغ ہے مگر میری رائے میں جو کثرتِ ذکر کی نعمت سے محروم ہیں ان کی تبلیغ بھی اثر سے محروم اور کیفیات سے خالی ہوتی ہے

اس لئے کہ قرآن حکیم میں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ موجود ہے۔ جب وہ مبعوث ہوئے اور ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت عطا ہوئی تو فرعون کی طرف جاتے ہوئے جب انہوں نے عرض کیا کہ بار اللہ! میں تو فرعون کی طرف سے پہلے ہی مجرم گردانا جا چکا ہوں اور اس نے میرے قتل کے احکام دے رکھے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات سننے سے پہلے ہی اس کے ظلم کا شکار ہو جاؤں اور بات ہی نہ پہنچا سکوں۔ تو کتاب الٰہی میں تین باتیں ملتی ہیں، اوّل یہ کہ، آپ دونوں کے ساتھ میں ہوں سب کچھ دیکھ رہا ہوں اور سن رہا ہوں یعنی آپ دونوں حضرات کو اللہ کی معیت حاصل ہے۔ لہٰذا فرعون کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

دوسرے فرمایا کہ آپ دونوں بات بہت نرم اور پیارے انداز میں کیجئے گا اگرچہ وہ ظالم، متکبر، بدترین کافر ہے مگر آپ کی شان تو اپنی ہے،

> "اگر فرعون سے بات کرنے کا یہ انداز ہے تو مسلمان کو نصیحت کرنے کے لئے مساجد میں تماشا کیوں؟ ایک کی داڑھی دوسرے کے ہاتھ میں اور دوسرے کے بال پہلے کی مٹھی میں! میرے خیال میں یہ عدمِ ذکر کے نتائج ہیں۔"

اور تیسری بات جو ارشاد فرمائی وہ قابلِ توجہ ہے فرمایا، "ولا تنیا فی ذکری" آپ دونوں کی طرف سے میرے ذکر کی طرف توجہ میں کمی نہ آئے سبحان اللہ! ذرا اندازہ کیجئے! انبیاء کا قلب کبھی ذکر سے فارغ نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ بات نہیں فرمائی کہ ذکر مت چھوڑیں فرمایا، ذکر کی طرف توجہ کم نہ ہو۔

اس کا مفہوم یہی ہے کہ آدمی دو کام بیک وقت کر رہا ہو تو ایک ہی کو بھرپور توجہ دے سکتا ہے اور دوسری طرف توجہ نسبتاً کم ہوتی ہے جیسے ہم کار چلا رہے ہیں تو دو طرف کام ہو رہا ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں بھی مصروف رہتے ہیں اور راستے پہ

بھی نگاہ ہوتی ہے اور ظاہر ہے ۔ راستے کی طرف دیکھنے کو ہم بھرپور توجہ دیتے ہیں ۔ اتنی توجہ ہم ہاتھ پاؤں کو نہیں دیتے اگرچہ دیتے ضرور ہیں ۔ تبھی کام کرتے ہیں ۔

وہی حال یہاں ہے کہ قلب بھی ذاکر ہے اور فرعون کو تبلیغ بھی جاری ہے تو فرمایا ، توجہ کا اول درجہ میرے ذکر کو حاصل ہو اور دوسرا درجہ فرعون سے بات کرنے کو ۔ اور یہی مفہوم کثرتِ ذکر کے اختیار کا حکم پڑھ کر حاصل ہوتا ہے کہ جہاں عدمِ ذکر کا امکان ہے وہاں کثرتِ ذکر کا حکم ہے ۔ اور یاد رہے سوائے ذکرِ قلبی کے کثرت سے ذکر نہیں ہو سکتا بھلا جہاد میں چند نعرہ ہائے تکبیر کو کثرتِ ذکر قرار دینا کہاں کی دانشمندی ہے اور کاروبارِ حیات میں ذکرِ قلبی کے علاوہ کثرتِ ذکر کی صورت بن ہی نہیں سکتی ۔ نہ ہی کوئی عمل ذکرِ الٰہی کا مستقل متبادل قرار دیا جا سکتا ہے ۔

ہاں ! ذکرِ قلبی نصیب ہو تو پھر تسبیحات پڑھی جائیں ، نماز ادا ہو ، حج نصیب ہو ، جہاد کا موقع ملے یا تلاوت ، ہر عمل الگ لذت دیتا ہے ۔ ذوقِ جنوں تیز تر ہوتا ہے جمالِ باری کی طلب پیدا ہوتی ہے ، ذاتِ باری نظر نہیں آتی ۔ مگر انسان اس کو اس کے حسنِ بے مثال کو دیکھتا ہے ۔

اب ایک آخری بات ، کہ کیا ذکرِ الٰہی سب کے لئے ضروری ہے تو صاحبِ تفسیر مظہری ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے واجب لکھا ہے اور کوئی قربِ الٰہی کے کسی درجہ پر فائز ہو پھر بھی ذکر کرنا اس کی ضرورت ہے ، چنانچہ ،

" یہ آیہ کریمہ ، جو براہِ راست نبی اکرم ﷺ کو خطاب فرما کر ارشاد ہوئی یہی تقاضا کرتی ہے کہ جب آپ ﷺ کو حکم ہے کہ اپنے رب کے نام کا ذکر کیجئے اور اس حد تک کہ مخلوق نگاہ میں نہ رہے صرف اللہ کی ہی

ذات رہ جائے تو دوسرا کون مستثنیٰ ہو سکتا ہے ؟ "

اگر اس آیہ کریمہ کے سباق پہ نگاہ ہو تو پتہ چلتا ہے کہ ارشاد ہوتا ہے راتوں کو اٹھا کیجئے ، آدھی رات یا کم و بیش ، مگر رات خالی نہ جائے ۔ بیشک دن بھر آپ بہت مجاہدہ کرتے ہیں اور ہر صبح نئی مشقتیں لے کر آپ پر طلوع ہوتی ہے ۔ نیز فطرتِ انسانی ہے کہ ویسے بھی شب بیداری بہت مشکل کام ہے مگر رات کی بات مزہ دے جاتی ہے جب لوگ نیند کی آغوش میں بے سدھ پڑے ہوں تو طالبِ جمال ، ذاتِ باری سے سرگوشیاں کر رہا ہو ۔ اس کا اپنا ایک لطف ہے ۔ لہٰذا آپ راتوں کو اٹھا کریں ، بڑے لطف سے تلاوت کریں اور پھر اسمِ ذات کی تکرار فرمایا کریں کہ قربِ الٰہی کی کوئی انتہا نہیں ۔ ہر آن آپ کو ترقی نصیب ہوتی ہے اور ہر آن ذکر بھی ضروری ۔ لہٰذا ،

" یہ بمنزلہ روح کے ہے جس کے بغیر سب محنت اکارت جانے کا خطرہ ہے اور یہی ہمارا قومی المیہ ہے ، ذرائع ابلاغ بہت وسیع ، تبلیغ بہت زیادہ ، نمازی ، حاجی اور روزہ دار موجود ، چلّے لگائے جا رہے ہیں ، مگر قوم بیمار ہے کہ اسے کوئی نسخہ اثر ہی نہیں کرتا اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ۔ نظروں کے سامنے ہے ۔ "

لہٰذا میری گذارش فقط اتنی سی ہے کہ دن رات کی مصروفیات میں سے کچھ لمحے محض ذکرِ الٰہی کے لئے بھی ضرور نکالئے ۔ یہ اعتراض کہ فلاں طریقے سے ذکر کریں اور فلاں سے نہ کریں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا ۔ اس لئے کہ ذکر کا طریقہ معین نہیں اسباب اور حالات کے مطابق ہر ایک کی صوابدید پر ہے کہ ارشاد ہے ، کھڑے بیٹھے اور لیٹے اللہ کا ذکر کرتے ہیں ۔ ہاں ! کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا صحیح نہ ہوگا جس سے شریعت نے منع کر دیا ہو ۔ لہٰذا مختلف سلاسل تصوف میں مختلف طریقے اختیار کئے

جاتے ہیں مگر راستے مختلف بھی ہوں منزل سب کی ایک ہے کہ دِل ذاکر ہو جائے اور ذکر قلبی نصیب ہو کہ ہر حال میں اللہ، اللہ ہوتی رہے۔

یہ تھا بیان کا خلاصہ، جو مجھے یاد رہ سکا اور پھر ماموں جان کے ہاں ہماری دعوت تھی۔ وہ مُدت سے برطانیہ میں مقیم ہیں اور تن تنہا رہتے ہیں۔ انھوں نے خالص دیسی انداز میں بھرپور دعوت پکائی اور ہم چند لقموں پہ گزارا کرنے والے لوگ کتنا کچھ کھا سکتے تھے مگر بہت لُطف آیا۔ اللہ کریم انھیں خوش رکھے اور دین پر عمل کی ہمت ارزاں فرمائے۔

پھر دو جگہ قیام تھا، ساتھی اپنی قیام گاہ چلے گئے اور میں اپنی منزل پہ روانہ ہوا جو وہاں سے ایک گھنٹہ کی ڈرائیو تھی، شہر کے اندر ہی اندر اور شہر اس سے بہت زیادہ وسیع ہے سینکڑوں میلوں میں پھیلا ہوا، اپنی آغوش میں کیا کیا لئے بیٹھا ہے۔ بس

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں

جو یہاں ہوتا ہے سب دیکھا بھی جا سکتا نہیں

حق یہ ہے کہ تہذیب مغرب کا اصل چہرہ دیکھنے کی ہمت ہم میں نہیں جو خدوخال برلب سڑک مجبوراً دیکھنا پڑتے ہیں وہ اگرچہ اصل سے بہت کم ہیں مگر سارے لکھے نہیں جا سکتے اور جو کم از کم لکھا ہے اسے کاٹ رہا ہوں کہ پڑھنے والے برداشت نہ کریں گے نہ میں خود ایسا مواد پڑھنے کے لئے دینے کی ہمت رکھتا ہوں اگرچہ مغرب کے شیدائیوں کو یہ آئینہ دکھانا بہت ضروری تھا۔

اور یہ اتنی سی جھلک ہے نہ میں لکھ سکتا ہوں نہ آپ پڑھ سکتے ہیں اور پڑھنے والے بھی شاید کہہ اٹھیں کہ وعظ کی محافل میں یہ کیا غلاظت اچھال رہے ہو مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ پاکستانیوں کو اس دلدل میں غرق ہونے سے پہلے بتا سکوں کہ یہ کتنی گہری ہے ممکن ہے کوئی جانے سے باز آ جائے۔

میں کوئی بارہ بجے اقامت گاہ پہنچا تو ایک ڈاکٹر صاحب منتظر تھے انھیں ذکر کرایا پھر ایک خاتون اپنی دو بچیوں کو ساتھ لے کر آئی تھیں اُن کی بات سُنی۔

بچی کا مسئلہ یہ تھا کہ سائنسدان کہتے ہیں کوئی اللہ نہیں ہے ایک جرثومہ تھا جواب نہیں۔ اس وقت موسم اور حالات کے ساتھ اس میں تبدیلی آنی شروع ہوئی اور مختلف صُورتوں سے گزر کر انسان بن گیا جب مرتا ہے تو ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل کے طور پر ان کے پاس وہ جرثومہ اور مختلف اشیاء اور تصاویر ہیں جو بہت بڑا ثبوت ہیں ہم مقابلے میں کہتے ہیں، "نہیں! یہ سب اللہ نے بنایا۔" تو کہتے ہیں اس کا ثبوت کیا ہے؟ کس نے دیکھا، کہاں سے آیا، کیا ہم دیکھ سکتے ہیں؟

یہ سوال کا خلاصہ تھا۔

میں بہت تھک چکا تھا جسم سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں مگر یہ سوال سُن کر نیند اُڑ گئی اور اپنی بے علمی کے باوجود جواب دینا ضروری سمجھا جس کا مفہوم ہی اب آپ کو سنا سکتا ہوں اور یہ سوال مجھے ہلا کر رکھ دینے کے لئے کافی تھا کہ میں اب تک اخلاقی پستیوں کا رونا روتا رہا مگر یہاں تو عقیدے اور ایمان کی تباہی کا ہیبتناک منظر سامنے تھا۔ اس کی والدہ نے کہا،

"یہ بات میرا لڑکا بھی ہر ایک سے کہتا ہے کہ خدا کہاں ہے؟ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اگر کوئی ثبوت ہے تو بتاؤ۔"

بہرحال میں نے کہا،

"جواب تو بڑا مختصر سا ہے کہ" رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے کہ اللہ ہے واحد اور لاشریک ہے وہ اکیلا خالق ہے اور سب کائنات اس کی مخلوق ہے۔"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بھلا ہم آپ ﷺ کی بات کیوں مانیں؟ تو

اسی طرح عملی دنیا میں قرآن کی پیشگوئیاں، رُوم کی تباہی، ان دنوں سب کے سامنے تھی۔ قرآن نے ان کے دوبارہ غلبے کی خبر دی جو بظاہر ناممکن تھی مگر ایسا ہو کر رہا۔ مسلمان مکہ مکرمہ سے ہجرت کر رہے تھے۔ قرآن نے خبر دی اللہ آپ کو اس شہر پر قبضہ دلائے گا۔ کیا یہ بظاہر ممکن نظر آتا تھا؟ ہرگز نہیں! مگر ایسا ہو کر رہا۔ قرآن نے خیبر کی فتح کی خبر حدیبیہ میں دی جبکہ بظاہر مقابلہ ممکن نظر نہ آتا تھا مگر ایسا ہو کر رہا۔

قرآن نے اُس عہد میں خبر دی کہ ہر شے میں جوڑے جوڑے پیدا کئے گئے ہیں۔ سائنس بعد میں اس جگہ پہنچی کہ نباتات میں نر و مادہ ہیں اور صدیوں بعد ایٹم سے پتہ چلا کہ اس کے اندر مثبت اور منفی طاقت کا جوڑا ہے۔ اگر یہ اللہ کا کلام نہ تھا تو کوئی ایک بات یا اس کا کوئی پہلو جھٹلا کر ثابت کیا جا سکتا تھا مگر ایسا نہ ہو سکا اور نہ ہو سکے گا لہٰذا،

"جہاں تک آخرت کا سوال یا ذاتِ باری پہ ایمان ہے وہ اس کو مان کر کیوں نہ لایا جائے؟ جبکہ سائنس کے پاس اس موضوع پر کوئی خبر ہی نہیں اور محض انکار ہے۔ کیا اندھے کے انکار سے روشنی کو جھٹلایا جا سکتا ہے؟"

اور اسلام کا یہ دعوےٰ کہ لیظھرہٗ علی الدین کلہ کہ آپ ﷺ کو مبعوث ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ دینِ حق تمام ادیانِ باطلہ پر غلبہ حاصل کرے۔ کیا اس دور کے تاریخی پس منظر کے اعتبار سے کوئی معمولی بات ہے؟ ہرگز نہیں! ہر طرف ظلم و جور اور کفر و شرک نے تباہی مچا رکھی تھی اور فحاشی اور اخلاقی بے راہروی اُن حدوں کو چھو رہی تھی جن کا تصور محال ہے۔

کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں کہ نزولِ کتاب کی تکمیل کے بعد رُبع صدی کے اندر اندر دنیا سے کفر کی ظلمت مٹ کر نورِ توحید پھیل چکا تھا اور بڑے بڑے جابر و ظالم جن میں قیصر و کسریٰ جیسے بظاہر بہت ہی طاقتور حکمران شامل تھے۔ اپنے ظلم کی بساط لپیٹ کر صفحہ ہستی

یہی سوال سائنس پر بھی وارد ہوتا ہے کہ ہم ان کی بات کیوں مانیں؟ تو آپ یہی کہیں گی انھوں نے ثابت کر دیا ہے تجربات اور نتائج سامنے ہیں:

مگر ان نتائج تک پہنچنے کے لئے آپ نے بارہ سال تعلیم حاصل کی ہے۔ اگر آپ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے حصول میں بھی وقت لگائیں تو بات یقیناً آپ کے دل میں اُتر جائے۔ کیا آپ کی سائنسدانی کسی ان پڑھ کے لئے کوئی حیثیت رکھتی ہے؟ اگر نہیں تو آپ بھی دین کے میدان میں ایسی ہی جگہ پر کھڑی ہو کر بات کر رہی ہیں۔ بھلا یہ جرم (GERM) جو ترقی کر کے آدمی بنا کس نے بنایا؟ اور اگر کوئی اس کا خالق ہے تو اسے کس نے بنایا؟ پھر یہ سوال جاری رہے گا تاوقتیکہ کوئی ایسا وجود سامنے آئے جس کو کسی نے نہ بنایا ہو بلکہ اپنی ذات سے قائم ہو اور زمانے تک خود اس کی ذات سے وابستہ ہوں۔ وہ کسی ذات کا محتاج نہ ہو۔

اگر یہ سرا نہ ملے تو دوسرا کوئی جواب ہی نہیں اور اگر یہی جواب ہے تو یہ ہستی اللہ ہے۔ آپ نے سائنس پڑھی تو اللہ کا کلام جو اُس نے اپنے رسول ﷺ پہ نازل فرمایا، پڑھیں یہ بات کہ "یہ کتاب، اللہ کا کلام ہے۔" بجائے خود بہت بڑا چیلنج ہے کہ اس کتاب کا پہلا جملہ ہی یہ ہے کہ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب تو کفر کے لئے ایک کام کرنا تھا کہ قرآن کی کسی بھی خبر، کسی بھی کلیے یا بات کو غلط ثابت کر کے بتا دیتا کہ اللہ کا کلام نہیں۔ مثلاً قرآن نے سائنس کے موضوع پر بات کی تو وجودِ انسانی کی تخلیق کے وہ مراحل ارشاد فرمائے جو صدیوں بعد سائنس کی سمجھ میں آسکے اور تحقیقِ جدید صرف اس کی تصدیق کر سکی کہ کیسے اور کتنے عرصہ میں خون کی پھٹکی، پھر گوشت کا لوتھڑا پھر جسمانی ساخت اور ہڈیاں پھر اُن پر کھال، گوشت وغیرہ چڑھتا ہے اور بچہ مکمل ہو کر اس میں جان پڑتی ہے۔ اس وقت کوئی ایکسرے مشین اور ٹیسٹ ٹیوب نہ تھی۔

سے رخصت ہو چکے تھے۔ عدل وانصاف اور امن وسکون کا وہ سماں کہ چشمِ فلک نے
اس کی نظیر نہیں دیکھی اور تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ کیا اسلام کے حق پر ہونے
پہ گواہ نہیں۔

آپ نے بارہ برس محنتِ شاقہ کر کے سائنسدان کی بات سمجھی ہے اگر یہی بات
ان پڑھ سے کہو تو آپ کو بے وقوف سمجھے گا۔ اسی طرح کچھ وقت تعلیماتِ اسلام اور برکاتِ
نبوی کے حاصل کرنے میں بھی لگائیں۔ تب بات سمجھ میں آئے گی ورنہ اس ان پڑھ کی
طرح آپ دین پر عمل کرنے والوں کو احمق سمجھتی رہیں گی۔

تو اس بچی نے کہا،

کیا ہم اللہ کو دیکھ سکتے ہیں؟ وہ کیسا ہے، کہاں ہے؟

میں نے کہا، بے شک! مگر حضور اکرم ﷺ پر ایمان لا کر اور آپ ﷺ
سے اکتسابِ فیض کر کے، کہ آپ ﷺ کے معجزات کا تو شمار نہیں، میں نے تو صرف
قرآنِ حکیم کے بھی محض چند پہلو عرض کئے ہیں ایسے بے شمار پہلو موجود ہیں۔

اور جو لوگ آپ ﷺ پر ایمان کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے انھیں نورِ باطن اور
ایسی قلبی روشنی نصیب ہوئی کہ وہ اللہ کو روبرو پاتے تھے۔ اپنے اس قدر قریب کہ کوئی لمحہ
اس کے جمال سے غافل نہ ہوتے تھے اور یہ کمال نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہا اور ہوتا رہے
گا۔ اور مسلمان کی عبادت کا معیار ہی آپ ﷺ نے یہ قرار دیا ہے کہ اللہ کی عبادت
ایسے کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے یا کم تر یہ کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

اگر تمھیں بھی کسی اللہ کے بندے کی مجلس نصیب ہو اور کسبِ حال کر سکو تو دیکھ بھی سکو
گی کہ نظر نہیں آتا، مگر میں اسے دیکھ رہی ہوں، چھو نہیں سکتی مگر وہ میرے پاس ہے بہت
ہی قریب رگِ جاں سے قریب تر۔

بہرحال رات بیت رہی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ بج رہا تھا اور شاید میں ساری بات
نقل نہ کر سکا ہوں گا مگر وہ بچی کافی حد تک مطمئن ہو چکی تھی اور اس کی آنکھوں میں مسرت
کی چمک نظر آتی تھی جو اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنا عقیدہ کھونا نہ چاہتی تھی جو اس کے
ہاتھ سے چھوٹ رہا تھا۔ مگر، بحمد للہ، اب پھر اس کی گرفت مضبوط ہو رہی تھی۔ اور وہ کہنے
لگی، "آپ اللہ سے ہمارے لئے دعا کیجئے وہ ہماری حفاظت فرمائے!"

ہم صبح پانچ بجے سفر پہ نکلے تھے اور اب رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا گویا ساڑھے
بیس گھنٹے گزر چکے تھے لہٰذا بے دم ہو کر پڑ رہا، ابھی سو نہ پایا تھا کہ فجر کی نماز کا وقت
ہو گیا۔ نماز ادا کر کے دو گھنٹے سونے کو ملے اور ناشتہ کر کے ساڑھے آٹھ بجے وہاں سے
نکلے۔ گھنٹہ بھر سفر میں اور تین گھنٹے ہیتھرو ایئر پورٹ پر لگ گئے جگہ جگہ کاغذات کی
پڑتال، سامان کی تلاشی اور بے شمار تحقیقات، کہ جب سے امریکہ کا جہاز گرا ہے، بہت
سختی ہو گئی ہے پھر ساڑھے سات گھنٹے کی پرواز، جس کا حال لکھا ہے اور تین گھنٹے
کینیڈی ایئر پورٹ پر کلیر ہونے اور سامان کی تلاشی وغیرہ کرانے میں لگ گئے۔ اس طرح
کوئی اٹھارہ انیس گھنٹے کی کشمکش کے بعد ہم لندن سے نیویارک پہنچ چکے تھے۔

لندن، جہاں کی زیرِ زمین ریلوے کا تذکرہ نہیں کر سکا۔ جو دنیا کی بہترین ریلوے
ہے اور ماموں جان اسی میں انسپکٹر کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ شہر کے نیچے اس کا جال
بچھا ہوا ہے۔ ایک منزل نیچے پھر اس کے نیچے ایک اور منزل۔ جس پر خوبصورت ٹرینیں
دوڑتی پھرتی ہیں۔ بہت سستی اور تیز رو سواری ہے۔ سستی ایسے کہ آپ پلیٹ فارم پر
اتریں تو ٹکٹ لے کر اندر داخل ہو سکیں گے پھر آپ کی ہمت، کہ زیرِ زمین کب تک قیام
ہے اور کتنا سفر کر سکتے ہیں۔ جب تک پلیٹ فارم کے گیٹ سے باہر نہ آئیں دوبارہ
ٹکٹ کی ضرورت نہیں۔ اور سبک رفتار گاڑی کے ہر ڈبے میں پورے زیرِ زمین سسٹم کا

نقشہ لگا ہوا ہے آپ پوری رہنمائی پا سکتے ہیں۔ دوسرے نمبر پہ یہاں نیویارک کی زیرِزمین ریلوے ہے۔ ہو سکتا ہے باقی تفصیل اس کے تذکرے میں کر سکوں گا۔

ان سب باتوں کے باوجود، برطانوی مسلمانوں میں جذبے کی شدت بھی ہے اور نئی نسل میں بھی ایک نوجوان تنظیم اُبھر رہی ہے جو اسلام کی خدمت خلوصِ دل سے کرنے کے تمنائی ہیں اور ان سے بہت سی اُمیدیں، اس اُمید پہ وابستہ کی جاسکتی ہیں کہ اللہ انھیں درُست قیادت عطا فرمائے، اللہ کرے ایسا ہی ہو!۔

اگرچہ میں نے بہت سی ناگوار باتیں لکھی ہیں مگر میں اس معاشرے کے اصلی چہرے سے نقاب اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا جو اسقدر بھیانک ہے کہ صرف دیکھا جاسکتا ہے بلکہ دیکھنا بھی محال ہے، بتانا ممکن نہیں۔ نہ ہی کسی کو یقین آئے گا۔

آج یہاں مین ہیٹن جانا ہوا۔ جہاں کینیڈا کے سفارت خانے سے ویزہ حاصل کرنا تھا اور پھر کچھ وقت آرام کیا۔ اب امریکہ کا کچھ حال تو ضرور لکھوں گا۔ انشاء اللہ، مگر شاید مزید تقاریر نقل نہ کر سکوں کہ کام کے اوقات بہت زیادہ ہیں اور لکھنے کی فرصت نہ مل سکے گی۔ نیز بہت لکھ بھی دیا ہے، یہ مہینہ بھر اوسطاً سولہ سے اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرنے کا سلیبس ہے۔ جسمانی نقاہت اور بیماری اس کے سوا ہے۔ لہٰذا اب شاید اپنی مصروفیات میں سے لکھائی کو کم کر دوں۔

اللہ کریم معاف فرمائیں اور دین ہی کی خدمت پہ دم نکلے، آمین۔

۳ جون

امریکہ، اس کی تہذیب، امریکہ اور اس کا اقتصادی نظام۔ امریکہ اور کینیڈا کے چشم دید حالات، یہ سب کچھ ضرور لکھتا مگر ان کا چہرہ اتنا مکروہ، اتنا گھناؤنا اور اس قدر شرمناک ہے کہ لکھنے کی جرأت نہیں پا رہا اور میں نہ شاعر و ادیب ہوں نہ دانشور کہ اخلاقی پستیوں کو حسن و عشق کے فسانوں میں سجا کر ان کے برہنہ جسم پہ سے اخلاقی جذام کے گہرے گھاؤ ڈھانپ دوں۔ میں نے نہ لکھنے کا فیصلہ کیا ہے شاید یہ میری کمزوری ہے میں لکھ نہیں سکتا۔ برطانوی تہذیب پہ چند صفحات لکھ کر کاٹ دیئے ہیں حالانکہ یہ وہ مناظر تھے جو سرِ راہ نظر آتے ہیں۔ پسِ دیوار کیا ہوتا ہو گا یا لبِ دریا کا عالم کیا ہو گا۔ اندازہ کر لیجئے! اخلاقی پستیوں اور تہذیب کی برہنگی میں امریکہ، کینیڈا اور فرانس، ڈنمارک، ہالینڈ، سویڈن وغیرہ برطانیہ سے بہت آگے ہیں بلکہ برطانیہ ان ممالک کے مقابلے میں ایک پسندیدہ منظر پیش کرتا ہے اور بہت پس ماندہ نظر آتا ہے۔

یہاں نیویارک میں واشنگٹن کی خبر ہے کہ پارلیمنٹ کے سپیکر نے اخلاقی الزامات کی بنیاد پر استعفیٰ دے دیا ہے جبکہ صدر، نائب صدر اور پورے ملک میں تیسرا بڑا عہدہ سپیکر کا ہوتا ہے۔

۷، جون

کئی روز سے خمینی کے انتقال اور چین کے اندرونی خلفشار کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے۔ اب خمینی کی خبریں تو ختم ہیں مگر چین میں خانہ جنگی بہت دہشتناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے جس میں امریکی حکومت بھی بہت دلچسپی لے رہی ہے جس کی وجوہات بظاہر تین ہیں۔ اوّل کمیونزم کی شکست اور بقول امریکہ جمہوریت کی فتح ہو رہی ہے۔ دُوسرے انھیں فکر ہے کہ اگرچہ جمہوریت آ رہی ہے۔ مگر جن افراد کے اقتدار میں آنے کے مواقع زیادہ ہیں وہ امریکہ اور اس کے طریق کار سے اختلاف رکھنے والے ہیں۔ تیسرے امریکی شہری متاثر ہو رہے ہیں جو چین میں موجود ہیں جن میں سفارتکار، کاروباری لوگ، طالب علم اور سیّاح شامل ہیں۔

ہزار خرابیوں کے باوجود، ان ممالک کی حکومتیں صرف ٹیکس جمع ہی نہیں کرتیں عوام کو لوٹا کر بھی دیتی ہیں مثلاً بجلی یا پانی کے نہ ملنے یا لوڈ شیڈنگ کا کوئی تصور ہی نہیں۔ خاتون حاملہ ہو تو اسے مراعات ملنا شروع ہوتی ہیں اور بچے کی پیدائش، بچپن کی غذا، دوا، تعلیم اور بالغ ہونے تک الاؤنس ملتے ہیں۔ اگر بالغ ہو کر روزگار حاصل نہ کر سکے تو بے روزگاری الاؤنس پاتا ہے یہ بھی ایک سبب ہے کہ والدین اور اولاد کے

رشتے کا تقدس ایک تجارت یا پیشہ بن چکا ہے اور وہ محبت جو اُس کا خاصہ تھی، کھو بیٹھا ہے۔ بایں ہمہ یہاں کچھ لوگ وضعداری کے حامل ضرور ہیں، مثلاً ایک خاتون جو اب ذکر کرنے لگی ہے پہلے عیسائی بتا رہی تھی کہ میرا ایک لڑکا ہے اس کے بعد خاوند سے علیحدگی ہو گئی مگر میں نے اس کی خاطر پھر شادی نہیں کی، بڑی محنت سے پالا پوسا۔ اب بالغ ہوا تو چھوڑ کر چلا گیا اور میں اُسے روک نہیں سکتی۔ صرف ایک حسرت ہے جس نے میرے دُکھوں کے احساس میں اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔ اس لئے کہ یہاں کی تعلیم کی دو خصوصیات ہیں، اوّل بچوں کو جوڑا جوڑا کر دیا جاتا ہے، دوم والدین سے بھی آزادی کا سبق دیا جاتا ہے اگر بچہ سکول میں شکایت کرے کہ مجھے والدین نے جھڑکا ہے یا سزا دی ہے تو وہ پولیس کو اطلاع کرتے ہیں اور بعض اوقات والدین کو جیل جانا پڑتا ہے یا اُن سے بچے لے لئے جاتے ہیں۔ اس کا اثر بچوں میں جدید تعلیمی خیالات کے ساتھ اخلاقیات کی تباہی پہ منتج ہوتا ہے۔

میرے پاس ییلو پیجز ڈائریکٹری (YELLOW PAGES DIRECTORY) میز پہ پڑی ہے یہ اگرچہ بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان کے لئے ہے مگر اس میں امریکہ کے مختلف حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے صفحہ نمبر ۶۴ پر تیرہ سے انیس برس کی عمر کے بچے اور بچیوں کی اخلاقی صورت حال بتائی گئی ہے جون ۱۹۸۰ء کے مطابق یہ ہے کہ پچھتر فیصد جنسی بے راہ روی میں مبتلا پائے گئے۔ اب ۱۹۹۰ء کی آمد آمد ہے اور یہ دس سال بہت تیزی سے ترقی کرنے کے ہیں۔ اب صورتحال کیا ہوگی؟ اندازہ کریں۔ اگلے صفحہ پر بزرگوں کی حالت بتائی گئی ہے کہ بہت امیر لوگ والدین کو نرس مہیا کر دیتے ہیں، متوسط، بوڑھوں کے ہوسٹل میں بھیج دیتے ہیں اور نچلے طبقے کے لوگ اُن سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

کم سنی میں اخلاقی بے راہروی کے نتیجہ میں حاملہ ہونے والی بچیوں کی تعداد دس لاکھ سالانہ بتائی جاتی ہے جس میں سے چھ لاکھ بچے پیدا کرتی ہیں اور چار لاکھ ضائع کرادیتی ہیں۔ یہ بھی دس سال پرانی خبر ہے۔ یہاں بغیر باپ کے لوگوں کو گلیوں کا ثمر (FROM STREET) کہا جاتا ہے۔ چوری، راہزنی اور قتل سے کسی وقت کوئی محفوظ نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ حکومت کے کارندے بھی رات دن دوڑ دھوپ میں لگے رہتے ہیں جیسے اب اپنے لوگوں کو چین سے نکالنے کے لئے حکومت پوری طرح کوشاں ہے۔

کل ایک عزیز ڈاکٹر صاحب کے ہاں دوپہر کا کھانا تھا۔ وہاں دوسرے ڈاکٹر صاحب یہاں کی حالت بیان کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ میرے پاس مریض آیا اسے دیکھنے لگا تو فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے کہا ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں چونکہ فون ساتھ کے دوسرے کمرے میں تھا۔ میں فون سن کر پلٹا تو نہ مریض تھا نہ میرا جیکٹ جو میز پہ رکھا تھا بلکہ میز پر جو پنکھا چل رہا تھا وہ بھی مریض لیتا گیا۔ اور دوسرے ڈاکٹر صاحب کی نئی کار کا شیشہ توڑ کر کوئی ریڈیو ٹیپ وغیرہ نکال کرلے گیا۔ یہ رات کا واقعہ ہے۔

بہرحال یہ اللہ کی عظمت سے دُوری کے نتائج ہیں جنہیں روکنا حکومت کے بس کی بات نہیں۔ اقتصادی نظام بھی بہت سخت ہے جس قدر کوئی کماتا جائے اُس قدر اخراجات کے مواقع بھی اس سے سرمایہ چھیننے کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں اور بہت کم لوگ سرمایہ جمع کرسکتے ہیں۔ لیکن عموماً وہ بھی اپنی اولاد اس معاشرے میں گُم کر بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا سرمایہ لے کر کہیں نہیں جاسکتے۔

سُورج یہاں بھی بہرحال اُبھرتا ڈوبتا رہتا ہے اور تاریکی اگرچہ بہت گہری، رات بہت لمبی ہوتی جارہی ہے مگر روشنی کی کرنیں بھی نظر آسکتی ہیں۔

دراصل مغرب کا اصلی مرض یہودی ہے جس نے ہوشیاری سے اقتصادی ڈھانچہ ایسا ترتیب دیا ہے کہ روپیہ سب سے نکل کر اس کی جیب میں گرتا رہتا ہے۔ اور ان لوگوں کو شراب اور خنزیر کا عادی کرکے ان کے اخلاق کا جنازہ نکال دیا ہے۔ سب کچھ بیچتا ہے مگر کھاتا نہیں بلکہ اپنا حلال جسے وہ کوشر کہتا ہے استعمال کرتا ہے اور سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ مغرب پر اسقدر چھا چکا ہے کہ یہ لوگ اس ڈاکو کو اپنا نجات دہندہ سمجھ بیٹھے ہیں اور یہ اس معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے جو نشے میں مدہوش اس کے اشارے پر ناچ رہا ہے۔

آج صُبح میں بہت دیر تک ایک یہودی مبلّغ کی بحث ٹیلی ویژن پر دیکھتا رہا جو جگہ جگہ کتاب کے حوالے بھی پیش کر رہا تھا۔ جس کا ماحصل یہ تھا کہ یہودیت کے علاوہ بظاہر بھی کوئی جائے پناہ نہیں۔ اُس نے ہٹلر سے شروع کرکے لینن اور مارکس کو بھی نشانہ بنایا کہ انھوں نے یہودیت کے خلاف اقدام کئے تو گاڈ نے انہیں تباہ کردیا۔ اب رُوس کے جدید حالات، زلزلوں سے تباہی، ایٹمی بجلی گھر کا حادثہ اور گاڑی کا حادثہ بھی اپنی دلیل کے طور پر دُہرا رہا تھا۔ پھر چین کی خانہ جنگی (جو چند روز سے شروع ہے) پر پہنچا اور آخر میں اسرائیلی ریاست پر گاڈ کی رضامندی کے طور پر بتا رہا تھا۔ کہ ایک ایکڑ زمین میں سے اٹھائیس ٹن ٹماٹر حاصل ہوئے۔

یہ سارا بیان بظاہر مدلل اور بڑا پُرکشش تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش مسلمان اس ڈوبتے سورج کو سہارا دے سکتے۔ کاش! اس بجھتے چراغ کو یہودیت کے جھکڑوں سے بچانے کی سعی کرتے۔ اے کاش! قرونِ اولیٰ کا کردار واپس لاکر ثابت کرسکتے کہ امان اسلام کے دامن میں ہے اور سکون اسی کے ٹھنڈے اور معطر سائے میں مگر مسلمان تو خود ان کے پیچھے بھاگنے میں لگا ہوا ہے۔ خود اپنی منزل

سے مخالف سمت دوڑتا جا رہا ہے۔ مولوی، پیر اور بزرگ تک اس سیلاب میں بہہ رہے ہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ! یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ اپنی پارسائی کا ڈھنڈورا پیٹوں بلکہ اس درد سے کہہ رہا ہوں جو مجھے محسوس ہو رہا ہے۔

ملک میں سرکاری اور حکومتی سطح پر تمام دعووں کے باوجود اسلام کو نصابِ تعلیم میں شامل نہیں کیا گیا اور نہ دینی تعلیم کی اربابِ حکومت کے ہاں کوئی اہمیت ہے لہٰذا بیشتر لوگ ساری عمر دین کے علم سے نا آشنا رہتے ہیں۔ اور دینی علوم کی طرف اکثر وہ لوگ متوجہ ہوتے ہیں جو معاشرے میں جگہ پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا کچھ سرمایہ جمع کر کے کوشش کرتے ہیں کہ اولاد کو تہذیبِ جدید کی آغوش میں پہنچا سکیں۔ ایسی اکثریت خواہ اُن کے نام کے ساتھ علامہ لگتا ہو یا پیر، ان میں ہر ایک اپنی ساری کوشش اسی میں صرف کرتا ہے اور دین کے نام پر سرمایہ جمع کرنے کی تدبیریں کرتا رہتا ہے۔ سوائے اللہ کے نیک بندوں کے جو اس ہجوم میں بہت ہی کم ہیں اور علمی گھرانوں کے چشم و چراغ علم جن کا پیشہ نہیں وراثت ہے۔

میں کیا ہوں؟ ایک مُشتِ غبار جس میں کنکر بھی ہیں کانٹے بھی اور جس کا دامن ہر خوبی سے خالی ہے صرف ایک جذبہ ایک درد کا امین، جو ایک مردِ خدا کی جوتیوں سے مَس ہو کر نصیب ہو گیا اور یہ محض اللہ کی عطا ہے۔ ورنہ میں آج بھی اس قابل نہیں کہ اتنی بڑی دولت مجھے بخشی جائے اور پھر اس کو لٹانے اور انسانیت تک پہنچانے پہ نوکری لگی تو وہ کام کر رہا ہوں۔

گزشتہ اوراق کے بیانات میں ذکر، ضرورتِ ذکر اور توجہ وغیرہ پر گزارشات پیش کر چکا ہوں۔ اور اسی دولت کو دوسروں تک پہنچانے کی سعی ملک میں بھی اور بیرونِ ملک بھی میرا مشن ہے۔ اللہ کرے اسے علماء اور پیر حضرات بھی حاصل کر لیں۔

اور دوسروں تک پہنچائیں تو ایک بار پھر اس چمن میں بہار آ سکتی ہے جس کی عطر بیز فضاؤں میں کبھی انسانیت کو سکون نصیب ہوا تھا۔ اور الحمدللہ! تھوڑے سہی مگر برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ممالک سمیت امریکہ اور کینیڈا کے اکثر بڑے شہروں میں اللہ اللہ کرنے والے لوگ ہیں۔ اللہ انہیں استقامت دے تو ممکن ہے کبھی یہی چمکتی ہوئی کرنیں سورج کی آمد کا پیش خیمہ بن جائیں۔

بہرحال اب آگے دیکھئے، کیا ہوتا ہے۔ کل کینیڈا جانے کا پروگرام ہے۔ اللہ کریم توفیق بخشے اور خلوص کے ساتھ کچھ کام ہو سکے۔ صرف چند سہی، خواہ صرف ایک ہی ہو مگر ایک دل بھی تو ایسا ہو جو اللہ کی تجلیات سے روشن ہو اور جس کی ہر دھڑکن سے اس کے نام کی صدا آتی ہو۔ یہ کام ان فضاؤں میں اگرچہ بہت ہی مشکل ہے مگر ناممکن تو نہیں اور ہم پر بحیثیت اُمتِ مسلمہ انسانیت کو اللہ کی طرف بلانا، برائی سے روکنا اور بھلائی کی بات پہنچانا فرض بھی تو ہے۔ نتائج اللہ کریم کے دستِ قدرت میں ہیں، اور کوشش ہماری ہونی چاہیے خواہ مقابلتاً کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو کہ اللہ چاہے تو اسے بارآور کرنے پہ قادر ہے۔

۹ جون

کل ہم نیویارک سے یہاں مانٹریال پہنچے، جو کینیڈا کا ایک خوبصورت شہر ہے ہوائی سفر ایک گھنٹہ کا ہے اور سڑک کے راستے تقریباً چار صد میل فاصلہ ہے۔ پچھلی دفعہ ہم یہاں سے سڑک کے راستے واپس نیویارک گئے تھے۔ امریکہ کی خوبصورت ترین ہائی وے ہے۔ پہاڑ، وادیاں، سبزے پہ چرتے ہوئے ہرن، بہتے دریا اور خوبصورت قصبے راستے کی طوالت کا اندازہ ہی نہیں ہونے دیتے۔

کچھ احباب سڑک کے راستے بھی آ رہے ہیں کہ ہمیں یہاں سے ٹورنٹو اور پھر وہاں سے واپس نیویارک سڑک ہی سے جانا ہے۔ لہٰذا ایک آٹھ سیٹوں والی گاڑی میں آ رہے ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا کے مقامی لوگوں کے لئے تو آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں اور باہر سے آنے والے افراد کو چیک ضرور کیا جاتا ہے کاغذات کی پڑتال وغیرہ ہوتی ہے مگر کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ امیگریشن وغیرہ کے لئے عموماً خواتین ہی کام کرتی ہیں۔ چند مرد بھی ہوتے ہیں۔ مگر اکثر لڑکیاں یہ کام کرتی ہیں۔

کاغذات کی پڑتال سے فارغ ہو کر باہر آئے تو کسٹم آفیسرز میں خواتین بھی تھیں اور ایک ایسی خاتون بھی تھی جس کا قد شاید پورے تین فٹ بھی نہ ہو۔ ہشاش بشاش

وردی پہنے ڈیوٹی پہ کھڑی تھی۔ میں نے بھی اُسے خاص طور پر ہیلو کہا اور میں سوچ رہا تھا کہ اپنے یہاں تو اس سے بھیک منگوائی جاتی یا کسی کھاتے پیتے گھر کی ہوتی تو بھی زندگی کی نعمتوں سے محروم اور بیچاری کے نام سے زندگی کاٹتی۔ مگر ان لوگوں کو دیکھو! اسے بھی تعلیمی سہولت مہیا کی اور پھر دوسروں کے برابر ملازمت کا موقع دیا اور یوں وہ اپنی زندگی بالکل ایسی ہی گزار رہی ہے جیسی کینیڈا کا کوئی دوسرا شہری۔

یہاں امن و امان کی صورت بھی نسبتاً بہت بہتر ہے۔ چوری بھی کم ہے۔ اور لوگ راتوں کو باہر گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک فرق ضرور ہے۔ اس کے علاوہ تہذیب و اخلاق کا سُورج ڈوب چکا ہے اور اخلاقی دنیا میں ظلمتِ شب کا بسیرا بھی ہے اور اسی کو دن سمجھ لیا گیا ہے۔ اگرچہ ظلمتِ شب کا دامن بھی ستاروں کی چمک سے خالی نہیں۔ تہذیب کے ان کھنڈروں میں بھی کہیں کہیں کوئی انسان نظر آ ہی جاتا ہے جس نے چھوٹی سی خوبصورت اور سجی سجائی دُنیا بسا رکھی ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح ظلمتِ شب میں دُور کہیں چھوٹا سا ستارہ چمک کر راستے کی خبر اور زندگی کی نوید سُنانے کی سعی کرتا ہے۔ یہاں مانٹریال میں کل ایک شمارہ دیکھا جو بزمِ خواتین کے نام سے شائع ہوتا ہے اردو کا معیاری اور بلند پایہ ماہنامہ ہے۔ فریدہ واسطی صاحبہ شائع کرتی ہیں۔ جن کے ذوقِ ادب کی داد دینا پڑتی ہے۔

یوں بھی انگریزی بولتے بولتے منہ ٹیڑھا ہونے لگا تھا۔ اُردو کا شمارہ دیکھا تو آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ورق گردانی کی تو بہت کچھ پایا، خوبصورت شعر، عمدہ مضامین، نامور مسلمان خواتین کے حالات، احادیثِ مبارکہ کے پھول، لطیفے، طنز و مزاح اور اردو انگریزی روزناموں کی فوٹو سٹیٹ سے لے کر اشتہارات تک ہر شے ایک قرینے سے سجی ہے۔ یہ شمارہ جنوری، فروری کا ہے اور زندگی کے ہر پہلو پر تھوڑی بہت بحث

ضرور کرتا ہے اور سب کے حالات مضامین اور آرا۔ لکھ کر آخر میں فریدہ واسطی صاحبہ کا خوبصورت جملہ بہت سجتا ہے۔ "بزمِ خواتین میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارہ کا اتفاق کرنا یا نہ کرنا ضروری نہیں۔"

لو، کر لو گل!

اب آیئے! اس کے چند اشعار بھی پیش کر دوں کہ آپ نے بہت دیر تک میرے شکوے سُنے ہیں جو ایک صبر آزما کام ہے تو اس کے سرورق پہ "بیاضِ دل" ہے یہ موتی میں نے وہیں سے چُنے ہیں، ؎

یہ دیس ہے پتھر کا، کہیں اور چلا جا!
دیکھے گا یہاں کون تیری رُوح کے چھالے

کِس خوبصورتی سے تہذیبِ مغرب اور اس کے اثرات کو ایک مصرعے میں سمو دیا ہے۔ ہیلی فیکس سے چاندنی صاحبہ کی رُباعی بھی قابلِ داد ہے اور اس کا یہ معنیٰ بھی ہے کہ ان تک بزمِ خواتین کی رسائی بھی ہے تو سُنیئے ؎

ہمارے گھر میں یوں تو کیا نہیں ہے؟
بس اِتنا ہے کوئی رہتا نہیں ہے
تجھے چاہا ہے جس ساعت میں میں نے
وہ ساری عمر ہے، لمحہ نہیں ہے

شاید یہی لمحہ حقیقی عمر ہوتا ہے جس کا اختیار انسان کے بس میں ہے جب وہ راستہ منتخب کرتا ہے شکر کی راہ یا کفر کی تاریکیاں۔ شاہد دہلوی صاحب نے ایسٹ مانٹریال سے شعر کہا ہے جو اُن کے دہلوی ہونے کا گواہ لگتا ہے ؎

روٹھا ہی رہے مجھ سے، یہ منظور ہے لیکن
یارو! اسے سمجھاؤ، میرا شہر نہ چھوڑے

اور بیدم اوکاڑوی نے کتنی خوبصورت بات کہی ہے ؎

نام جو بھی ہو، نسب جو بھی ہو
تھا وہ اِک شخص عجب جو بھی ہو
اُس سے کہنا کبھی آئے مِلے
ہم سے رنجش کا سبب جو بھی ہو

بہرحال مجھے بہت اچھے لگے میں نے لکھ دیئے۔ ضروری نہیں کہ آپ بھی انھیں پسند کریں اور ویسے بھی لوگ مجھ سے تب تک متفق نہ ہو سکیں گے جب تک خود یہ سب کچھ دیکھ نہ لیں۔ میں بھی پاکستان میں بیٹھ کر بہت کچھ سُنتا تھا۔ یہاں آ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ جسے ہم دیوانے کی بَڑ جانتے تھے وہ نہ صرف سچ تھا بلکہ بہت تھوڑا حصہ تھا۔ سارا فسانہ سُنانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اب ہم کہتے ہیں تو لوگوں کا ردِ عمل بھی یہی ہوگا کہ خواہ مخواہ کہتے ہیں۔ وہ تو بہت خوبصورت دیس ہیں۔ اور ایک طرح سے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔

۱۰ جون

یہاں موسم میں ایک مزید خنکی ہے اور کل سے پھوار پڑ رہی ہے۔ ہر طرف سبزہ اور پھول ہیں۔ سڑکوں کی درمیانی روشوں پر، اکثر چورستوں پر محلّے یا آبادی کا نام خوبصورت پھول اگا کر لکھا گیا ہے اور تقریباً ہر دُوسرے کھمبے کے درمیان میں گملا لگا ہوا ہے جو پھولوں سے پٹا پڑا ہے۔

مانٹریال بہت دُور دُور تک پھیلا ہوا شہر ہے، دو دریا اسے کئی بار قطع کرتے ہیں۔ جن پر بہت خوبصورت اور بڑے بڑے آہنی پُل بنے ہوئے ہیں۔ یہاں کا ڈالر امریکی ڈالر سے ذرا کم قیمت کا ہے اور تمام مغربی ممالک میں یہاں تحفظ بہتر طور پر ہے۔

کل شام ایک کمیونٹی سنٹر میں مدعو تھے جس کا اہتمام ایک پاکستانی دوست نے کیا تھا۔ وہاں بات کرنے کا بہت وقت تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بیان ہوا اور کچھ دیر مختلف سوال وجواب لوگوں کی اکثریت پاکستان کی سیاسی صورتحال سے بہت متفکر ہے۔ جس کے بارے وہ بہت کچھ جاننے کے خواہشمند ہیں اور یہاں میں سیاست سے واقف ہی نہیں تھا۔ بہرحال اپنی عقل کے مطابق جو سمجھ میں آسکا وہ ضرور بتایا۔ اور پھر انسی صاحب کے ہاں کھانا بھی تھا۔ انھوں نے بہت پُرتکلف دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اگرچہ

مجھے تو پرہیزی کھانا ہی کھانا تھا۔ مگر ان کا اپنا شوق بھی تو تھا کہ مہمانداری اور میزبانی تو ہمارے ملک کی خصوصیات میں سے ہے اور پھر اعوان قبیلے سے تھے جو ایک قدیم عرب قبیلہ ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہے شکار، بندوقیں اور مہمان نوازی ان کے مشترکہ مشاغل ہیں خواہ دُنیا کے کسی حصّہ میں ہوں۔

رات دیر سے لوٹے۔ اگرچہ انھوں نے وعدہ لیا تھا کہ اگر پروگرام بن سکے تو صبح آئیے، بن کی سیر کو چلیں گے۔ یہاں قریب ہی سے جنگل شروع ہو جاتا ہے جس میں بلند وبالا پہاڑ، خوبصورت وادیاں اور نظر فریب جھیلیں ہیں۔ مگر مَیں طبیعت میں تھکن پاتا ہوں، اس لئے کہیں جانے کا پروگرام نہیں بن رہا۔ ابھی کل تک یہاں ٹھہرنا ہے پھر دیکھیں جو اللہ کو منظور ہوگا کہ انسان محض ایک عاجز بندہ ہے بے حیثیت اور کمزور۔

۱۲ جون

کل صُبح ملک صاحب ہمیں باہر لے ہی گئے۔ بہت خوبصورت علاقہ ہے۔
شہر کے ساتھ ہی زرعی رقبہ شروع ہو جاتا ہے جو بہت زرخیز ہے اور سبزیاں مختلف
پھُول اور غلّہ بہت کثرت سے ہوتا ہے بلکہ کاشتکاروں کو اکثر زمین تیار کرنے پر مناسب
رقم حکومت کی طرف سے مل جاتی ہے کہ کاشت نہ کریں۔ پہلے ہی غلّہ وافر ہوتا ہے،
جو یہ لوگ سمندر میں پھینکتے رہتے ہیں۔ زرعی مشینری بھی بہت ہے چھوٹے بڑے ٹریکٹروں
کے ساتھ بے شمار قسم کے پُرزے لگا کر مختلف کام لئے جاتے ہیں۔

شہر سے تھوڑی دُور شمال میں پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یوں تو مانٹریال
شہر وادیوں اور پہاڑیوں پر ہی پھیلا ہوا ہے جسے دو دریا کم از کم دو دو بار قطع کرتے
ہیں جن پر خوبصورت پل ہیں مگر باہر ذرا بلند اور نسبتاً زیادہ پہاڑی علاقہ شروع ہوتا ہے
اس ملک میں امن و امان کی حالت بہت بہتر ہے۔ جنگل جھیلوں اور دریاؤں سے پٹے
پڑے ہیں اور وادیوں، چوٹیوں، جھیلوں کے کناروں پر شہر کے لوگوں نے بھی خوبصورت
گھر بنا رکھے ہیں۔ جہاں وہ چھٹیاں گزارنے جاتے ہیں۔ ہفتہ اتوار دو روز چھٹی ہوتی
ہے جو باہر گزارتے ہیں اور پھر واپس آ جاتے ہیں۔

یہاں عام آدمی کو پس انداز کرنے کی عادت نہیں غالباً انھیں ضرورت نہیں
پڑتی۔ اگر حادثہ یا بیماری آ لے تو حکومت الاؤنس وغیرہ دیتی ہے۔ للٰذا سب کچھ خرچ
کرتے رہتے ہیں۔ ذاتی کشتیاں لے جاتے ہیں وہاں کرائے پر مل سکتی ہیں ان میں
سیر کرتے ہیں۔ مچھلیاں پکڑتے ہیں جو بہت لذیذ ہوتی ہیں۔ پارکیں اور جھولے بنے ہوئے
ہیں اور ہر اکیلے گھر کو بھی بجلی، پانی، ٹیلیفون وغیرہ کی سہولت مہیا ہے۔ پہاڑوں پر
سکیٹنگ کرنے کی جگہیں بنی ہیں۔ جہاں الیکٹرک کاریں اُوپر لے جاتی ہیں اور پھر لوگ
برف پر پھسلتے ہوئے نیچے آتے ہیں۔ پیراکی کے لئے تالاب اور ان پر عجیب و غریب
تماشے بنے ہیں۔

ذرا آگے چل کر دیہات شروع ہو جاتے ہیں سڑکیں دو طرح کی ہیں۔ ایک
ہائی وے، جو بہت کھلی، دو رویہ سڑک ہے۔ جو سیدھی سیدھی چلتی ہے۔ دوسری سروس
روڈ جو مختلف دیہات سے ہو کر گزرتی ہے۔ دیہات اور شہروں میں سڑکوں، پارکوں،
ہسپتالوں، بجلی، پانی یا بازار کی دکانوں اور صفائی وغیرہ میں کوئی فرق نہیں، جو سہولت
شہری کو حاصل ہے دیہاتی کو بھی نصیب ہے۔

ہر طرف سبزہ ہی سبزہ پھیلا ہے۔ اُوپر پہنچ کر مختلف چشمے بہہ کر جھیلیں بناتے
ہیں جو آپس میں مل کر تقریباً گیارہ میل لمبی جھیل بن گئی ہے جو مختلف وادیوں میں گھومتی
پھر رہی ہے اور رنگا رنگ کشتیوں میں لوگ سیر کرتے ہیں۔ جنگل میں غسلخانے اور بیٹھنے
کی جگہیں بنی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اُوپر پہنچ کر کھانا کھایا جو ملک صاحب ساتھ لائے تھے۔
وہ بتلاتے رہے کہ یہاں سبزہ ہوتا ہے یا پھر برف کی سفیدی، یہ پہاڑی علاقہ شمال میں
بہت دُور تک جاتا ہے۔ یہاں سے دو سو میل آگے جائیں تو وہاں روئیدگی بہت تیزی
سے ہوتی ہے اگرچہ یہاں بھی بہت ہے مگر وہاں تو آدمی پودے کو بڑھتا ہوا محسوس کرتا

ہے آجکل وہاں طرح طرح کے پرندے ہزاروں میل سفر کر کے پہنچتے ہیں۔ بے شمار جانور ہرن وغیرہ کی مختلف اقسام اور ہر طرح کے درندے جمع ہوتے ہیں۔

وہاں آجکل سُورج غروب نہیں ہوتا اور چھ مہینے کا طویل دن ہوتا ہے لہٰذا دو تین ماہ جانوروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے جو بچے دیتے ہیں اور پھر انہیں ساتھ لے کر چلے جاتے ہیں۔ واپس جہاں سے آئے تھے۔ پہاڑ، وادیاں، دریا اور نالے عبور کر کے واپس پہنچ جاتے ہیں۔ آجکل ریچھ بھی متحرک ہوتا ہے جو ساری سردیاں پڑا سوتا ہے اور مہینوں کچھ کھائے پیئے بغیر سوتا ہے آجکل بھرپُور زندگی گزارتا ہے جب سردیاں شروع ہوتی ہیں، تو سب جانور غائب، کوئی نظر نہیں آتا سوائے ریچھ خرگوش یا چند مقامی جانوروں کے۔ اور انہیں اللہ کریم نے عجیب اوصاف بخشے ہیں۔ برف پر یہ سفید ہو جاتے ہیں اور جب برف نہیں رہتی تو بھورے۔ قُدرتی طور پر بالوں میں وہی رنگ آجاتا ہے۔ مچھلی کی بے شمار اقسام دریاؤں کو چیرتی ہوئی وہاں پہنچتی ہیں۔ انڈے دیتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں۔ سردی کی اپنی بہار ہوتی ہے اور لوگ برف سے بھی بہت لُطف لیتے ہیں اور سیر، مچھلی کا شکار اور سکیٹنگ وغیرہ جو بن پہ ہوتے ہیں۔

یہاں سے مزید آگے جائیں تو تقریباً سات سو میل سے وہ بلندی شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں درخت نہیں اُگتے اور سنگلاخ پہاڑوں کی دُنیا ہے۔ سارا علاقہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سردیوں کی طویل راتوں میں یہاں رنگ و نُور کی بوچھاڑ ہوتی ہے ایک روشنی پھیلتی ہے تو سب وادیاں جگمگا اٹھتی ہیں۔ انہیں "NORTH LIGHTS" یعنی قطبی روشنیاں کہتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی توجیح تا حال جدید سائنس بھی نہیں کر سکی۔ یہ خلاقِ عالم کی صنعت کے ایسے گوشے اور پہلو ہیں جو عقل نارسا کی رسائی سے بلند ہیں اور اس کی پہنچ سے باہر، مگر ان حسین وادیوں میں، ان سُنہری جھیلوں میں سرسبز

میدانوں اور برف پوش خوبصورت اور روشن پہاڑوں میں بسنے والے اپنے خالق سے بیگانہ ہیں، ان کے حُسن کو اپنی بے راہ روی سے آلودہ کر رکھا ہے اور خوبصورت لمحوں کو گناہ کی دلدل میں غرق کیے جا رہے ہیں۔ مسلمان جس کے ذمہ انسانیت کو سنبھالا دینا تھا اپنے اصل سے ٹوٹ کر ان ہی کی طرح حرص اور نفس کی خواہشات کا اسیر نظر آتا ہے خود ڈوب رہا ہے تو دوسرے کا ہاتھ کب تھام سکے گا؟

بہرحال کھانے کے بعد واپسی کا سفر تیزی سے طے کیا اور ظہر مسجد میں ادا کی بیان تھا، "نئی نسل اور اس کی اصلاح کا طریق کار"۔ موضوع تھا جو گھنٹہ بھر سے زیادہ رہا۔ یہ سامعین کی طلب پر کیا گیا جسے اب یہاں نقل کرنا مشکل ہے کہ اب ٹور ختم ہونے کے لئے پا بہ رکاب ہیں۔ کار سے جا رہے ہیں کہ راستے کا حُسن بھی لُوٹتے جائیں۔ پھر عصر سے پہلے ایک اور مسجد میں بیان تھا جہاں تک کے لئے گھنٹہ بھر کا راستہ تھا۔ اور لطف یہ کہ مطالبہ ان کا بھی یہی تھا۔ لہٰذا اسی موضوع پر بات ہوئی۔

واقعی یہ مسئلہ یہاں بہت ہیبت ناک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے جس کے چہرے سے نقاب ہٹا کر میں نہ اپنی سیر کا لُطف گنوانا چاہتا ہوں نہ آپ کو بے مزہ کرنا گوارا ہے۔ ہاں! خلاصہ بتا دوں کہ میں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ والدین اپنی اصلاح کی فکر کریں۔ ضرُوریات کے بارے علم حاصل کریں اور عملی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں نہ صرف آپ کے بچے بلکہ کفار بھی اسلام کی طرف مائل ہوں گے۔ اور صورتحال بالکل بدل جائے گی۔ اب آپ خطرہ محسُوس کرتے ہیں کہ کفر ہم سے ہماری نسل نہ چھین لے پھر کافروں کو فکر لاحق ہو جائے گی کہ اسلام تو ہمارے گھروں میں داخل ہو رہا ہے۔

اس پر مختلف پہلوؤں سے بحث، دلائل اور مثالیں۔ دو گھنٹے کی گفتگو تھی۔

مگر الحمدللہ! بہت دوستوں کو پسند آئی. توفیق اللہ کریم کے دستِ کرم میں ہے. دُعا کی جاسکتی ہے اور کی جانی چاہیئے کہ ربِ جلیل مسلمانوں کے قلوب کو پھر سے زندہ کردے، اس مُشتِ غبار کو پھر جراٰت رندانہ بخشے، اپنی طلب اور ذوقِ جمال عطا فرمائے اور اسلام کے چمن میں پھر سے بہار آجائے۔ آمین!

اب ہماری روانگی کا وقت ہو رہا ہے اگر ہو سکا تو آپ کو راستے کی بھی اور ٹورنٹو کی بھی سیر کراؤں گا۔ دیکھئے! کیا ہوتا ہے. روشنیاں، صاف فضائیں اور دلی کیفیات پہ اک شعر موزوں ہو گیا چاہیں تو آپ بھی سُن لیں ؂

آتی ہے نظر گنبدِ خضرا کی روشنی
پھیلی ہے چار سُو شہ بطحا۔ کی روشنی

آج سفر لمبا ہے ممکن ہے اللہ کرے نعت بن جائے تو آپ کو ضرور سناؤں گا انشاءاللہ!

۱۳، جون

مانٹریال سے نکل کر ہائی وے پہ چل پڑے تقریباً تین سو پچیس (۳۲۵) میل سفر تھا لہٰذا بہت تیزی سے چلتے رہے۔ دریا ساتھ ساتھ بہتا ہے جو بہت بڑا ہے اور راستے میں مختلف جگہ پھیل کر بہت بڑی بڑی جھیلیں بناتا ہے جن کے کنارے تفریح گاہیں اور سستانے کی جگہیں بنی ہیں۔

ایک جگہ بہت بڑی جھیل میں ہزار سے زائد جزیرے ہیں. چھوٹے چھوٹے پہاڑی اُبھار جو درختوں سے لدے ہیں. ان سب میں تفریح گاہیں بنی ہیں۔ ان کا نام ہی ہزار جزیرہ (THOUSAND ISLAND) ہے. اس کے درمیان میں ایک بہت خوبصورت پُل ہے اور دوسری طرف بھی کینیڈا کی تھوڑی سی زمین ہے بس میں پارک بنا ہوا ہے. پُل پر سے دونوں طرف جزیروں کا خوبصورت منظر ہے اور رنگ برنگی کشتیاں اور خوبصورت جہاز سیاحوں اور سیر کے طلبگاروں کو دامن میں بھرے پھرتے نظر آتے ہیں ہم نے بھی فیصلہ کیا کہ یہ جگہ ضرور دیکھیں گے۔

بڑے غور سے نقشے پڑھے گئے۔ اور ہائی وے چھوڑ کر پُل کا رُخ کیا. پُل سے گزر گئے. سامنے خوبصورت پارک تھا اسے دیکھتے دیکھتے آگے بڑھتے گئے. تب پتہ

چلا جب ہم امریکہ کی سرحدی چوکی پر تھے کیونکہ یہاں کینیڈا کی جگہ تھوڑی سی تھی آگے
سرحد تھی سب کو غلطی کا احساس ضرور ہوا مگر وہ تو ہو چکی تھی۔ سرحدی محافظ نے کھڑکی
سے لگ کر پوچھا،

"جناب! کیا ارادے ہیں؟"

ڈرائیور صاحب تو امریکہ کے باشندے تھے انھوں نے اپنا بتایا، ہمارے
بارے بتایا کہ یہ پاکستان سے ہیں اور ٹورنٹو جا رہے تھے غلطی سے یہاں آ گئے ہیں۔
اُس نے بڑے مزے سے کہا،

"تم لوگوں نے غلطی کی ہے مگر میں نہیں کروں گا، لہٰذا گاڑی ایک طرف
کھڑی کریں اور سب کاغذات لے کر دفتر آئیں!"

مرتا کیا نہ کرتا، دفتر میں ڈیڑھ گھنٹہ کی چیکنگ کے بعد مطمئن ہو کر اُس نے
کہا، "آگے سے پلٹ کر چلے جاؤ!"

خوش ہوئے کہ چلو خیر ہے مگر واپسی والی سڑک کینیڈا کے کسٹم آفس پر لے گئی
انھوں نے حالِ زار سُنا تو تڑپ گئے۔ اندر بلایا اور کارروائی پر اتنا ہی وقت وہاں لگ
گیا۔ نئے سرے سے ویزے پر مُہریں لگیں بلکہ گاڑی کی تلاشی فالتو۔ یوں تین گھنٹے خوار
ہو کر ہم سیر کا وقت ضائع کر چکے تھے۔ بس یہ اطمینان تھا کہ ہم شریف لوگ ہیں اور
بار بار کی چیکنگ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔

اگرچہ سیر کا وقت نہ تھا مگر کھانا بہرحال کھانا تھا اور دوپہر کا ایک بج رہا
تھا ایک دریا پارک کی طرف مُڑے۔ جہاں سامنے جھیل تو تھی پُل وغیرہ نہیں تھا۔ کہ
اب مزید کسٹم کی ہمت نہ تھی۔ کنارِ دریا چھوٹا سا گاؤں تھا سجا سجایا روانہ ہوتے
راستے میں ایک جگہ پٹرول ڈلوایا سب نے وضو کیا اور ظہر ادا کی۔ ہم نماز کی تیاری

کر رہے تھے تو دو نو عمر بچیاں سائیکلوں پہ سوار آ نکلیں۔ پوچھا،

"کیا کرو گے؟"

کہا، "اللہ کی عبادت کریں گے۔"

کہنے لگیں، "ہم دیکھ سکتی ہیں؟" کہا، "ضرور!"

چنانچہ وہ بیٹھ گئیں۔ ہم نے باجماعت دوگانہ ادا کیا، دُعا مانگی تو کہنے لگیں،

"پوری ہو گئی؟" کہا، "ہو گئی"

تو کہنے لگیں، "بہت خوبصورت نظم و ضبط سے ادا ہوئی، آپ اِدھر سے جب بھی
گزریں تو یہاں یہ کیا کریں!"

عظمت نے پوچھ لیا، کہ تم دُعا نہیں کرتی ہو؟ تو ایک نے کہا،

"میرا تو خدا ہی نہیں! نہ مجھے علم ہے۔ ہاں، یہ عیسائی ہے۔"

دوسری نے کہا، "میرا خدا ہے کبھی کبھی دُعا کیا کرتی ہوں۔"

اور یوں اُن سے رخصت ہو کر آگے چلے۔

سارا کینیڈا خوبصورت سبزہ زاروں، گھنے جنگلوں اور خوبصورت وادیوں کا
دیس ہے۔ لوگ عموماً لکڑی ہی سے سارا گھر بناتے ہیں اور دیواروں پہ خوبصورت کاغذ
چسپاں کر لیتے ہیں۔ راستہ خوبصورت موٹروں سے یوں بھرا ہوتا ہے جیسے سیلاب رواں
ہو۔ ایک قسم کا گھر بناتے ہیں جسے بڑے بڑے ٹرکوں پہ لاد کر جہاں جی چاہا لے گئے اور
اور وہاں بس گئے۔

اب مجھے مزید شعر موزوں کرنے کی سوجھی تو یہ راستے میں لکھے جن پر نظرِ ثانی
کرنا باقی ہے مگر آپ سے کیا پردہ؟ آپ سُن لیں پھر دیکھی جائے گی



برفانی چیتے کا شکار



آتی ہے نظر گنبدِ خضرا کی روشنی
پھیلی ہے چار سُو شہِ بطحا کی روشنی

روشن ہے اُن کے نام سے سارے جہاں میں
مومن کا دل بھی اور دلِ بینا کی روشنی

مغرب کی روشنی میں ہیں تاریکیاں بہت
چھینی ہے ظلمتوں نے چشمِ وا کی روشنی

ننگے بدن ہیں چاک گریباں ہے کوئی
وحشت نصیب ہے انہیں لٹوا کے روشنی

ہے جنس اور مال کا رشتہ فقط یہاں
گم نسب بھی ہُوا گئی وفا کی روشنی

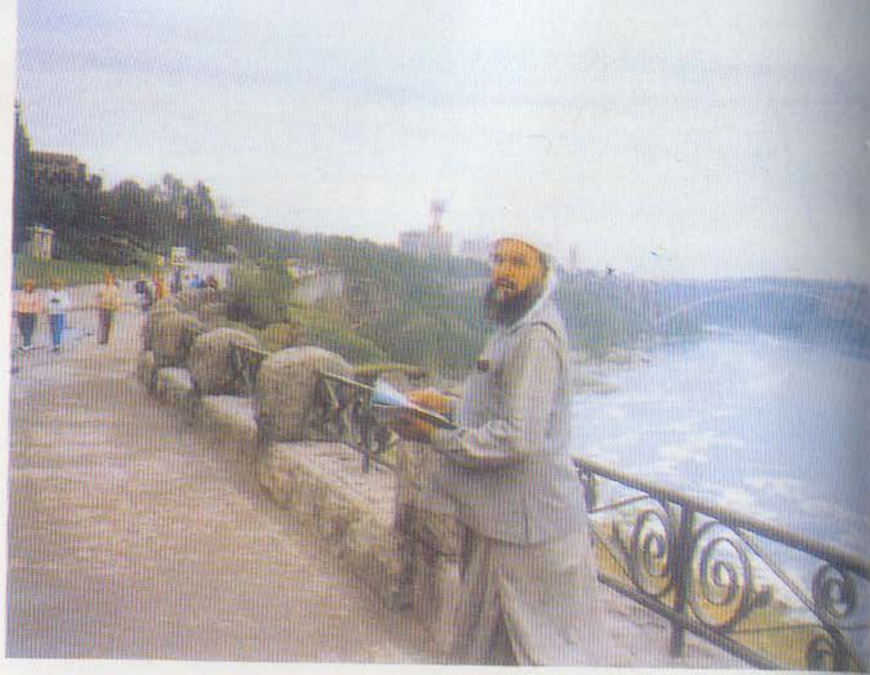
سب کہہ نہیں سکتا کوئی آتا ہے جو نظر
مانع ہے لب کشائی سے حیا کی روشنی

اس پتھروں کے دیس میں خادم ترے حبیبؐ
پاتے ہیں نور دل میں اور آقا کی روشنی

دل میں تڑپ ہے، سوز ہے سجدے میں آج بھی
آنکھوں میں تیرے نقشِ کفِ پا کی روشنی

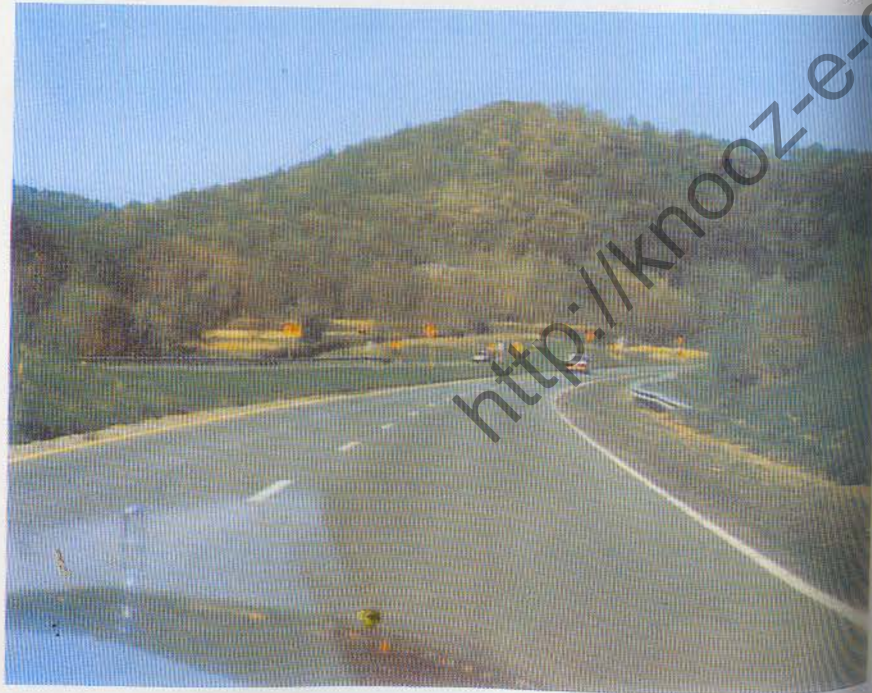
کتنا رفیع مقام ہے اُن کا خدا گواہ
ہر طرف اُن کے کرم سے برسا کی روشنی

اللہ کرے کہ سینۂ مُسلم ہو نورُ بار
یوں جس سے اِک جہان میں پھیلا کی روشنی



نیاگرہ آبشار

امریکہ ہائی وے کا منظر



مجھ سے فقیر کو ملے نظرِ کرم کی بھیک
تیرے حریم ناز کی طیبہ کی روشنی

ممکن ہے نقاد حضرات کو ان اشعار میں فنی کمزوریاں نظر آئیں کہ مجھے شاعری پہ عبور کا دعویٰ نہیں، ہاں! اپنے جذبات کو الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش ضرور کی ہے اور آفرین ہے ان کی رحمت پہ کہ اس ظلمت کدے میں بھی طالبوں کے دل روشن ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم

عصر ٹورنٹو آکر پڑھی۔ یہاں ہمارے عزیز جمال میاں[1] نے ایک بہت بڑی عمارت کی اٹھارویں منزل پہ ہمارے قیام کے لئے فلیٹ خالی کر رکھا تھا۔ رات آرام کیا اور صبح شہر کی سیر کو گئے۔ سینکڑوں میلوں میں یہ شہر وادیوں، جھیلوں اور پہاڑوں پر پھیلا ہوا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا چڑیا گھر یہاں ہے۔ آپ ایک بازار سے دوسرے بازار جانا چاہیں تو کبھی گہری وادی میں اتر جائیے جہاں پلوں پر اوپر نیچے گاڑیاں دوڑ رہی ہیں اور ہر طرف گھنا جنگل ہے چند میل بعد جب اوپر ابھرتے ہیں تو فلک بوس عمارتوں میں گھرا بازار آجاتا ہے اور دوسری طرف جانا چاہیں تو پھر یہی حال۔

بڑی عجیب دنیا ہے۔ ہم ایک سٹور میں گئے۔ میلوں لمبا ایک ہی سٹور ہے اور میلوں ہی لمبی غالباً آٹھ منزلیں ہیں جن میں دنیا کی ہر چیز ملتی ہے۔ کروڑوں روپے کا تو شیشہ ہی لگا ہے حتیٰ کہ شیشے کی لفٹ بھی شیشے کے گھر میں نصب اوپر نیچے دوڑ رہی ہے۔ خودکار زینے لوگوں کی بھیڑ کو اوپر نیچے بھگائے پھرتے ہیں۔ ہمیں تو اس میں گم ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ واقعی مجھ جیسا آدمی بچھڑ جاتے تو پتہ نہیں کس سمت جا نکلے گا۔ اسی کی سیر میں دن کے دو بج گئے اور واپس چلے تو تین بجے مکان پر

[1] تاج رحیم صاحب کے صاحبزادے ہیں

پہنچے، کھانا کھا کر آرام کیا۔ اب یہ چند سطور لکھی ہیں۔

رہی یہاں کی اخلاقی کیفیت؛ تو وہ حسبِ سابق ہے یا کچھ بڑھ کر۔ اور یہ بھی ہے کہ یہاں مسلمان نسبتاً زیادہ ہیں مساجد میں لڑائی کا رواج بھی ہے اور ایک دوسرے کو کافر بتانے کی سعی بھی۔ اللہ ان پر رحم فرمائے! ہمارا پروگرام صرف ایسے حضرات سے ملاقات کا ہے جو گھر پہ آجائیں کہ اب علماء سے اُلجھنے کی مزید ہمت نہیں، نہ اس میں کوئی فائدہ نظر آتا ہے۔

انشاء اللہ کل یہاں سے روانہ ہو کر نیاگرا کی آبشار کو دیکھتے امریکہ میں داخل ہوں گے اور رات قیام البانی میں ہوگا۔ پرسوں نیویارک اور اگلی شام PIA میں واپس روانہ ہو جائیں گے۔

۱۷ جون

پی آئی اے کا طیارہ کل شام دس بجے نیویارک سے اُڑا تھا۔ اب امریکی وقت کے مطابق صبح کے پانچ بج رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ پیرس پہنچنے والا ہے۔ یہاں سے فرینکفرٹ جائے گا اور پھر اسلام آباد انشاء اللہ!

ٹورنٹو میں آخری رات کچھ احباب سے کھانے پہ ملاقات ہوئی ضرورتِ ذکر پہ بات بھی ہوئی اور کچھ افراد کو ذکر کی توفیق بھی۔ اللہ قادر ہے جو چاہے کرے۔ یہاں کا ماحول دیکھ کر ذکر کی دعوت یوں لگتی ہے جیسے جہنم میں اذان، بس اتنا فرق ہے کہ اُخروی جہنم کی نسبت یہاں انسان کے پاس واپسی کا دروازہ کھلا ہے اور جب ذکر کی محفلیں جمتی ہیں۔ لوگوں کو تجلیات و انوارات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ بارگاہِ نبوت کی زیارات سے مشرف ہوتے ہیں تو ذکرِ الٰہی کی برکات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اللہ کریم کا احسانِ عظیم ہے کہ مجھ سے بدکار کو اس خدمت کی توفیق بخشی۔ الحمدللہ!

علی الصبح ٹورنٹو سے روانگی ہوئی۔ یہ بات تاحال سمجھ میں نہیں آسکی کہ شہر میں جنگل ہیں یا جنگلوں میں شہر بسا ہے گہری وادیاں ہر طرف گھنا جنگل اور درمیان میں اُوپر نیچے تین تین، چار چار سڑکیں، موٹروں کی بھیڑ اور پھر سامنے بلند و بالا عمارتیں اور

بازار شروع ہو جاتے ہیں۔ میں ڈیڑھ گھنٹہ تک دیکھتا رہا مجھے شہر کی ابتدا سمجھ میں آئی نہ انتہا کا پتہ چل سکا۔ پھر آنکھ لگ گئی۔ جاگا تو ہم نیاگرا کی مشہور آبشار کے قریب پہنچ چکے تھے۔

سبحان اللہ! وہاں کا اپنا حُسن ہے۔ بہت بڑا ریلا ایک بلندی سے آکر گرتا ہے۔ ایک کنارا کینیڈا میں اور دُوسرا امریکہ میں ہے۔ خوبصورت آبادی، پارک، چڑیا گھر بچوں کے لئے جھولے اور بادلوں میں چھُپے ہوٹل، ایک مینار جو تقریباً سو منزل کے قریب بلند ہوگا۔ اس کے اُوپر چھتری نما ہوٹل ہے جو اُوپر سے گھومتا رہتا ہے۔ ایسا ہی ٹورنٹو شہر کے درمیان میں بھی تھا۔ آپ بیٹھ کر چائے پئیں اور چار سُو کا نظارہ بھی کریں۔ ہم کوئی تین گھنٹے تک پھرتے رہے۔ اور پھر سرحد عبور کی۔

دوسری طرف بھی سیاحوں کی دلچسپی کے اسباب بے شمار ہیں۔ دونوں طرف عام چائے خانوں سے لے کر بہت بڑے بڑے ہوٹل ہیں اور دن بھر میلہ لگا رہتا ہے، خصوصاً چھٹیوں کے دنوں میں بہت بھیڑ ہوتی ہے حُسنِ فطرت کا نظارہ کرتے ہوئے وہاں سے نکلے کہ آج کا سفر تقریباً ساڑھے چار سو میل تھا اور رات البانی میں ٹھہرنا تھا۔ ساتھ بارش شروع ہو گئی جس نے البانی تک ساتھ نبھایا۔ سارا راستہ سرسبز اور گھنے درختوں سے پٹا پڑا ہے اور زرعی زمینیں ہیں جن میں جدید مشینی ذرائع سے کاشت ہوتی ہے۔

ذرا باہر بھی دیکھوں! اب جہاز جنوبی برطانیہ کے اوپر سے گزر رہا ہے اور اس زمین کا حُسن اپنا انداز رکھتا ہے۔ ہر طرف حُسنِ فطرت بکھرا پڑا ہے۔ شہر اور آبادیاں صُبح کے سُورج میں جگمگ جگمگ کرتی نظر آتی ہیں مگر ان زمینوں کے باسی اندر سے اجاڑ ویرانوں میں بدل چکے ہیں۔ اللہ سے دُور اور انسانی اقدار سے محروم! اللہ کریم سب

انسانوں کو اور بطورِ خاص مسلمانوں کو حق پہ چلنے کی توفیق بخشے۔

تو میں کچھ دیر باہر دیکھنے میں کھو گیا تھا معاف کیجئے گا! اب بات جاری رکھتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ ہم نے عصر البانی پہنچ کر ادا کی راستے میں دو جگہ رُک کے کھانا ساتھ تھا وہ کھایا ظہر کی نماز ادا کی۔ چائے پی اور برستی پھُوار میں چلتے رہے۔ البانی بہت سے لوگ ملنے کے مشتاق تھے۔ کچھ خواتین تھیں جو اسلام کے بارے جاننے کی آرزومند تھیں۔ ایک مسجد میں بیان تھا چنانچہ کرنل مطلوب صاحب کچھ دوستوں کے ہمراہ مسجد گئے اور خواتین کا اجتماع کرنل قیوم صاحب کے سپرُد کیا۔ خود مغرب کے بعد ذکر کرا سکا کہ بہت زیادہ تھک چکا تھا اور علی الصبح پھر ڈیڑھ سو میل سفر کر کے نیویارک پہنچنا تھا۔

الحمد للہ! بہت اچھا کام ہوا اور اب تین سال کے بعد ذاکرین کی قابلِ ذکر تعداد نظر آتی ہے۔ یہ شہر بھی ظاہری اعتبار سے بہت خوبصورت اور نیویارک کا دارالخلافہ ہے یعنی گورنر یہاں رہتا ہے امریکہ کا ملک تو ریاستوں ہی کا وفاق ہے اور ایک پارٹی کی صدارت میں حزبِ مخالف کے لوگ بھی گورنر ہیں۔

جہاز پیرس پہنچ چکا تھا لہٰذا بات ادھُوری رہ گئی۔ اب پیرس سے فرینکفرٹ اور پھر وہاں سے اڑ کر اسلام آباد۔

تو پھر سے بات شروع کرتے ہیں۔ البانی میں ایک دوست کے گھر ٹھہرا۔ صُبح ناشتہ ایک دوسرے دوست کے ہاں تھا۔ رات بہت مصروف گزری مگر صبح بھی آرام کا وقت نہ تھا۔ ناشتہ کر کے نیویارک کے لئے چل پڑے مگر یہاں تک آتے آتے مجھے اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔ شاید آپ کو سوال یاد نہ ہو تو پھر سے دُہرا دیتا ہوں کہ جب مغرب میں کفر بھی ہے اور بے حیائی بھی، کام بھی گدھے کی طرح کرنا پڑتا ہے اور ساری عمر صرف کر کے پس انداز کچھ نہیں ہو سکتا اور اگر کچھ ہو بھی جاتے تو آدمی یہاں سے

جانہیں سکتا۔ تو آخر لوگ یہاں کیوں آتے ہیں؟

میرے خیال میں سب خرابیوں کے باوجود، ان ممالک میں سہولتیں صرف چند خاندانوں یا محض حکمرانوں کے لئے نہیں بلکہ ہر شہری اور ملک میں رہنے والے ہر آدمی کو حاصل ہیں۔ خوبصورت گھر، اعلیٰ قالین، کار، گرم سرد ائیر کنڈیشنر گیس، بجلی اور پانی، ٹیلیفون، ٹیلی ویژن اور ان سب چیزوں کا معیار اس قدر بلند ہے کہ میں نے اسلام آباد میں بھی ایسا نہیں دیکھا۔ زندگی کی یہ آسائشیں اور پھر ان کے عادی لوگ خصوصاً اور وہ بچے جو یہاں پیدا ہوتے ہیں، ان چیزوں کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ شہر اور گلیاں یوں صاف ہیں کہ ماچس کی تیلی یا کاغذ کا ٹکڑا تک نظر نہیں آتا۔ رہا دین! تو وہ ہمارے پاس پاکستان میں کب ہے؟ جو یہاں نہ رہا۔ تو پھر فکر ہوگی، ہاں! دل کی ویرانیوں نے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ مگر ظاہری آسائشوں نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی ہے اور جن کو یہ سب کچھ حاصل نہیں وہ امیدِ کامرانی میں جان مار رہے ہیں۔ جہاں تک دل کے اُجڑنے کی بات ہے تو اس کے بسنے کی اُمید اپنے ہاں بھی نہیں لہٰذا لوگ ہیں کہ اِدھر کھنچے چلے آتے ہیں۔

بہرحال ہم نیویارک پہنچے رات کا قیام تھا لہٰذا احباب جمع تھے جو نہ آسکے وہ فون کرتے رہے کچھ نئے لوگ حلقۂ ذکر میں آئے۔ کئی اسلام قبول کرنے کی سعادت سے مشرف ہوئے اور یہی برکات نبوی کا ظہور ہے اور حضرت شیخ المکرم کی کرامت ہے، ؎

خود نہ تھے جو راہ پر، اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

ان سب رونقوں سے گزرتے ہم واپسی کے سفر پہ روانہ ہوئے۔ قیوم صاحب کو لندن جانا تھا۔ عظمت مہینہ بھر کے لئے رک گیا اور ہم نے فجر پیرس میں آکر قضا کی۔

ظہر پڑھی اور چل دیئے۔ نیویارک سے سوار عملہ پیرس بدل گیا۔ مگر پیرس والے بھی فرینکفرٹ تک ہی آئے پھر انہیں کسی اور جہاز پہ جانا تھا ہمیں نئے ساتھی مل گئے۔

اب پیرس کے حُسن کی کیا بات کروں؟ ایک عالم مدح خواں ہے پھر سارا یورپ موسم اور سبزے کے لحاظ سے بہت ہی خوبصورت ہے کوئی ایسا شہر نہ ہوگا، جس میں دریا نہ ہو جنگل نہ ہو۔ جی ہاں! شہروں میں جنگل اور جنگلوں میں شہر، یہی تو خوبصورتی ہے۔ فرینکفرٹ کو جہاز سے دیکھا تو حدنگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑ، وادیاں جنگل اور درمیان میں دریا۔

یہاں سے نکلے تو مقامی وقت کے مطابق شام کے تین بج رہے تھے۔ کیا عملہ اور کیا مسافر، انگریزی تہذیب سے گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ یورپ کے باسیوں کی تو بات الگ ہے۔ اہلِ مشرق کے ہر انداز میں مغرب جھلکتا ہے مگر عادات مشرقی ہیں، مثلاً میں نے بہت غور سے دیکھا سوار ہونے والا عملہ فوراً کھانے پہ ٹوٹ پڑا اور کھڑے جہاز میں کھانے کو تیار ہو گئے۔ کرتے بھی کیا، تین بج رہے تھے اور اگرچہ روزانہ الاؤنس تو ملتا ہے مگر بچ جاتے تو کیا حرج؟ صرف ساتھ ہمسفر عملہ بلکہ مقامی ہوائی اڈے پر کام کرنے والے بڑے بڑے صاحب بھی جہاز سے کھانے کے پیکٹ لے کر باہر راہداری میں رکھ رہے تھے جو دفتر لے جاکر کھائیں گے اور پاکستان کو دُعائیں دیں گے۔ کچھ جو انتظامی اُمور میں مصروف رہے اور کھانے تک رسائی نہ ہو سکی جاتے جاتے کوک وغیرہ کے ڈبے اٹھا کر لے جا رہے تھے۔

دراصل یہی پاکستان کی تاریخ ہے کہ جو جہاں ہے وہ لُوٹنا چاہتا ہے۔ جتنا لُوٹ سکے اور بس۔ بڑے چھوٹے سیاستدان یا ڈاکٹر، مبلغ و واعظ یا پیر اس ایک بات اور اس ایک کام پہ سب متفق ہیں اور یونہی سہی کوئی نقطۂ اتحاد تو ہے۔

کاش ! ہم حقیقت پسندی اختیار کریں اپنے حق پر قناعت کریں اور دُوسروں کے حقوق اُن کے لیے چھوڑ دیں تو آج بھی بحمد للہ ہماری حالت سُدھر سکتی ہے اللہ کرے ایسا ہی ہو !

اپنے جہاز میں اپنا اخبار بھی نظر آیا ۔ اپنا یعنی پاکستانی نوائے وقت تھوڑا تھا بٹ گیا اور ہمیں "جنگ" کی ایک کاپی ہاتھ لگی پہلے صفحے کی سُرخیاں پڑھیں تو بیساختہ زبان سے نکل گیا "باقی سب خیریت ہے"۔

ساتھ کرنل صاحب بیٹھے تھے انھوں نے پوچھا ،

"کیا کہا آپ نے ؟"

عرض کیا ، کسی دُور دراز فوجی کو گھر سے پرائمری پاس بیٹے نے خط لکھا تھا اور حالات یوں تھے کہ دادا جان چل بسے ، مکان کی چھت گر گئی جس کے نیچے آ کر امی سخت زخمی ہے اور ایک ٹانگ تڑوا بیٹھی ہے بھینس چور لے گئے چھوٹی کو بخار ہے ، باقی سب خیریت ہے ۔ اللہ گواہ ہے سُرخیوں کے متن پڑھنے کی ہمت نہیں پڑی ۔

میرا خیال ہے بہت باتیں کریں ، اب اجازت دیجئے ، کچھ سونے کی نقل کروں گا ممکن ہے ایک آدھ اُونگھ آ جائے یا سو ہی جاؤں اور پھر اسلام آباد پاکستان ، گھر ، وطن جو میری شناخت ہے میرا اثاثہ ہے جس کی خیر اور بہتری ہی کی طلب و آرزو ہے ۔

ان راستوں پہ سفر کرتے ہوئے مغرب کو چلیں تو سُورج اُبھرتا ہی رہتا ہے ڈوبنے کا نام ہی نہیں لیتا اور مشرق کو رواں ہوں تو بہت جلدی جلدی غروب ہونا شروع ہو جاتا ہے ۔ اب دیکھئے ! پھر غرُوب ہونے کو ہے ۔ لہٰذا میں نے اس مختصر سی اور بکھری بکھری داستان کو "اُبھرتے ڈُوبتے سُورج" کا نام دیا ہے ۔ یوں بھی کفر و اسلام کی آویزش نیکی و بدی کی جنگ شرم و حیا اور بے حیائی کی جنگ ہی تو اس کا موضوع ہے ۔

اُمید ہے آپ بھی یہ نام پسند کریں گے ، اللہ کرے ! میری حقیر کوشش اہلِ مشرق کو مغرب کا آئینہ دکھا سکے ۔ آمین !

والسلام

فقیر

۱۷/۱۸ ، جون
۱۹۸۹ء

فرینکفرٹ سے اسلام آباد جاتے ہوئے PK-716.

دیس اندر پردیس

۸، ستمبر ۸۹ء

اس بار اجتماع کے خاتمے پر چترال سے آگے بمبوریت وادی میں جانے کا پروگرام بنانا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ پچھلے سال یہاں دارالعرفان کی تعمیر شروع کرائی تھی۔ کندیسار اِس وادی کا مرکزی گاؤں ہے۔ کچھ گاؤں اس سے پہلے آتے ہیں اور کچھ بعد میں، جن میں اب تو بفضل اللہ مسلمانوں کی تعداد بھی قابلِ ذکر ہے ورنہ بنیادی طور پر یہ کالاش قبیلے کے گاؤں ہیں جو کالے کافر بھی کہلاتے ہیں اور تاحال ہزاروں سالہ پرانی تہذیب اور قدیم اوہام پرستی کو بدستور اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ تین وادیاں چترال کے شمال مغرب میں ہیں رنبور، بمبوریت اور بیریر۔ درمیان ہیں بلند پہاڑی سلسلے ہیں مگر یہ لوگ انہی چوٹیوں پہ مویشی اور ریوڑ چراتے ہیں اور ایک دوسرے سے ملاقات رہتی ہے آپس میں رشتہ داریاں بھی ہیں۔

اللہ کریم نے ان میں کام کرنے کا موقع نصیب فرمایا تو درمیان والی وادی کے مرکزی گاؤں میں مرکز کی تعمیر شروع کرائی کہ قبل ازیں دو سال یہاں حاضری دے کر لوگوں کو سلسلہ عالیہ سے متعارف کرایا۔ ڈاکٹر عظمت نے مفت علاج معالجہ کر کے بھی بلاتمیز مذہب لوگوں کی خدمت کی اور جب کچھ احباب باقاعدہ ذکر کرنے لگے تو اب یہاں مرکز تعمیر ہو رہا ہے الحمدللہ!

پروگرام کے مطابق مجھے ۵، ستمبر کو پشاور اور ۶، ستمبر کو ہوائی جہاز سے چترال آنا تھا مگر کچھ ذاتی مصروفیات در آئیں اور ایسا نہ ہو سکا۔ اپنی زمینوں پر کام کے سلسلے میں رُک گیا۔ ۶، تاریخ کو ایک بجے دن فارغ ہوا، ڈاکٹر عظمت ۴، ستمبر کو پہنچ چکا تھا۔ پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے سڑک کے راستے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

چنانچہ ۶، ستمبر کو ۳۰-۴ شام کے وقت دارالعرفان سے اپنی پجارو میں ڈرائیور، ڈاکٹر عظمت اور مَیں روانہ ہو کر مغرب کے وقت راولپنڈی پہنچے۔ کرنل مطلوب لاہور سے آ چکے تھے۔ مغرب مِل کر ادا کی، چائے پی۔ کچھ احباب سے ملاقات ہو گئی اور یوں ۳۰-۷ پر پشاور کے لئے نکل کھڑے ہوئے مگر شومئ قسمت کہ پنڈی ہی میں روڈ بلاک میں پھنس گئے۔ پرانے پولی ٹیکنیک کے سامنے گاڑیوں نے راستہ روک رکھا تھا۔ چونکہ یوم دفاع کی تقاریب تھیں۔ پولیس غالباً اُس طرف ہو گی۔ یہاں کوئی ایک گاڑی خراب ہوئی تو یار لوگوں نے دوسری سڑک پر گاڑیاں موڑ دیں آگے سے گاڑیاں آئیں تو سڑک بند ہو گئی پھر بعد والے دُوسری طرف لگے نتیجتاً وہ بھی بند ہو گئی۔ گاڑیاں آ آ کر جمع ہوتی گئیں اور یوں راستہ بند ہو گیا۔ رات دس بجے پولیس کے کچھ اہلکار تشریف لائے اور اتنا عرصہ بارش بھی خوب برسی۔ شاید ہماری بے بسی پہ آسمان کے آنسو ٹپک رہے ہوں گے کہ پولیس آئی، راستہ کھلا تو بارش بھی رُک گئی مگر ان سب لوگوں کو غسل دے کر جو کھُلی گاڑیوں میں سوار تھے۔ چنانچہ ہم ۱۵-۱۰ پہ نکل سکے اور ۳۰-۱۲ پہ

پشاور پہنچے۔

۱۰ ستمبر ۸۹ء

احباب منتظر تھے، کھانا بھی ابھی تک نہیں کھایا تھا۔ لہٰذا کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر صبح کا پروگرام ترتیب دیا اور تقریباً ۲ بجے رات سو سکے۔ علی الصبح فجر کے بعد ناشتہ کیا۔ دوپہر کا کھانا اور چائے ساتھ رکھ لی اور یوں ۶ بجے صبح پشاور سے وادیٔ بمبوریت کے لئے روانہ ہوئے۔ کرنل مطلوب صاحب کو ذاتی کام کے سلسلہ میں لاہور واپس کر دیا تھا لہٰذا وہاں سے سعید صاحب کو ساتھ لے لیا۔ یوں ہم پھر سے چار مسافر ہو گئے اختر، عظمت، سعید اور مَیں۔

ہم رُکے بغیر چلتے رہے اور مالاکنڈ کے بلند سلسلہ کوہ پر سے گزرتے ہوئے کچھ دیر رُکے۔ مالاکنڈ ایک خوبصورت پہاڑی سلسلہ ہے جس کے اوپر آبادی ہے یہ مشہور ایجنسی ہوا کرتی تھی۔ حالات تقریباً اب بھی ویسے ہی ہیں اگرچہ سول انتظامیہ موجود ہے مگر زیادہ مؤثر نہیں ہے۔

سڑک بہت اچھی ہے۔ بلندی پر پہنچ کر رُکے، چائے کا کپ بھی پیا اور عظمت نے نظاروں کو ٹیپ پر منتقل کرنے کی کوشش بھی کی۔ اِس بار ایک عدد مُووی کیمرہ بھی گاڑی میں تھا کہ احباب وہاں کے حالات اور ان لوگوں کی زندگی کو گھر بیٹھ کر دیکھ سکیں۔ مالاکنڈ سے دوسری طرف پھر نیچے اُترنا پڑتا ہے۔ اور دریائے سوات کی وادی شروع ہو جاتی ہے جو اپنے حُسن میں بے مثال ہے۔ یہاں نیچے ایک خاص قسم کا مالٹا ہوتا ہے جو چھوٹا سا اور گہرا سُرخ ہوتا ہے بہت میٹھا اور خوشبُودار۔ وادی میں مختلف آبادیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ چھوٹی بڑی اکثر زمینیں بڑے زمینداروں کی ہیں اور لوگ مزارع۔ مگر کچھ چھوٹے مالک بھی ہیں۔ ہر موسم

کا پھل اپنے اپنے وقت پر مِلتا ہے ہر پھل کے لئے الگ رنگ اور انوکھی بُو لے کر پھُول کھِلتے ہیں۔ اسلحہ ہر آدمی کے پاس ہے۔ اور سرِعام ہے۔

کچھ دُور آگے جا کر بٹ خیلہ آتا ہے یہ مشہُور بازار ہے غالباً تین چار کلومیٹر سڑک کے دونوں طرف بازار ہوگا۔ جس میں دُنیا کی ہر چیز مِلتی ہے۔ یہ تھوک سپلائی کرنے والا باڑہ ہے یا باڑوں کا امام کہہ لیجئے۔ جگہ پُرفضا، دریائے سوات کا پانی نہر کی صورت میں آ کر تقسیم ہوتا ہے۔ گھر گھر اور کھیت کھیت ہریالی بانٹتا، پھُول بکھیرتا اور خوشیاں لُٹاتا چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دُور آگے جا کر سیدھی سڑک تو منگورہ جاتی ہے جو سوات کا صدر مقام ہے اور ایک سڑک بائیں مڑتی ہے جو پُل عبور کر کے چکدرہ فورٹ کے سامنے سے گزرتی ہے۔ ان علاقوں میں نیم فوجی سکاؤٹس ہوتے ہیں چکدرہ فورٹ انہی کا ہیڈ کوارٹر ہے اور پُل پر سامنے پہاڑی کے اُوپر پکٹ بنی ہوئی ہے۔ ایسی پکٹیں مالاکنڈ سے شروع ہو جاتی ہیں۔ ہر چوٹی، ہر موڑ پر۔ کہ انگریزی دَور میں انگریز اور اس کی فوج پٹھان کی گولی سے محفوظ نہ تھے لہٰذا سڑک کو رواں رکھنے کے لئے ہر چوٹی پر پکٹ ہوتی جس میں کچھ لوگ متعین ہوتے جو سڑک کی حفاظت کرتے۔

ہمارے سامنے والی پوسٹ چرچل پوسٹ کہلاتی ہے غالباً ۱۸۹۰ء میں سر ونسٹن چرچل یہاں بطور لیفٹیننٹ تعینات رہے جو بعد میں بحیثیت برطانوی وزیرِاعظم جنگ عظیم کے ہیرو قرار پائے۔ چکدرہ کا گاؤں کافی آگے چل کر آتا ہے۔ یہاں سے دریا بھی دو حصوں میں بٹ جاتا ہے ایک دریا جو سوات کی جانب سے آتا ہے منگورہ، بحرین اور کالام سے آگے فلک سر کی چوٹی ہے جو اٹھارہ ہزار سات سو پچاس فٹ بلند ہے۔ دریائے سوات اسی کے دامن سے شروع ہوتا

ہے اور دوسری طرف جو وادی جاتی ہے اس میں جانے والا دریا آگے جا کر دریائے چترال اور پھر کابل بنتا ہے۔ بہرحال دریائے سوات کا معاون دریا سڑک کے ساتھ دیر کی طرف مڑجاتا ہے اور یوں لواری کے مشہور درے کے دامن تک سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ دریا کنارے افغان مہاجرین کے کیمپ بھی ہیں۔ دریا اپنے ساتھ لکڑی کے ٹکڑے اور درختوں کی ٹوٹی پھوٹی شاخیں پہاڑوں سے لاتا ہے۔ جن کو لوگ یہاں جمع کر کے کنارے پہ ڈھیر کرتے اور بیچتے ہیں۔ غالباً سردیوں میں کوئٹہ سٹوو کا بہترین ایندھن ہے۔

دیر سے کچھ پہلے ہم چائے کے لئے ٹھہرے۔ چند بسکٹ کھائے اور پیالہ پیالہ چائے کا پی کر تازہ دم ہوئے۔

ہمارا اگلا سٹاپ دیر تھا۔ جو کبھی مشہور ریاست تھی جہاں کا آخری نواب اپنے حرم اور پالتو کتوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ ایک بزرگ دوست نے آزادی سے پہلے کا واقعہ سنایا کہ نواب صاحب کے حرم میں سینکڑوں بیگمات اور جانوروں میں سینکڑوں کتے تھے۔ ہر دو کے لئے ڈاکٹر تھے۔ مگر انسانی آبادی محض قسمت کے رحم و کرم پر تھی۔ اب یہ سب علاقے پختہ سڑک کے ذریعے مردان اور پشاور سے ملے ہوئے ہیں۔ مقامی طور پر بھی مدارس اور ہسپتال اور دوسرے سرکاری اداروں کے بورڈ نظر آتے ہیں۔

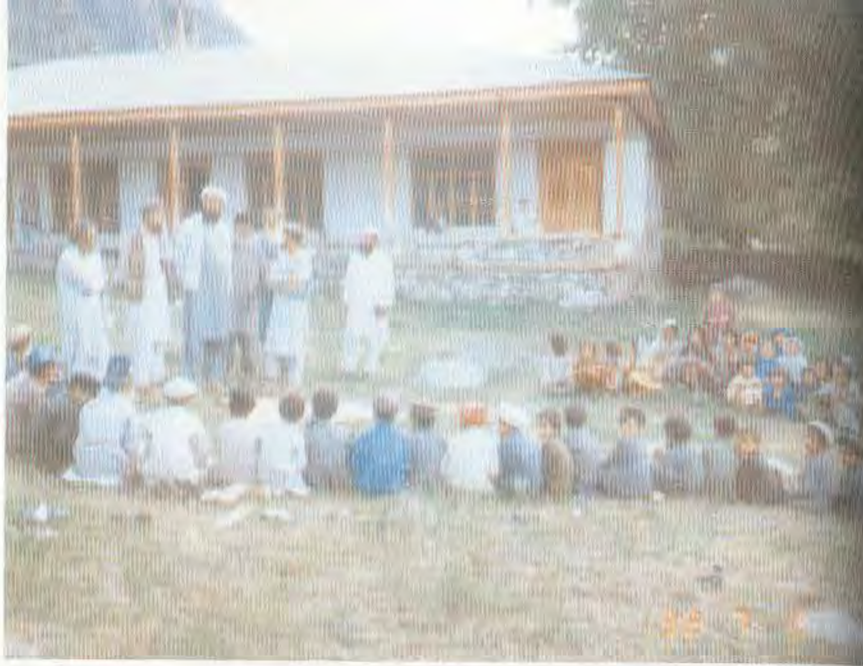
دیر شہر نے ایک پہاڑی کو ڈھانپ رکھا ہے اور مکانات بالکل شہد کے چھتے کی طرح ہیں۔ یوں بھی اکثر لکڑی کے ہیں اور اوپر نیچے بہت خوبصورت لگتے ہیں۔ ہم نے وہاں سے ڈیزل لیا اور گاڑی کے سٹیئرنگ پر میں خود بیٹھا کہ اس سے آگے بہت مشکل اور کچا راستہ آنے والا تھا۔ یوں دیر سے تھوڑی دور

تک پکی سڑک ساتھ دیتی ہے پھر پہاڑ کے دامن میں ساتھ چھوڑ دیتی ہے ویسے بھی جو حصہ سردیوں میں برف سے ڈھک جاتا ہے وہاں سڑک اکھڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ ہم پکی سڑک سے کچی پکی سڑک پر آگئے تھے اور پھر بالکل کچی پر، جہاں پختگی کا نشان تک نہ تھا۔

سامنے وہ مشہور ٹنل آجاتا ہے جو لواری ٹاپ کے اندر سے گزارنے کے لئے لگایا گیا تھا۔ یہ غالباً فیلڈ مارشل محمد ایوب مرحوم کا منصوبہ تھا۔ پھر بھٹو صاحب کے دورِ اقتدار میں اس پر کام شروع ہوا۔ غالباً ساڑھے پانچ کلومیٹر ٹنل دوسری طرف نکل جائے گا جس کے لئے اربوں روپے رکھے گئے وہ سب ڈیڑھ کلومیٹر میں ختم ہو گئے اور منصوبہ ٹھپ ہو گیا۔ ٹنل کے منہ پر کسی بیوہ کے پھٹے ہوئے دوپٹے کی طرح کا جنگلا لگا ہے۔ عہدِ محمد خانی میں تقریباً تین کروڑ روپے کی حقیر رقم سے پھر نیا سروے وغیرہ ہوا مگر وہ عہد جلدی ختم ہو گیا۔

اب نئے جمہوری دور میں پھر اس کے بارے باتیں ہو رہی ہیں، اللہ کرے یہ بن جائے تو بہت بڑا کام ہے ورنہ دسمبر میں لواری ٹاپ کا راستہ برف باری سے بند ہو جاتا ہے اور پھر اپریل تک بند رہتا ہے۔ یہ ساری آبادی جو سینکڑوں میلوں اور لاکھوں نفوس پر مشتمل ہے پورے ملک سے کٹ جاتی ہے۔ دس پندرہ روز میں کبھی کبھار ہوائی سروس بحال ہوتی ہے مگر سب لوگوں کی غذائی ضروریات بھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اشیائے ضرورت کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔

ہم ٹاپ کی طرف رواں دواں رہے بلکہ افتاں و خیزاں زیادہ موزوں لفظ ہے کچی سڑک میں گڑھے اور اس کے ابھار گاڑی کو پٹخ پٹخ دیتے۔ یوں ٹاپ کا راستہ، جو غالباً بیس کلومیٹر ہے ہم نے ۱۰ بجے چل کر سوا دو گھنٹے میں طے کیا اور



جمہوریت (کافرستان) میں دارالعرفان کے مناظر



سوا بارہ بجے ہم درّے میں کھڑے تھے جس کے دونوں طرف گرمیوں میں خوب رونق ہوتی ہے۔ لوگ پہاڑوں سے لکڑی لے جانے کے لئے، چرواہے ریوڑ پالنے کے لئے کیمپ لگا لیتے ہیں بلکہ ٹاپ پر کچے مکانوں میں چائے سگریٹ وغیرہ بھی ملتے ہیں۔ جس کی بلندی دس ہزار پانچ سو فٹ ہے۔

کچھ دیر دونوں اطراف کا نظارہ کرتے رہے۔ پیچھے دیر اور آگے چترال تھا اور ہر دو جانب صانعِ فطرت نے حُسنِ فطرت بانٹنے میں اپنی شانِ فیاضی دکھائی تھی۔ ٹاپ پر ابھی برف نظر آتی تھی۔ دُوسری طرف بھی برف پانی بن کر ہلکی سی نالی میں بہہ رہی تھی جسے نیچے جا کر دریائے چترال کا معاون چھوٹا دریا بننا تھا۔ دوسری طرف بہت سخت موڑ دے کر سڑک ایک دم نیچے اُتر جاتی ہے۔ غالباً چالیس سے کچھ اوپر موڑ یکے بعد دیگرے دائیں بائیں مُڑنا پڑتے ہیں تو آپ زیارت پہنچ جاتے ہیں جو چترال کی طرف کا آخری گاؤں ہے اور اِدھر سے جاتے ہوئے پہلی آبادی یہاں چترال سکاؤٹس کی پوسٹ ہے اور گاڑیوں کی چیکنگ ہوتی ہے۔ وہاں سے گزر کر جب نیچے نالے میں پہنچے تو ڈیڑھ بج رہا تھا، لہٰذا گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے خوبصورت شفاف پانی سے وضو کیا اور ظہر ادا کی اور احباب نے لبِ آبِ جُو کھانا کھایا جس نے واقعی بہت لُطف دیا، شاید کئی عوامل یکجا تھے۔ بھُوک بھی زوروں کی لگ رہی تھی اور یہ بجائے خود بڑی لذیز ہوتی ہے۔ لکڑ، پتھر قسم کی اشیاء بھی مزیدار لگتی ہیں۔ حسُنِ فطرت یوں بکھرا پڑا تھا جیسے کسی بہت بڑے خزانے کا مُنہ کھول دیا گیا ہو اور ہر طرف جواہرات کی چمک آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی ہو۔ پھر ننھی سی ندی کے راگ۔

سُبحان اللہ وبحمدہٖ۔

واپس گاڑی کے پاس آئے تو ایک پہیہ پنکچر تھا۔ بھلا ہر خوشی کچھ نہ کچھ ملال تو لائے گی۔ تبدیل کیا اور روانہ ہو کر دروش پہنچے۔ برطانوی عہد کا مشہور قلعہ ہے، اب مُدت سے چترال سکاؤٹس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ دامنِ کوہ میں قلعہ، نیچے دریا اور درمیان میں دروش کا چھوٹا سا قصبہ ہے۔ درمیان سے سڑک گزرتی ہے جس کے دونوں طرف بازار ہے۔ پٹرول پمپ بھی ہے اور مستری خانے بھی۔ یہاں رُک کر پہیہ ٹھیک کروایا اور چترال سے چند میل ادھر پُل عبور کر کے کافرستان کی مشہور وادی بمبوریت کا راستہ اختیار کیا جو پکی سڑک چھوڑنے کے بعد خطرناک اور تنگ سا ہو جاتا ہے۔ بہر حال اللہ کے بھروسے پر بڑھتے رہے اور عصر وادی میں داخلے پر جا کر ادا کی۔

چترال کے شمال مغرب میں یہ تین وادیاں کافرستان کہلاتی ہیں۔ جن کے نام، رنبور، بمبوریت اور بیریر ہیں۔ تینوں وادیوں کے درمیان بلند پہاڑ ہیں مگر مقامی لوگ انھیں عبور کرتے رہتے ہیں بلکہ گرمیوں میں ان پر ریوڑ اور مویشی چُراتے ہیں تو اکٹھے رہتے ہیں، آپس میں رشتہ داریاں بھی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ کالے کافر کہلاتے ہیں۔ اگرچہ اُن کے قدرتی رنگ سُرخ و سپید ہیں مگر کپڑا کالا پہنتے ہیں، خصوصاً خواتین اور بچیاں سیاہ کپڑے کا ایک لمبا کرتا پہنتی ہیں، جن کے شانوں اور گلے پر کڑھائی کا کام کیا ہوتا ہے بس یہی کرتہ ان کا سارا لباس ہے۔ کنارِ دریا جب دھو کر سوکھنے کے لئے ڈال دیں تو بڑی بے تکلفی سے بدن کو دھوپ دکھایا کرتی ہیں لہٰذا دریا پر دُور سے اگر کسی چٹان پر سیاہ کرتا پھیلا ہُوا نظر آئے تو اس کا معنی یہ ہے کہ قریب ہی کوئی پری وش بال سُکھا رہی ہو گی لہٰذا احتیاط لازم ہے کہ ان کے پاس دوسرا لباس نہیں ہوتا۔ سر پہ کوڑیوں کا تاج

سا پہنتی ہیں جو پیچھے تک لمبا ہوتا ہے ۔ آجکل بہار ہے پھول اور پھل کثرت
سے ہیں ساتھ کام کی زیادتی بھی ہے ۔ فصلیں تیار ہیں اور سارے چترال میں گندم
مکی جسے یہ جوار کہتے ہیں اور کنگنی جسے یہ باجرے کا نام دیتے ہیں ایک ساتھ تیار
کھڑی ہیں ۔ اخروٹ درختوں سے اُتارتے ہیں ۔ زمین سے آلو حاصل کرتے ہیں اور
اس کے ساتھ اکثر جوان لڑکے اور لڑکیاں مویشی اور ریوڑ لے کر پہاڑوں پہ چلے جاتے
ہیں اور دو تین مہینے وہیں گزارتے ہیں ۔ یوں افرادی قوت بھی بٹ جاتی ہے مگر
اس سب کے باوجود یہاں بدکاری نہیں ہوتی نہ کوئی اس طرح سوچتا ہے اگر کوئی
چاہے تو ان کی آپس میں شادی کردی جاتی ہے جس میں عموماً دولہا کو چند بکریاں
دینا پڑتی ہیں ۔ پھر بیٹی والے نہ صرف اپنی جائیداد اور زمین سے حصّہ دیتے ہیں ،
بلکہ گھر بھی بنا کر دیتے ہیں اور پوری پوری مدد کرتے ہیں ۔

یہاں کبھی لڑائی بھڑائی نہیں ہوتی ، قتل کرنے کا تصور ہی نہیں ۔ پچھلے
دنوں پاکستان ٹیلی ویژن پر بالائی چترال کے بارے ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہوتے
رہے ۔ ہر ڈرامے میں ایک قتل ہوتا تھا اور وہاں حقیقی زندگی میں اس کا کوئی تصور
تک نہیں ، شاید ہمارا ٹی وی انھیں اس راہ پر ڈالنا چاہتا ہوگا ۔ شادی سے زیادہ
ان کی رسومات کسی کی موت پر ہوتی ہیں ۔ جتنا بڑا آدمی ہو اُتنا بڑا جشن اور اتنے
زیادہ دن رہتا ہے ۔ خوب شراب چلتی ہے جو ان کی اپنی بنائی ہوئی ہوتی ہے
مُردے کو اچھا لباس ، نئے جوتے وغیرہ پہنا کر دو آدمی بغلوں سے ہاتھ دے کر
اپنے ساتھ نچاتے ہیں اور سب حاضرین ناچتے ہیں پھر کوئی اور دو آ جاتے ہیں
اسی طرح تین تین دن جشن جاری رہتا ہے ۔ ڈھول کی تھاپ اور ٹھپرے کے
گھونٹ پہ رقص ۔ بکریاں ذبح ہوتی ہیں اور لذت کام و دہن کے کام آتی رہتی

ہیں پھر مُردے کو اچھی سی چارپائی پہ ڈال کر قبرستان لے جاتے ہیں کہ اب یہ
خوش ہے اور چلا جائے گا ۔ قبرستان بھی نرالا ہے لکڑی کے تختوں کے بکس
ہیں ، ایک نیا بکس بنا کر مُردہ کو اس میں رکھا اور اوپر تختہ رکھ کر چارپائی بھی چھوڑ کر
بھاگ آتے ہیں کہ اس کی رُوح چمٹ نہ جائے ۔ اب وہ جنگلی لومڑیوں گیدڑوں
اور جانوروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے کہ ٹھنڈ کے باعث خراب تو ہوتا نہیں ،
یوں بہتوں کا بھلا ہو جاتا ہے ۔

مکان اکثر لکڑی کے ہیں اور پہاڑوں کے ساتھ اوپر نیچے ، مگر دھوئیں
سے وہ بھی سیاہ ہوئے ہیں ۔ بعض عورتوں نے ایک سیاہ لیپ سا سارے
چہرے پہ لگا رکھا ہوتا ہے ۔ ہر وادی میں برفانی نالہ بہتا ہے مگر دُور سے پانی
باندھ کر گاؤں کے اوپر لے جاتے ہیں اور پھر ہر گھر سے پانی کی نالی گزار دی
جاتی ہے جو رات دن رواں دواں نظر آتی ہے ۔ الھڑ دوشیزائیں غضب کی بانسری
بجاتی ہیں جو اس فسوں کار ماحول میں تو طلسماتی اثر رکھتی ہے ۔ عجیب بات ہے
بانسری کی لَے میں نہ صرف درد ، بلکہ ایک پاکیزہ سے جذبے کا احساس ہوتا
ہے اور آنکھیں بند کر کے سُنتے رہنے کو جی چاہتا ہے ۔

کمال ہے یہ ساری باتیں آپ کو کھڑے کھڑے سُنا رہا ہوں ۔ چلئے !
وادی کے اندر چلتے ہیں یہ وادی درمیان میں ہے اور پھر اس کے درمیان
میں کندیسار گاؤں میں دارالعرفان تعمیر ہو رہا ہے الحمدللہ ! یہاں احباب ذکر
کی محفلیں جماتے ہیں اور دین کی تبلیغ بھی کرتے ہیں ، نومسلم افراد کی حوصلہ افزائی
کا اہتمام بھی ہے ۔ سال میں دو بار میڈیکل ٹیم دورہ کرتی ہے جو دارالعرفان کی
کی طرف سے آتی ہے اور دوائیں بھی ساتھ لاتی ہے ۔ اس وادی میں ہسپتال :

بھی ہے جس میں آج تک صرف ڈسپنسر تھا مگر اب ایک ڈاکٹر صاحب متعین ہوئے ہیں جو چترال کے ایک اچھے گھرانے کے چشم چراغ ہیں، یوں ان لوگوں کو بہت مدد ملی ہے۔

ہم احباب کے ساتھ جا کر ٹھہرے۔ دوسرے روز جمعہ تھا اور گاؤں کی مسجد میں تبلیغی جماعت کے احباب بھی آئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ بھی روئے زمین پہ پھرتے تو ہیں، نتیجہ اللہ کریم کے دستِ قدرت میں ہے۔ بہرحال ایک بہت بڑی دینی محنت ہو رہی ہے۔ الحمدللہ!

وادی کے گرد پہاڑوں پہ ہر طرح کے درندے بھی ہیں اور ہرن کی مختلف اقسام بھی، خوبصورت پرندے بھی اور باز بھی یہاں پکڑے جاتے ہیں۔ درندوں میں چیتا اور ریچھ خاص طور پر اس لئے مشہور ہیں کہ سردیوں میں جب ہر طرف برف ہی برف ہوتی ہے تو یہ نالے میں آبادیوں کے قریب اُتر آتے ہیں۔ چیتا گاؤں کے کُتے پکڑتا ہے اور ریچھ نالے سے مچھلیاں۔ عجیب بات ہے یہ ریچھ، قطبی ریچھوں کی طرح گوشت خور ہیں اور بیلوں کو مار کر کھا جاتے ہیں مارنے کا طریقہ بھی نرالا ہے۔ بڑا سا ٹہنا اُٹھا کر پیچھے لپکتے ہیں اور اس سے مار مار کر گرا لیتے ہیں۔ ایک شکاری بتا رہا تھا کہ ایسے ہی ریچھ کا تعاقب کیا تو دیکھا کہ ایک چیتے کے ساتھ اس کی لڑائی ہو رہی ہے چھُپ کر دیکھنے لگا کچھ دیر بعد محسوس ہُوا کہ چیتے نے ریچھ کو تھکا دیا ہے اور سُست سا ہو گیا ہے تو میں نے ریچھ کے سینے پہ فائر کر دیا۔ گولی لگنے سے ریچھ نے جھٹکا کھایا مگر اس نے سمجھا چیتے نے شرارت کی ہے، دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر چیتے کو غصے سے اُٹھایا اور چٹان پر پٹخ دیا۔ دوسری بار پٹخا تو چیتا مر گیا مگر ریچھ بھی اس کے اوپر ڈھیر

ہو گیا۔ یہ ریچھ بہت قد آور ہوتا ہے۔ پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو تو چھ فٹ تک بلند ہو جاتا ہے اور بہت قوی الجثہ بھی ہوتا ہے۔ سردیوں کی راتوں میں کوئی گھروں سے باہر نہیں جھانکتا، ریچھوں اور دوسرے درندوں کو آزادی ہوتی ہے۔

جمعہ کا بیان تو سارا یاد نہیں کہ عرصہ بیت گیا اور ریکارڈ ہوا نہ تھا ہاں! برکاتِ معیت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا بیان تھا کہ جن لوگوں کو معیت نبوّت نصیب ہوتی ہے وہ کفر کے لئے شدید ترین ثابت ہوتے ہیں۔ کفر اُن پر کیا مسلط ہو گا گناہ انہیں کیا راغب کرے گا ان کی ضرب سے یہ ظلمت کافور ہوتی چلی جاتی ہے اور آپس میں مسلمانوں کے لئے اسلام کے لئے، نیکی کے لئے سراپا محبت بن جاتے ہیں۔ ان کا ہر کام خلوص کے ساتھ اللہ کی رضا طلب کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ نیز دُنیا میں صرف یہی لوگ ہیں جن کی پیشانیوں پہ تجلیاتِ باری رقصاں ہوتی ہیں۔ یہ ایک آئینہ ہے جو ہمیں ہمارا حال بتاتا ہے کہ ہم کہاں ہیں؟ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہماری محبت و نفرت کس کے ساتھ ہے اور کس وجہ سے ہے؟ ہمارا کردار اور عملی زندگی میں ترجیحات کیا ہے؟ مگر افسوس! کہ ہم تو عملی زندگی ہی سے فرار کی راہ اختیار کئے بیٹھے ہیں۔ اکثر احباب جو دینی علم حاصل کرتے ہیں وہ پھر عملی زندگی میں قدم نہیں رکھتے حالانکہ حصولِ علم کا مقصد عملی زندگی کے لئے راہنمائی حاصل کرنا ہی تو ہے۔ اور یہ بے عملی ہمیں ڈبونے کے لئے بھاری پتھر کا کردار ادا کرتی ہے۔

اللہ کریم ہمیں توفیقِ عمل دے۔

نماز کے بعد وادی میں آگے تک چلے گئے۔ دوسرے گاؤں دیکھے، ڈاکٹر صاحب نے مریضوں کو دوائیں دیں۔ کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان

کیلاشوں کے ہر گاؤں کے باہر زچہ خانہ، ایک چھوٹا سا کمرہ دریا کنارے بنا ہوا ہوتا ہے۔ جب کسی خاتون کو تکلیف شروع ہوتی ہے تو یہ فوراً اسے وہاں پہنچا دیتے ہیں، وہیں بچہ پیدا ہوتا ہے اور پھر چالیس روز اُسے وہیں رہنا ہوتا ہے۔ گھر کا کوئی فرد صبح شام روٹی لا کر دُور رکھ دیتا ہے جو وہ اُٹھا لیتی ہے اور یوں اپنے نفاس کے چالیس روز وہاں گزارتی ہے یہ اس کے قریب جانے سے ڈرتے ہیں۔ ہاں! اگر کوئی عورت وہاں اور بھی ہو تو الگ بات ہے اور عموماً وہاں چند عورتیں جمع رہتی ہیں۔ وادی کے آخر میں شیخان دہ ہے۔ شیخ مسلمان کو کہتے ہیں اور شیخان دہ سے مراد مسلمانوں کا گاؤں ہے۔ اور عجیب بات ہے تینوں وادیوں کے سروں پر آخری گاؤں اسی نام کا ہے یعنی کبھی یہاں بھی مسلمان آباد ہو کر تبلیغ کرتے رہے جس کا اثر وادی میں نورِ ایمان کی صورت میں نظر آتا ہے لیکن مرورِ زمانہ سے اب ان لوگوں کی اپنی اولاد کا یہ حال ہے کہ ایک کیلاش مسلمان کہہ رہا تھا شیخان دہ کے بزرگوں نے ہمیں مسلمان بنایا تھا مگر ان کی موجودہ اولاد ہمیں کافر بنانے پہ تُلی ہوئی ہے۔ یہ مقولہ، اُن کے موجودہ کردار کے باعث درُست نظر آتا ہے۔

بہرحال تینوں وادیوں کے آخری گاؤں کا نام بھی یہی ہے اور وہاں آبادی بھی مسلمانوں کی ہے۔ آگے افغانستان کی سرحد ہے کبھی آگے تک کافرستان تھا اور یہاں سے آگے پہاڑی درّے ہیں جن کی دوسری طرف بسنے والے سُرخ کافر کہلاتے تھے اور سرخ لباس بھی استعمال کرتے تھے مگر امیر عبدالرحمن والیٔ کابل نے حملہ کر کے علاقہ پر قبضہ کر لیا اور سب کو مسلمان بنا کر علاقے کا نام نورستان رکھ دیا۔ اب وہ موجود کابل حکومت کا حصّہ ہے۔

شیخان دہ میں ٹراؤٹ مچھلی کا فارم ہے۔ یہ دُنیا کی لذیذ ترین اور مشہور ترین مچھلی ہے جو انتہائی سرد پانیوں میں پائی جاتی ہے۔ اور سب سے زیادہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں ہوتی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جدھر سے پانی آ رہا ہو، اُدھر کو جاتی ہے۔

کراکال ایک بہت بڑا گاؤں ہے جو بنیادی طور پر تو کیلاشوں کا ہے مگر اب کچھ نومسلم بھی وہاں ہیں اور بتدریج لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ وہاں گئے کچھ کیلاشوں سے ملاقات ہوئی، نومسلموں سے ملے۔ عظمت اور اختر قبرستان دیکھنے چلے گئے کہ جیسا میں پہلے لکھ چکا ہوں یہاں یہ بھی ایک عجوبہ ہے وہاں سے پلٹے تو راستہ میں ایک ہوٹل پڑتا تھا جس میں غیر ملکی لوگ ٹھہرے ہوئے تھے وہ ایک آدمی غالباً اس لئے عیسائی کہلاتا ہے کہ یہ لوگ اس کے پاس آ کر رہیں۔ وہاں ایک عیسائی نے جنریٹر لگا کر اسے بجلی بھی مہیا کر دی ہے۔ چھوٹی سی واٹر فال (WATER FALL) کے سامنے لگا ہے جو ایک گاؤں کو بجلی مہیا کر سکتا ہے۔ اگر حکومت چاہے تو ان سب وادیوں میں اور دریائے چترال پر جگہ جگہ بجلی پیدا کی جا سکتی ہے جو سارے ملک کو پہنچائی جا سکتی ہے۔

ہم دریا کنارے چلتے کیلاشوں کے دوسرے گاؤں پہنچے تو عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ واقف تو سب تھے کہ عظمت سب میں دوا بانٹتا ہے۔ مگر ایک خاندان سے ذرا زیادہ بے تکلفی تھی لہٰذا ان کے ہاں کھُلے دالان میں عصر ادا کی، قہوہ پیا، مکی کے بُھنے کھائے۔ انھوں نے تازہ انگور توڑ کر پیش کئے اور ایک نومسلم خاتون سے ملاقات ہو گئی جو پچھلے سال تو مسلمان نہ تھی مگر اس بار اللہ نے اُسے اور اس کے خاوند کو نورِ ایمان بخشا تھا۔ بہت خوش تھی، کچھ

دین کے بارے باتیں ہوتی رہیں۔ وہ بھائی کے ساتھ رہتی تھی جو مسلمان نہ تھا مگر یہ لوگ فراخ دل ہیں، بُرا نہیں مناتے۔ مسلمان ہوگئی، کوئی حرج نہیں۔ اُس کو اِسلام پسند آیا ہوگا اور بس! وہ بتانے لگا کہ میری ایک اور بہن بھی مسلمان ہوگئی ہے اور اُس نے ایک راج سے شادی کر لی ہے اُسے اس کے راج ہونے پہ اعتراض نہ تھا حالانکہ وہ خود بڑا زمیندار تھا، یہ تو ایک فن ہے۔ بس آدمی معقول ہونا چاہیئے۔ اور مجھے شیخان دہ کے اپنے مولانا یاد آرہے تھے، جو اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ بتارہے تھے کہ میں نے اٹھارہ سال سے بیوی کو بھائیوں سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ کتنی عجیب بات ہے جو حال ایک مومن کے دل کا چاہیئے وہ کافر کو نصیب ہے اور جو تنگی کافر کے دل میں ہونی چاہیئے اس نے ہمیں گھیر رکھا ہے۔ اللہ کریم ہمیں معاف فرمائیے!

یوں ہم مغرب کے وقت مکان پہ پہنچے۔ ایک بزرگ ساتھی کے مکان پہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ احباب جمع ہوگئے، ذکر کیا، عشاء پڑھ کے کھانا کھایا اور آرام کیا۔ صبح ۹ تاریخ کو روانگی تھی مگر تاحال دارالعرفان کے لئے ضروری چیزوں کی فہرست مرتب کرنا تھی۔ لہٰذا ناشتے کے فوراً بعد وہاں مستری صاحب کو بھی بُلوایا تھا خود بھی حاضر ہوئے اور تعمیراتی کمیٹی کے مقامی بزرگ حضرات بھی تھے۔ سب نے مل کر طے کر لیا۔ اشیائے ضرورت کی فہرست بنوائی جو ہمیں راولپنڈی سے بھجوانی تھیں اور واپس روانہ ہوئے۔ واپس سے مراد اس وادی سے واپسی ہے گھر کو نہیں کہ ابھی تو سفر شروع ہوا تھا اور یہ ایک لمبے دشوار گذار اور مشکل سفر کی ابتداء تھی۔

اِن وادیوں میں بھی مقامی طور پر چترال میں بھی اور بالائی چترال میں بھی

آپ کو ہر جگہ آغا خان فاؤنڈیشن کا بورڈ نظر آتا ہے۔ یہ ان سب علاقوں میں بہت فعال ہے اس کا حال ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ فی الحال یہاں سے چلئے کہ ساتھ دوسری وادی کا راستہ اِس سے مشکل ہے۔ اِس وادی میں سڑک نسبتاً آسان تھی۔

جب ہم دوسری وادی میں داخل ہوئے تو وہ سڑک زیادہ ہی تنگ دامن تھی اور زمین پر تھی نہ آسمان پر بلکہ پہاڑی چٹانوں کو درمیان سے کاٹا گیا تھا اور صرف اس قدر جس میں سے جیپ بمشکل گزر سکتی تھی خصوصاً موڑ بہت تنگ تھے۔ دراصل وِلی جیپ کے سائز پر بنے ہوتے تھے اور پجارو نسبتاً بڑی تھی۔ موڑ کاٹتے وقت آگے صرف دو سُوتر فاصلہ چھوڑ کر نکلتے تو بھی پچھلا پہیہ کم از کم ایک چوتھائی سڑک سے باہر یعنی ہوا میں سے گزرتا تھا اور لطف کی بات یہ کہ گرنے کا ایک ہی موقع، آخری موقع تھا۔ ان لوگوں کا کمال یہ ہے کہ چھ چھ گیلیاں جن میں سے ہر ایک میں سے اندازاً چار چار شہتیر نکل سکتے ہیں، جیپ پر لاد کر ان سڑکوں سے نکل جاتے تھے، گرتے بھی ہیں اور جو گر گیا بس گر گیا اور کھیل ختم۔

ہم نالے کے ساتھ ساتھ رنبور گاؤں پہنچے۔ قدرتی حُسن ندیوں، نالوں پھولوں، پھلوں، آبشاروں اور سبزہ زاروں یا پہاڑوں کی بلندیوں برف پوش چوٹیوں اور گہری حسین وادیوں میں بکھرا پڑا ہے مگر قدرت کا سب سے بڑا شاہکار یعنی انسان اپنی بے بسی اور کسمپرسی کی انتہا کو چھو رہا ہے۔ روحانی تشنگی کا یہ حال کہ لوگ سینکڑوں برس قبل از مسیح کی رسومات پہ کاربند ہیں اور جسمانی اعتبار سے نہ غذا پوری ہے نہ دوا کا اہتمام، نہ لباس ہے نہ کوئی اور سہولت۔ حکومت تو

سرے سے پوچھتی ہی نہیں۔ ہاں مخیر ادارے کسی حد تک کام کر رہے ہیں۔ یہاں اگرچہ مڈل سکول ہے مگر تعداد بہت کم، کہ لوگوں کے لئے پہنچنا آسان کام نہیں۔ ایک خوبصورت مسجد صدیقی ٹرسٹ کراچی اور دعوت القرآن کے تعاون سے بنی ہے جس میں قاری سعید احمد صاحب، جو چترال ہی کے نواح کے رہنے والے ہیں چند بچوں کو تجوید سے حروفِ تہجی کی مشق کروا رہے تھے۔ ان بچوں سے کچھ آیات سُن کر یوں لگا جیسے صحرا میں چند خوبصورت کلیاں پھول بننے کو بے قرار ہوں۔

عظمت مریض دیکھنے اور دوائی بانٹنے لگے، چائے کا کپ پیا جو گاڑی میں موجود تھی۔ اساتذہ سے ملاقات کی بہت اچھے لوگ تھے۔ اس سے آگے چند گاؤں تو تھے مگر راستہ جیپ کا نہ تھا اور پیدل جانے کے لئے وقت نہ تھا لہٰذا وہاں سے واپس ہوئے اور پھر پہلی وادی کے داخلے والی جگہ پر پہنچے جہاں سے راستہ واپس چترال کو جاتا تھا۔ یہ بھی ایسا ہی نالہ درمیان میں چھوٹا سا دریا اور پہاڑی کاٹ کر جیپ کا راستہ بنا ہوا ہے۔

چترال سے پہلے دریا کنارے ایک گاؤں آتا ہے جس کا نام ایون ہے وہاں سے ہم چترال بھی جا سکتے تھے اور کافرستان کی تیسری وادی میں بھی ابھی دن کا ایک بج رہا تھا لہٰذا گاڑی وادی کو موڑ دی اور یوں ہم بیریر وادی میں داخل ہو گئے۔ اللہ کی شان! یہ بہت ہی تنگ وادی تھی اور اسی نسبت سے سڑک کا دامن اور بھی تنگ تھا بلکہ مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ ہم اس راستے پر سے کیسے گزر گئے جہاں اترائی آتی تو ایکدم اترنا پڑتا اور پھر اسی طرح سے ایکدم اوپر چڑھنا پڑتا۔ بڑے سخت موڑ اور پہاڑ سے مسلسل گرتے ہوئے پتھر، پھر اجاڑ بیابان اور ایک سو گز سے زیادہ تو وادی بھی کم ہی نظر آتی کہ سانپ کی طرح

بل کھاتی تھی۔ آخر ایک جگہ چھوٹے چھوٹے کھیت نظر آئے جن میں مکی بہار دکھا رہی تھی۔ ایک سفید ریش مسلمان بزرگ راستے میں کھڑے تھے ہاتھ میں کمان۔ گاڑی سے اتر کر پوچھا علیک سلیک کے بعد پشتو میں بتایا کہ اس کمان سے چھوٹا سا پتھر مارا جاتا ہے اور میں پرندہ شکار کر لیتا ہوں۔ میں نے کہا: مجھے دے دیں بچوں کو دوں گا، آپ اور بنا لیں۔ تو خوشی سے دے دی۔ یہاں مسلمان عموماً پشتو بولنے والے ہیں۔ میں نے ایکصد روپے دیئے تو یوں خوش ہو گیا جیسے کوئی پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ شکریہ بھی ادا نہ کر سکا اور بچوں کی طرح اچھلتا ہوا بھاگ گیا۔ سبحان اللہ! غریبی بھی کیا نعمت ہے۔ گناہ کے مواقع کم، دل میں تکبر کی بجائے عجز و انکسار اور خوشیاں اتنی سستی کہ ایک سو روپے کی خوشی پاگل کر دے۔ بہت عجیب شے ہے مگر ہم اس کی قدر سے آشنا نہیں رہے۔

ہم چلتے رہے۔ آخر گاؤں آ ہی گیا۔ گاؤں کا نام بیریر ہے اور یہاں کیلاشوں کا سردار رہتا ہے ان کا بڑا مندر یا معبد بھی اسی گاؤں میں ہے اور سب سے بڑا میلہ بھی اسی گاؤں میں دسمبر میں لگتا ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے میلے، ایک گرمیوں میں اور ایک بہار میں گزر جاتے ہیں۔ دسمبر میں سالانہ اور سب سے بڑا میلہ ہوتا ہے جس میں تینوں وادیوں کے کیلاش مرد عورتیں شریک ہوتے ہیں۔ تین دن رات اظہارِ مسرت کے سارے جتن آزمائے جاتے ہیں۔ تاریخوں کا فیصلہ سردار ہی کرتا ہے۔ یہ گاؤں بھی دوسروں کی طرح اوپر تلے بنے ہوئے گھروں کا چھتہ ہے۔

عظمت گاؤں میں چلا گیا کچھ مریض دیکھے۔ ہم کھلی جگہ رک گئے۔ شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ تن آور درختوں کے نیچے جوان لڑکیاں بُنائی سی کر رہی تھیں وضو

کیا اور ظہر ادا کی چائے پی۔ بچے جمع ہو گئے۔ کچھ بسکٹ انہیں دیئے۔ کچھ لڑکیوں کو دے دیئے عظمت آئے تو مریضوں کا ہجوم ساتھ لائے۔ انھیں دوائیں بانٹتے رہے۔

ان کے سردار صاحب کو بلوایا۔ ٹوپی پر سفید رنگ کا بڑا سا پر لگا رکھا تھا یہ اس کی سرداری کی علامت تھی۔ عظمت سے مل کر بہت خوش ہوا کہ یہاں پہلے بھی دوا وغیرہ تقسیم ہوتی رہی تھی لہٰذا اکثر واقف تھے۔ کچھ مسلمان بھی جمع ہو گئے اور یوں سب سے ملتے ملاتے ہم چترال کے لئے روانہ ہوئے۔

واپس دریائے چترال پر پہنچے تو پل عبور کر کے ساتھ چھوٹا سا گاؤں سید پور آتا ہے۔ وہاں ایک بزرگ ساتھی سید صالح جان رہتے ہیں۔ ان کے یہاں صبح کا کھانا تھا جو ہم نے عصر پڑھ کر کھایا اور لبِ دریا ان کے خوبصورت مہمان خانے میں آرام کیا ایک طرف پہاڑ کی بلندی آسمان سے باتیں کر رہی تھی تو دوسری طرف دریائے چترال تھا۔ خوبصورت پھولوں سے لان بھرے ہوئے تھے۔

مغرب سے پہلے روانہ ہو کر مغرب چترال پہنچ کر ادا کی۔ جس محلہ میں ہم ٹھہرے یہ مہتر چترال کے امرا کا محلّہ تھا اور ان کی ایک خوبصورت مسجد بھی۔ صبح اسی مسجد میں درس ہوا۔ جس کا موضوع قرآن حکیم کا ھدیً اور رحمۃً ہونا تھا۔ مگر محسنین کے لئے جو عبادت اور معاملات میں ربِّ جلیل کی اطاعت کرتے ہیں ورنہ تو قرآن حکیم کی برکات نصیب نہ ہوں گی بلکہ اُلٹا ذلت کا عذاب ہو گا۔ العیاذ باللہ!

دن کو شہر میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کھانا اور ظہر کا بیان بادشاہی مسجد میں تھا جو ایک بہت خوبصورت جگہ کنار دریا شاہی محل کے پہلو میں اپنی شان دکھا رہی ہے۔ وہاں اسوۂ حسنہ پہ بیان ہوا کہ اسوۂ حسنہ صرف نماز روزہ ہی نہیں، اخلاقیات، معاشرت اور سیاسیات سب ہی کچھ اسوۂ حسنہ میں موجود

ہے مگر ہم اسے بھول چکے ہیں اور زیادہ سے زیادہ نماز، روزہ ہی کو مراد لیتے ہیں وہ بھی نمازی اور دیندار لوگ امورِ دُنیا سے دامن بچا کے رہنے کو دین سمجھ لیتے ہیں۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ دُنیا سے دامن بچانا چاہیئے مگر اس کا معنیٰ یہ ہرگز نہیں کہ دُنیا کا کام ہی نہ کیا جائے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ دنیا کے کام بھرپور طریقے سے کئے جائیں مگر ان سے دامنِ دل آلودہ نہ ہو، اس جگہ میں صرف اللہ کی یاد بستی ہو۔ لہٰذا مدارس کے طلبا کو حصولِ علم کے بعد میدانِ عمل میں جانا چاہیئے اور جو لوگ میدانِ عمل میں تو ہیں مگر ان کی پیشانیاں سجدوں سے آشنا نہیں، انھیں اللہ کی بارگاہ میں یعنی مساجد میں بھی آنا چاہیئے کہ مسلمان عبادت کے وقت عابد اور کام کے وقت مجاہد نظر آتے۔

کچھ لوگ بیعت ہوئے۔ خطیب صاحب پرانے علماء میں ہیں لائبریری میں ان کی مجلس نصیب رہی۔ عصر کے بعد پھر ایک جگہ بیان تھا جسے مغلان دہ کہتے ہیں الگ گاؤں بھی ہے اور شہر کا محلہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کافی احباب منتظر تھے۔ جو بیان ہوا اس کا خلاصہ ارشادِ ربّانی کے مطابق تھا کہ اسلام میں سارے کے سارے داخل ہو جاؤ۔ مراد یہ ہے کہ ہر وہ کام کرو جس کی انسانی حیات اور کائنات کو ضرورت ہے قاعدہ یہ ہے کہ اسے اسلامی حدود کے اندر رہ کر کرو یہ ہرگز مناسب نہیں کہ دین اختیار کریں تو دنیا کے امور چھوٹ جائیں اور اگر دُنیا کی طرف متوجہ ہوں تو دین کا دامن ہاتھ سے جاتا رہے۔ بلکہ دُنیا کو بھی دین ہی بنا لیا جائے اور اسے اس طرح کیا جائے جس طرح دین کرنے کی اجازت دے۔

وہاں احباب کے ساتھ چائے پی۔ ہمارے بموریت والے ڈاکٹر صاحب کے عزیزوں کا گھر تھا وہ بھی اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور یوں ۱۰ ستمبر ۸۹ء کا

دن چترال میں بہت مصروف گزرا۔ ۱۱ ستمبر کو صبح ۶ بجے ہم شندور پاس کے لئے روانہ ہوتے خبر یہ تھی کہ آگے گلگت جانے کا راستہ بند ہے اور ہمارا پروگرام یہ تھا کہ درہ شندور سے گزر کر وادی غذر سے ہوتے ہوتے گلگت جائیں گے۔ عظمت نے سوچا سامان اٹھانے کی زحمت نہ کریں، واپس چترال تو آنا ہی پڑے گا۔ پھر لے لیں گے۔ ہاں، یہ مہربانی کر گئے کہ میرے دو بیگ گاڑی میں رہنے دیئے۔ چنانچہ ہم اللہ کریم کے بھروسے پہ نکل کھڑے ہوئے۔

چترال شہر سے نکلتے ہی کچی سڑک شروع ہو جاتی ہے اور گلگت داخل ہونے تک ساتھ نباہتی چلی جاتی ہے شہر کے باہر ہوائی اڈہ ہے۔ یہاں رن وے کے لئے کافی جگہ ہے مگر اڈہ برائے نام ہی ہے۔ تاروں کا جنگلہ سا اور چھوٹی سی عمارت۔ ہاں! جگہ خوبصورت ہے کنارِ دریا ہے۔ ایک طرف ترچھ میر کی بلند برف پوش چوٹی نظر آتی ہے جو چترال شہر کے سر پر تاج کی مانند سجی ہے یہ ۲۶،۰۰۰ فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ چترال سے شندور پاس اور پھر وادیٔ غذر سے گزر کر گلگت، یہ خوبصورت ترین مگر مشکل ترین راستہ ہے۔ چترال سے شندور تک چترال ہی کا علاقہ ہے جو بالائی چترال کہلاتا ہے۔

شہر سے نکلیں تو ہوائی اڈے سے آگے وادی تنگ ہونے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ دریا بھی سمٹ جاتا ہے اور سڑک بھی سمٹ کر کنارِ دریا سے لپٹ جاتی ہے پھر کبھی دریا کے غضب سے ڈر کر پہاڑی چٹان کے ساتھ بلند ہو جاتی ہے اور کبھی پھر سے نیچے آ جاتی ہے۔ بہر حال چونکہ صرف وہی راستہ ہے اس لئے اسی کو سڑک کہنا پڑتا ہے۔ وادی کی یہ تنگ دامانی تقریباً ستر کلومیٹر تک مسلسل چلتی ہے۔ آپ کو چاروں اوٹ بلند چٹانیں اوپر آسمان اور نیچے بہتا دریا نظر آتا

ہے۔ ہاں! ستر کلومیٹر پر بونی کا شہر آتا ہے جو تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے اور اپنی شادابی و خوبصورتی کے لئے بہت مشہور ہے۔ بونی کا فروٹ بے مثال ہے اور یہاں آ کر وادی کھل جاتی ہے۔

اس طرف بھی سارے علاقے میں (A.K.R.S.P) "آغا خان رورل سپورٹ پروگرام" کے بورڈ لگے ہیں۔ پانی کی سکیمیں، سڑکیں، ہسپتال سکول غذا، دوا کا اہتمام آغا خاں فاؤنڈیشن کی طرف سے ہوتا ہے مگر یہ سب کہنے کو ہے۔ در اصل آغا خانی یا اسمٰعیلی شیعیت پر لوگوں کو قائم رکھنے کے لئے یہ ایمان خریدنے کے ہتھکنڈے ہیں۔ آغا خاں سوم سر سلطان محمد شاہ ہیروں کے بہت بڑے سمگلر تھے۔ ان سب علاقوں میں ان کا اثر امراء سے جواہرات خرید کر پیرس سمگل کرنے کی وجہ سے ہوا۔ یہ لوگ حاضر امام کے قائل ہیں اور امام میں اللہ کا حلول مانتے ہیں۔ مسجد کی جگہ جماعت خانہ بناتے اور صبح ایک ہی رکعت نماز پڑھتے ہیں جس میں امام کو سجدہ کرتے ہیں۔

یہاں فاؤنڈیشن ان کے لئے اس طرح سرگرم عمل نہ تھی بلکہ اپنے کارندوں کو محض کرایہ وغیرہ دیتی تھی۔ ۱۹۸۲ء میں جمعیت العلمائے اسلام اور جماعتِ اسلامی کے حضرات نے مل کر آغا خانیوں کے خلاف چترال میں تحریک چلائی۔ خوب جلسے ہوتے نعرے لگے، فتوے صادر ہوتے۔ آخر کار لڑائی ہوئی، پانچ آغا خانی مارے گئے جبکہ چار مسلمان بھی کام آئے۔ جنہیں اُس وقت شہید کہا گیا مگر بعد میں بات بدل گئی۔ کچھ لوگ گرفتار ہوتے۔ تفتیش ہوتی رہی۔ بریگیڈیئر صاحب جو مارشل لاء کمانڈر تھے انھوں نے طے کیا کہ دونوں طرف سے لیڈروں پہ مقدمات چلائے جائیں۔ عام لوگوں کا قصور نہیں۔ چنانچہ نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ علماء اسلام

اور آغا خانی لیڈر جمع ہوئے تصفیہ ہوا اور صلح نامہ لکھ کر حکومت کو دیا گیا جس میں لکھا گیا کہ
فساد شرپسندوں نے کیا تھا ہم دونوں مسلمان بھائی ہیں اور آئندہ بھی امن سے رہیں
گے چنانچہ شہدا، تو شرپسندوں میں شامل کیے گئے اور آغا خانی مسلمان تسلیم ہوئے۔ جماعتِ
اسلامی اور جمعیت کے چترال کے صدور نے دستخط کیے اور یوں علماء کی جان بچی۔

یہ تو خاموش ہو گئے مگر آغا خان نے تب سے فکر کرنا شروع کیا۔ وہاں
فاؤنڈیشن بنائی، جو دنیا کے تمام ممالک سے چندہ لیتی ہے اور شمالی علاقہ جات
میں کام کرتی ہے۔ پہلا منصوبہ چھتیس ۳۶ کروڑ کا تھا جو وہ مکمل کر چکے ہیں اور اب
بیاسی ۸۲ کروڑ کے منصوبے پر کام ہو رہا ہے۔ اسی ۸۰ سے زائد نئی گاڑیاں اور کئی ہیلی کاپٹر
فاؤنڈیشن کے اپنے ہیں۔ جگہ جگہ انہی کے بورڈ نظر آتے ہیں۔ اب یہ فاؤنڈیشن
دنیا بھر کے ممالک سے شمالی علاقہ جات کے نام پر امداد جمع کرتی ہے اور خود عیش
کرتی ہے۔ کم از کم یہ موٹریں ہیلی کاپٹر اور سارا عملہ تو اسی سے پلتا ہے پھر پرنس
خود بھی شہنشاہ مزاج ہیں اور کروڑوں پاؤنڈ کا جوا کھیلتے ہیں۔ ویسے بھی بہت
امیر آدمی ہیں۔ بہرحال ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جہاں مدرسہ بنایا، آغا خانیوں کے بچے
بھی پڑھنے آگئے اور جو دوا بانٹنا شروع کی تو اکثریت آغا خانیوں کی لینے آئی جس
سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انگریزی ہیں۔ بورڈ بھی غیر ملکیوں کو دکھانے کے لیے ہے
کام کم ہی ہوتا ہے مگر پھر بھی کافی کچھ کر رہے ہیں۔

ہم بونی پہنچے۔ باغات میں گھرا ہوا خوبصورت شہر، یہاں کے سیب بہت
مشہور ہیں۔ انگور بڑا مزیدار ہوتا ہے۔ خوبانی، ناشپاتی، آڑو، غرض پھلوں اور
پھولوں کی بہار دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چنار کے قدآور درخت، جس درخت
کے نیچے ہمارے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ وہ صدیوں پرانا ہو کر گر چکا تھا۔ شاید کئی بار اس

کا تنا کاٹا گیا اور کئی بار اُگا۔ یوں پھیلتا رہا۔ اب اس کے گرد اگرد ایک تنے سے
اٹھارہ مضبوط اور قدآور چنار کھڑے تھے۔

یہاں کچھ دیر آرام کیا، کھانا کھایا اور ظہر مسجد میں جا کر ادا کی۔ جہاں مولوی
صاحب اور چند دوست پہلے سے ذکر کرتے ہیں۔ بیان ہوا مختصر سا تھا، کہ
معیّتِ رسالت ہی مسلمان کا سرمایۂ افتخار ہے اور ہم میں سے ہر ایک اس کا
مدعی بھی ہے اللہ کرے سب کو نصیب ہو۔ مگر قرآن حکیم نے اس کے اثرات ارشاد
فرماتے ہیں جو ظاہراً انسان پر مرتب ہوتے ہیں اور عبادات، معاملات، اخلاقیات
سیاسیات وغیرہ میں نظر آتے ہیں۔ برکاتِ معیت کے باعث گناہ سے نفرت اور
نیکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ اعمال میں خلوص اور للّٰہیت پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز
حیاتِ دنیا میں چہرے پہ تجلیاتِ باری رقص کرتی ہیں۔

محفلِ ذکر کے بعد احباب سے اجازت لی اور آگے روانہ ہوئے۔ یہاں
سے نکل کر وادی کھل جاتی ہے اور ایک عجیب صورت اختیار کرتی ہے۔ دریا سانپ
کی طرح بل کھاتا ہے۔ پہاڑ کے ایک طرف جاتا ہے تو دوسری طرف بہت بڑی
تکون بن جاتی ہے جس پر شہر آباد ہوتا ہے پھل، پھول اور کھیتیاں ہوتی ہیں۔
پھر دریا دوسرے پہاڑ کو جا چھوتا ہے اور جب پلٹتا ہے تو دوسری طرف تکون
چھوڑ دیتا ہے جس پر انسانی آبادی اپنے قدم جما لیتی ہے۔

ایک جگہ سڑک ایک بلندی پہ چڑھی تو دیکھا دور تک آری کے دندانوں
کی طرح دونوں پہاڑوں کے دندانے بڑھے ہوئے تھے۔ درمیان دریا حدِ فاصل
کا کام کر رہا تھا اور ہر دندانے پہ اک گاؤں آباد تھا۔ پیچھے ترچھ میر کی چوٹی بادلوں
سے جھانک رہی تھی۔ جو چترال کے سر پہ ہے اور دائیں طرف پادل پیکس،

(POWELL PEAKS) - یہ تین بلند چوٹیاں ایک ہی سلسلۂ کوہ سے متعلق ہیں۔ چو پاول کے نام پر مشہور ہیں۔ ایک سڑک پہاڑی کے اوپر چلی جاتی ہے۔ اور طور کوہ، مکوہ کو جاتی ہے جو تحصیل ہیڈ کوارٹر ہیں اور بونی سے ساٹھ کلومیٹر پہاڑوں کے اوپر تریچ میر کے عقبی دامن میں آباد ہیں۔

ہم چلتے رہے۔ وادی کے حسن کو آنکھوں میں سمیٹتے۔ کبھی کبھی عظمت کیمرے کی ٹیپ پر بھی چیزوں کو ثبت کر لیتا تھا اور یوں عصر کے وقت ہم مستوج پہنچے۔ یہاں سے دریائے چترال دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک شندور پاس کو جاتا ہے اور دوسرا بروغل پاس کو بروغل کا درّہ یہاں سے ایک سو چالیس کلومیٹر ہے جس میں بتیس کلومیٹر جیپ کا راستہ ہے اور باقی پیدل یا گھوڑے پر طے کیا جاتا ہے یہ بروغل واخان کی سرحد کے ساتھ منگولوں کی سرزمین میں داخلے کا دروازہ ہے۔ عنایت اللہ فیضی صاحب یہاں تشریف لے گئے تھے۔ کچھ حالات انھوں نے ستمبر کے شمارہ المرشد میں لکھے ہیں۔ جس میں زرعلی کا حال لکھا ہے کہ وہ جانتا ہے مسلمان ہوں مگر اسے کلمہ نہیں آتا۔ بندہ نے اس کے لئے فیضی صاحب کو کچھ رقم دی کہ اس کے ایک بچے کو مزدوری چھڑا کر تعلیم پہ لگایا جاتے۔ اس کا وظیفہ دارالعرفان سے مقرر کر دیں گے اور پڑھنے کے بعد اسی علاقہ میں لوگوں کو دین سکھانے کے کام پر لگایا جا سکے گا، انشاء اللہ!

دریا کی دوسری شاخ شندور پاس کی طرف مڑ جاتی ہے جدھر ہمیں جانا تھا مستوج گاؤں سے نکل کر عصر ادا کی اور چل دیئے۔ وہی کنارِ دریا، وہی سڑک کی تنگی وہی ہم۔ کچے راستے کی دھول الگ، دھکے اس پر مزید۔ مگر اللہ کریم کا احسان تھا جس نے ہمت دے رکھی تھی۔ اب سڑک کے ساتھ ساتھ ہم بتدریج اوپر جا رہے تھے

اور برفانی چوٹیاں قریب ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ سورج نے پہاڑوں کی اوٹ میں پناہ لے لی تھی لہٰذا خنکی اور نیم تاریکی نے ماحول کو سحر انگیز بنا رکھا تھا۔ ہم چلتے رہے۔ کنارِ دریا لوگوں کو، آبادیوں کو، پھولوں کو، جھرنوں اور پہاڑی چشموں کو آبشاروں اور گرتی دھاروں کو دیکھتے۔ حتیٰ کہ مغرب ہو گئی۔

اب ہماری منزل کوئی سات کلومیٹر دور تھی۔ جہاں سے ہم گزر رہے تھے، یہاں "دیدار مبارک" کا لکڑی کا خوبصورت رنگ برنگا سائبان اور سامنے پنڈال بنا ہوا تھا۔ دیدار مبارک، آغا خانی فرقے کا حج سمجھ لیں۔ آغا خاں وہاں کھڑا ہو کر پنڈال میں جمع لوگوں کو دیدار کراتا ہے بعض اوقات کئی سالوں بعد۔

ایک فرانسیسی سیاح لڑکی نے یہ سب سن کر کہا تھا:

"That play boy of Paris is the god for these poor people."

اس نے بھی ٹھیک کہا تھا اور یہاں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔

غرض ہم نے کچھ تاخیر سے مگر بالیم (BALEEM) پہنچ کر مغرب ادا کی۔ بالیم گاؤں کے مقابل دریا کے پار سڑک پر یہاں جیپ چھوڑی اور فیضی صاحب کے ساتھ روانہ ہوتے جن کا گھر تقریباً دو کلومیٹر دریا کے اس پار تھا۔

یہاں اگرچہ بجلی کی روشنی نہیں پہنچی مگر چوری چکاری کا رواج نہیں، لوگ گھروں کو تالا نہیں لگاتے اور مہینوں غیر حاضر رہ کر آ جاتے ہیں۔ کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا، کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ بدکاری کا کوئی تصور نہیں۔ اگرچہ بھوک اور افلاس ہے دوا نہیں ملتی۔ جدید آسائشوں کا کوئی تصور نہیں مگر یہ سب کچھ دے کر اگر ہمیں ایسا خلوص ایسی محبت کہیں مل سکے تو ہم یہ سودا مہنگا جانیں گے؟ سوچ لیں! پھر

چاہیں تو چل کر ان لوگوں سے مل بھی لیں۔

بالیم اور لاس پور، دو جڑواں گاؤں ہیں۔ یہ نو ہزار پانچ سو (9500) فٹ کی بلندی پر واقعہ ہیں۔ یہاں آکسیجن کی کمی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے اور سخت سردی ہوتی ہے۔ سردیوں میں تو منفی چالیس ڈگری تک جاتی ہے۔ بہرحال آجکل بھی رات تو بہت سرد تھی چونکہ درہ ساتھ ہے اس لئے یہاں ہوا بہت زوروں کی چلتی ہے اور سردیوں میں تو ہڈیوں سے ہو کر نکل جاتی ہے۔ ان دنوں بھی تہجد کے وقت باہر بہت سردی تھی۔ بلکہ ہاتھوں اور چہرے کی جلد جل کر سیاہ پڑ گئی اور واپس آکر بھی کئی روز سیاہ رنگ جھلکتا رہا۔

رات یہاں بسر کی، صبح تو تعمیرِ مسجد دیکھنا تھی۔ ذکر کے ساتھیوں سے ملاقات بیان اور محفلِ ذکر بھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو مریض دیکھ کر ادویات بھی تقسیم کرنا تھیں مگر سب سے اہم کام یہ پتہ چلانا تھا کہ گلگت کو جانے والا راستہ کھلا ہے یا نہیں؟ یہاں تو کسی کو علم نہ تھا کہ یہاں تو ایک گاؤں کو دوسرے کی خبر بھی کم ہوتی ہے آبادی کی اکثریت آغا خانی ہے۔ ہر گاؤں میں کچھ گھر مسلمان بھی ضرور ہیں۔ مگر عقائد سے بے بہرہ اعمال سے نا آشنا۔ یہ دُور دراز وادیاں اللہ کے نام کو ترستی ہیں کہ نہ مساجد ہیں نہ اذان ہوتی ہے۔

لاس پور میں ایک مسجد ہے وہاں مولانا صاحب بہت اچھے ملنسار اور نیک آدمی ہیں۔ اُن کی مسجد کے لئے احباب نے پشاور سے بیٹری والا لاؤڈ سپیکر کا سیٹ بھجوایا ہے۔ اللہ کریم جزائے خیر دے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ اس وادی میں بھی اللہ اکبر کی صدا گونجے۔

۱۲ ستمبر کو علی الصبح ناشتے کے بعد شندور ٹاپ کے لئے روانہ ہوئے تقریباً

تین ہزار فٹ مزید اوپر اسی پہاڑ کی چوٹی پر درہ ہے جس کے دامن میں گاؤں ہے مگر اوپر جانے تک کا راستہ چھ کلومیٹر لمبا ہے کہ موڑ پہ موڑ سخت چڑھائی اور نہایت تنگ سڑک۔ آدھے راستہ میں ایک موڑ میں جیپ کا ٹوٹا پھوٹا حصہ پڑا تھا جو نیچے سے لایا گیا تھا۔ انجن اور کچھ اور حصے دور نیچے جھاڑیوں میں نظر آرہے تھے۔ یہ مستوج کا ایک دوست تھا۔ جس کے ہاں پچھلے دورے میں احباب نے قیام کیا اور محفلِ ذکر ہوئی۔ بیچارے کی جیپ موڑ سے لڑھک گئی۔ اللہ کریم اپنے دامانِ رحمت میں جگہ دے! آمین۔

غرض اُوپر پہنچے۔ دونوں طرف پہاڑ درمیان میں تقریباً آٹھ دس کلومیٹر میدان سا ہے جس کے ڈھلوان نما حصے پہ تین خوبصورت جھیلیں ہیں۔ پہلی بہت بڑی دُوسری اس سے چھوٹی اور تیسری اس سے چھوٹی۔ ان میں مچھلی نہیں ہوتی، کہ گرمیوں میں پانی ساکن رہتا ہے اور سردیوں میں جم کر چٹان بن جاتا ہے۔ دونوں طرف چوٹیاں ہیں۔ میدان کی بلندی بارہ ہزار تین سو فٹ ہے۔ بڑی جھیل کے آگے ایک خوبصورت ہٹ میں مَیس بنا ہوا ہے جس کے سامنے پولو گراؤنڈ ہے۔ یہ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے بنوایا تھا۔ جھیل کے کنارے کنارے گاف کورس ہے پچھلے دنوں وزیر اعظم پاکستان نے بھی وہاں پولو دیکھا۔ جنرل صاحب مرحوم نے بھی افتتاح کیا تھا جس کی یاد ان کے خوبصورت فوٹو دلا رہے ہیں جو میس کی زینت ہیں۔ اختر ان فوٹو گرافز کو دیکھ کر رو پڑا اور وُہی بات بنی ہے ؎

میرے پاس سے گذر کر میرا حال تک نہ پوچھا
مَیں یہ کیسے مان جاؤں وہ شندور جا کے روئے

شاعر سے معذرت کے ساتھ۔

ایک ڈاکٹر صاحب اور ایک میجر صاحب وہاں مقیم تھے۔ شاید کوئی گاف کا پروگرام بن رہا تھا۔ ان کے ساتھ چائے پی اور راستے کا پوچھا۔ اُنھوں نے فون کر کے پتہ کیا کہ راستہ کہیں گلگت کے قریب سے بند ہوتا تھا۔ پتہ چلا کہ آجکل کھلا ہے گلگت سے گاکوچ تک فوجی جوان سڑک کھلی کر رہے ہیں اس وجہ سے کبھی کبھی راستہ بند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ واپس بالیم پہنچے کھانا کھا کو ظہر ادا کی اور عصر تک عظمت نے مریض دیکھے پھر عصر کی نماز مسجد میں جا کر ادا کی جس کا سب کام مکمل ہے۔ مگر ابھی اس پر چھت نہیں پڑی اس کے لئے چادروں کی ضرورت باقی ہے۔ تقریباً تیئیس ۲۳ بچے بچیاں قرآن مجید پڑھنے والے تھے۔ جن میں بارہ ۱۲ مسلمانوں کے تھے، باقی آغاخانیوں کے۔ یہ بہت مؤثر طریقۂ تبلیغ ثابت ہُوا ہے۔

پچیس ۲۵ تیس ۳۰ آدمی بھی جمع ہو گئے تھے۔ ضرورتِ ذکر پر بیان ہُوا اور محفلِ ذکر بھی۔ اور یوں اس گاؤں کا پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔

ان وادیوں میں جہاں پھلدار درختوں کی بہتات ہے۔ وہاں ایک خوبصورت درخت کا نام لیلیٰ مجنوں ہے۔ اس کا نر روتا رہتا ہے یعنی اس کے پتّوں سے قطرے ٹپکتے رہتے ہیں اور رات دن نیچے کی زمین گیلی نظر آتی ہے اس لئے مقامی لوگ اِسے مجنوں اور مادہ درخت کو لیلیٰ کہتے ہیں۔ انگریزی میں اِسے "WEEPING TREE" بھی کہتے ہیں مگر اس کا اصل نام وِلّو (WILLOW) ہے۔ یہ بہت قیمتی درخت ہے۔ اس سے کھیلوں کا سامان بنتا ہے خصوصاً انگلینڈ کا وِلّو کا بنا ہُوا بیٹ تقریباً دس ہزار ۱۰۰۰۰ کا ملتا ہے۔ یہ درخت شندور ٹاپ سے دوسری طرف گلگت تک بہت کثرت سے ہے۔

یہاں سے ہم ۱۳، ستمبر کو علی الصبح روانہ ہوتے۔ طے یہ ہُوا کہ فیضی صاحب

کو تو چترال جانا ہی ہے۔ لہٰذا ہمارا سامان ایئر کارگو سے پشاور بھیج دیں گے اور گلگت سے واپسی پہ ہم لے لیں گے۔ لہٰذا ہم احباب سے رخصت ہو کر روانہ ہوئے بروقت چوٹی پر پہنچ گئے۔ وہاں چند لوگ جو مردان سے تھے۔ ایک خیمہ لگائے ہوئے تھے اور اُن کی جیپ سردی کے باعث سٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ اُنھوں نے روکا اور مدد چاہی۔ پوچھا "بھئی! رسّی ہے؟"

کہنے لگے "نہیں! اب دھکا ہی لگ سکتا ہے چلو! ہمّت کرو۔"

ہم سب بھی شامل ہو گئے مگر گاڑی سٹارٹ نہ ہو سکی۔ صرف ٹھنڈ ہی کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہاں آکسیجن کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے نہ انسان میں دہ دم رہتا اور نہ آگ ہی آرام سے جلتی ہے انجن بھی آسانی سے سٹارٹ نہیں ہوتے بہرحال تقریباً آدھ گھنٹہ محنت کی۔ مگر نتیجہ کچھ نہ ہُوا۔ دیکھا تو سکاؤٹس آرہے تھے، جو پولو گراؤنڈ ٹھیک کرنے پہ کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان سے کہا کہ اب آپ اُن کی مدد کریں۔ گزشتہ روز کی واقفیت کام آئی کہ اُن کے انچارج آفیسر ہمارے دوست تھے لہٰذا اُنھوں نے ہمیں فارغ کر دیا۔ دیکھا تو اپنی موٹر کا ایک پہیہ پنکچر تھا۔ تبدیل کیا اور اللہ کے بھروسے پر روانہ ہو گئے۔

پوسٹ اور جھیلیں پیچھے چھوڑ کر اترائی پر پہنچے تو پتہ چلا کہ بہت سخت اُترائی ہے۔ ہم گلگت کے علاقہ میں داخل ہو چکے تھے۔ بڑا ہی تنگ راستہ مگر دونوں طرف جنگلی گلاب کی جھاڑیاں اور ان میں کئی رنگوں کے پھول، چھوٹی سی نالی پانی کے نیچے کو بھاگ رہی تھی۔ اور میں دیکھ رہا تھا کہ یہ بپھرتا ہوا دریا گلگت سے گزرے گا جو فی الحال تو محض چند قطرے نظر آتا ہے۔ جُوں جُوں آگے بڑھتا جاتے گا۔ پہاڑی نالے اس میں شامل ہو کر اِسے تقویت پہنچانے کا باعث بنتے رہیں گے۔

کافی اترائی کے بعد نیچے پھر میلوں میں پھیلا ہوا میدان جس کے دونوں طرف برف پوش چوٹیاں تھیں اور اس میدان میں دریا نہ سہی مگر ایک خوبصورت ندی ضرور بن چکی تھی جس کے گرد سبزہ اور خودرَو جھاڑیاں تھیں۔ پانی میدان میں پھیل پھیل جاتا تو سبزہ بند باندھنے کی کوشش کرتا نظر آتا۔

اس سبزے پر ان جھاڑیوں میں یاک اور گائے بیل اکٹھے چرتے پھر رہے تھے۔ یاک ایک جنگلی گائے ہے جو وزن میں بھینس کے برابر ہوتی ہے۔ نوکدار لمبے بال اور گھوڑے کی طرح دُم، مقامی لوگ اسے پال لیتے ہیں۔ پھر دُودھ بھی استعمال کرتے ہیں، سواری اور باربرداری کا کام بھی لیتے ہیں۔ گوشت بہت لذیز اور ہرن کے گوشت کی مانند نرم ہوتا ہے۔ اصلاً یہ برف میں رہنے والا جانور ہے۔

اس وادی میں سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک چشمہ ہے جس میں کوئی معدنی اثر ہے لوگ اس کا پانی پیتے ہیں تو کئی سال گیس کی تکلیف نہیں ہوتی اور عجیب بات یہ ہے کہ چشمے سے نکل کر اس میں وہ اثر نہیں رہتا۔ اسی جگہ پی لیا جائے تو ٹھیک ورنہ جس قدر بھی بند کر کے رکھو اس میں سے تُرشی بھی رُخصت ہو جاتی ہے اور اثر بھی۔ ہم وہاں نہ جا سکے کہ اس کے پینے سے پیٹ بھی چل جاتا ہے اور آدمی فوراً سفر نہیں کر سکتا۔ ہمارے پاس رُکنے کے لئے وقت نہ تھا۔

وادی سے قراقرم کی مختلف چوٹیاں نظر آتی تھیں۔ شمالی چوٹی کا نام دس پار اور بلندی ۲۴،۴۷۰ فٹ ہے۔ جب یہ وادی ختم ہوئی۔ تو گلگت کی پوسٹ تھی اُنھوں نے گاڑی چیک کی۔ دو سپاہی، پولیس کی وردی میں ایک پُرانے سے ٹینٹ کے پاس کھڑے تھے۔

پُوچھا: "ہمارا پہیہ پنکچر ہے کہیں قریب انتظام ہوگا؟"

کہنے لگے: "پھنڈر میں پنکچر لگ جائے گا۔"

"بھئی! کتنا دُور ہے؟"

وہ کہنے لگے: "گھنٹے بھر کا راستہ ہوگا۔"

یہ کوئی نو بجے کا عمل ہوگا مگر پُورا زور لگا کر ہم ڈیڑھ بجے کے آس پاس پھنڈر سے گزرے جو واقعی نسبتاً بڑا گاؤں تھا۔ دُکانیں تھیں مگر پنکچر لگانے کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ انھوں نے ہم سے جھوٹ ہرگز نہ بولا تھا۔ یہ صرف ان کی سادگی تھی جو برسوں سے ایسی جگہ رہ کر حاصل ہو گئی تھی جہاں سوائے سادگی کے کچھ نہیں ملتا اور اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب کئی روز بعد ہم گلگت داخل ہوئے تو پکّی سڑک، موٹریں، بجلی، دُکانیں اور شہری آبادی۔ ہاں! واقعی گلگت بھی شہر لگ رہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر محسوس ہوا کہ ہم شاید برسوں تہذیب سے بیگانہ رہے ہیں اور جنگلوں ہی میں گھومتے پھر رہے ہیں۔ سب کچھ بالکل عجیب لگ رہا تھا۔ اگر ڈیڑھ ہفتے کا یہ اثر ہم پر ہو سکتا ہے تو جن کی عمریں وہاں بیت رہی ہیں۔ اُن کا حال کیا ہوگا؟

پولیس چیک پوسٹ سے لے کر آگے راستہ بہت ہی تنگ ہو جاتا ہے۔ اس قدر تنگ کہ اگر سامنے سے گاڑی آ جائے تو دونوں میں سے ایک کو میلوں پیچھے جانا پڑتا ہے وہ بھی ریورس میں، مگر عموماً ہوتا یہ ہے کہ یہاں گاڑیوں کی ملاقات شاذونادر ہی ہوتی ہے۔ سڑک کسی آبشار کی طرح بلندیوں سے گرتی چلی جاتی ہے۔ پہاڑوں کے وسط میں تیرو نامی گاؤں آتا ہے جس میں سے سڑک یوں گزرتی ہے کہ پُورے شہر کے اندر سے نکل جاتی ہے اور شہر کو چھُوتی بھی نہیں۔

پہاڑی ڈھلوانوں پر دو دو تین تین بکھرے ہوئے سادے گھر اپنی الگ بہار رکھتے

ہیں۔ پہاڑی کے گھاؤ میں پانی بھر اکھڑا تھا، جو اس کی چوٹی سے آرہا تھا۔ اس خوبصورت جھیل کے کنارے ایک بچی اور اندر مرغابیوں کی ڈار تھی اور کنارے کنارے ہمارا راستہ مگر ہر کوئی اپنی حالت میں محو، شاید میرے سوا۔

یہاں سے نیچے دریائے غِذر نظر آتا ہے جس میں وہ چھوٹا دریا بھی مل جاتا ہے جو ہمارے ساتھ آرہا تھا اور دوسری وادی سے آنے والا دریا بھی غذر ایک گاؤں ہے جو پہاڑ کے قدموں میں نہایت خوبصورتی سے سجا ہے اور بہت معروف ہے۔ شاید خضر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دریا اور وادی دونوں ہی کو غذر کہتے ہیں۔ مگر صاحب نہ کوئی وادی اتنی حسین ہوگی اور نہ کوئی دریا اس قدر پیارا۔ اتنی بلندیوں پہ وادیوں میں وسعت کا تصوّر نہیں۔ مگر یہ وادی تو جہاں سے کم چوڑی ہے وہاں بھی ایک کلومیٹر تو ہوگی۔ کہیں دو بھی اور جس قدر وادی پھیلی ہے، دریا اُسی قدر پاؤں پسار لیتا ہے ایک سے دو اور دو سے دس بن جاتا ہے۔ نیلا شفاف پانی ٹراوٹ مچھلیوں کا خزانہ پھولوں سے بھرا ہوا، پھلوں سے لدا ہوا، فصلوں سے پُر، ہر طرف زندگی، ہر طرف سادگی، ہر طرف بہار۔ سُنا ہے انگریز بہادر اسے "چھوٹا کشمیر" (LITTLE KASHMIR) کہا کرتا تھا۔ اگر کشمیر بھی ایسا ہی ہے تو واقعی بہت خوبصورت ہے مگر یہ بات نہ بھولیے گا کہ یہ سب پاکستان کا حصّہ ہے مگر یہاں کچھ بھی نہیں نہ سڑک، نہ ہسپتال، نہ سکول نہ بازار۔ گویا ملک کے اندر رہنے والے لوگ ایک طرح سے ملک سے باہر رہتے ہیں۔ محض قدرتی موسموں کے رحم وکرم پر پاک سرزمین پر کوئی انھیں اللہ کریم کا نام بتانے کی زحمت بھی نہیں کرتا۔ اکثریت آغا خانیوں ہی کی ہے جو اپنے اپنے کھیتوں میں کام پر لگے تھے کہ آجکل فصل سمیٹنے کے دن ہیں۔ کام زیادہ تر خواتین ہی کرتی ہیں۔ عموماً

صُبح سویرے ہر خاتون، ہر بچّی کمر پر ایک خاص ٹوکری اٹھا لیتی ہے جو اُن کے لباس کی طرح روزانہ ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ مختلف اشیاء اُٹھانے کے کام آتی ہے۔ اسلام کے علاوہ پاکیزگی کا تصوّر نہیں، لہٰذا یہ اسمٰعیلی یا آغا خانی بھی دریا کنارے رہتے ہوئے بھی مہینوں غسل نہیں کرتے۔ خواتین تو ترکی ٹوپی کی طرح بنی ہوئی ٹوپی دوپٹے کے نیچے پہنتی ہیں اور لباس بھی موٹا ہوتا ہے جس کی وجہ سے عجیب سی بدبو آتی ہے، اگر کسی خاتون کی ٹوپی اُتر جاتے تو کمرہ تو الگ رہا، انسان تو شاید اس کھیت میں بھی کھڑا نہ ہو سکے۔ یہ انسانیت کی رُوحانی ویرانیوں کا حال ہے۔

دُنیا کے اعتبار سے وہاں کسی جدید سہولت کا نام نہیں۔ اس کے باوجود محنت کرنے والے کسان بھوکے نہیں رہتے۔ بھیڑوں اور بکریوں کے گلے بیلوں اور گایوں کے غول دریا کے بنائے ہوئے جزیروں میں چرتے پھرتے تھے۔

اس وادی میں ہمیں کوئی کوئی گاڑی سامنے سے بھی ملنے لگی۔ جن میں چند ایک آغا خان فاؤنڈیشن کی جیپیں تھیں اور ایک آدھ گلگت سے آنے والی سواری کی موٹر۔ یہ بھی ویلی جیپ ہی ہوتی ہے یا لینڈ کروزر مگر یہاں گاڑیاں گزارنے کی جگہ تھی۔ جب ہم عین وادی میں پہنچے تو رہا نہ گیا۔ موٹر روک کر دریا کے اندر اُتر گئے۔ موجوں سے لڑتی ہوئی ایک چٹان پر ڈیرہ لگا کر تھرماس کھولا تو چائے خراب ہو چکی تھی کہ جہاں سے ہم چلے تھے وہ بیچارے کھانے پکانے سے بھی کم ہی واقف تھے انھوں نے پتی سمیت چائے تھرماس میں ڈال دی، جواب بُو دے رہی تھی چنانچہ دریا کے پانی میں اپنے ہاتھوں بہائی۔ مجھے چائے بہت پسند ہے پھر سفر بھی مسلسل اور دوپہر ہو چلی تھی دریا کا دامن مگر مجبوری۔ وہ شعر بہت یاد آیا ؎

اے محتسب! نہ پھینک ارے محتسب نہ پھینک

ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

مگر مجبوری تھی۔ کھانا دیکھا، وہ بھی خراب ہو چکا تھا۔ صرف چند دوستوں کی یاد تھی جو تازہ تھی اور بس۔

الغرض چلتے رہے پھنڈر بھی پہنچ گئے مگر یہ بھی اک ویرانہ تھا۔ ہاں! پانچ سات دوکانیں سرِ راہ تھیں جن میں آٹا دال مل جانے کی اُمید کی جا سکتی تھی ایک کچے سے کوٹھے پر غالباً "سدا بہار ہوٹل" کا بورڈ لگا تھا اور دروازے پہ تالا۔ ایک دوکان کے باہر لیٹر بکس بھی نظر آیا۔ یہ تھی پھنڈر کی شہریت اور بس۔

ہم گذر گئے اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

راستہ اور اس کی گرد سڑک کی ناپختگی کے ساتھ قدم قدم پر دھکے۔ یہ اللہ کریم کا شکر ہے گاڑی ایئر کنڈیشنڈ تھی لہٰذا شیشے چڑھا رکھے تھے۔ بہر حال صُبح سے فاقہ مستی کا نشہ بڑھ رہا تھا مگر عجیب بات ہے شوگر کے مریض کے لیے بغیر خوراک کے قدم اُٹھانا دوبھر ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں میں اندھیرا آ جاتا ہے مگر وادی کا حُسن اس قدر بے پناہ تھا کہ مجھے فاقہ بھول گیا۔

بالآخر ہم دو بجے کے قریب اس نالے پر پہنچے، جہاں پُل خراب اور راستہ بند رہتا تھا۔ لکڑی کا معلق پل تھا۔ شاید کوئی گاڑی گری تھی کہ کنارے ٹوٹ چکے تھے۔ ٹھیکیدار کے آدمی وہاں تھے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ سواریاں اُتر کر پیدل پل عبور کریں۔ یہ نالہ بارتیھ کہلاتا ہے۔ اچھا بھلا دریا اس جانب سے آکر دریائے غذر میں مل رہا تھا۔ اس نالے میں ساری آبادی گجر قوم کی ہے جو انتہائی غریب اور کسمپرسی کا شکار ہے۔ ہم نے پل عبور کیا یقیناً جان پر کھیل کر گاڑی کو پُل پر چڑھانا آسان نہ تھا

ایک نقص یہ تھا کہ وہاں چھوٹی جیپیں چلتی ہیں جبکہ ہمارے پاس پجارو تھی، جو ان سے بڑی تھی۔ بہر حال اللہ کریم کا شکر ہے کہ سلامتی سے پار اُتر گئے۔ پھر سے سب کو بٹھایا اور چل دیئے۔ کوئی پندرہ منٹ چلنے کے بعد میر صاحب کی جیپ آتی ہوئی نظر پڑی، جو ہمارے استقبال کو تشریف لا رہے تھے۔ ملاقات ہوئی۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور مسلسل چلتے رہے۔

تقریباً اڑھائی بجے ہم گوپس پہنچ گئے۔ شندور سے یہاں تک یہ ایک سٹیٹ تھی۔ جس کا دارالخلافہ گوپس تھا۔ غالباً یہ ریاستیں ۱۹۷۵ء میں بھٹو صاحب نے ختم کی تھیں۔ ہمارا عارضی قیام ریاست کے سابق حکمران صاحب کے درِ دولت پہ تھا جو ایک نیک دل اور کھرے انسان تھے۔ اب فوت ہو چکے تھے۔ ان کے صاحبزادے راجہ اصغر حسین صاحب گھر پہ تھے۔ محل نما مکان میں اُن کے کمرے تک جانا بجائے خود ایک بڑا کام تھا۔ ظہر ادا کی۔ چائے، پھل اور ٹراؤٹ سے تواضع فرمائی۔ بہت محبت سے پیش آئے اُن کی نواسی بیمار تھی جو چند ماہ کی تھی ان کے پاس دوا بھی تھی جو اسلام آباد سے لاتے تھے۔ مگر نہ بیماری کا پتہ نہ دوا کے متعلق کوئی بتانے والا۔ حضرت نے بچی کو دیکھ کر بتایا کہ اس کی دوا یہی ہے اور یہ اس کا طریق استعمال ہے۔ تو بہت خوش ہوئے۔ جب حکمرانوں کا حال یہ ہے تو عام آدمی کا حال کیا ہوگا؟

عرض کیا کہ میں نے تو یہ سارا سفر یہ دیکھنے کے لیے ہی اختیار کیا ہے کہ لوگوں کا حال کیا ہے اور ہم ان کے کس کام آسکتے ہیں؟ انھوں نے وعدہ فرمایا کہ آپ ڈاکٹر صاحب کو ادویات دے کر روانہ کریں ہم گاؤں گاؤں ساتھ جائیں گے، لوگوں کو دین بتانے والا کوئی نہیں، ہو سکے تو اس کا اہتمام کریں۔

چنانچہ ان کے خلوص نے بہت متاثر کیا۔ وہاں سے چلے تو اُن کے داماد ساتھ تھے جو حلقۂ ذکر کے پرانے ساتھی ہیں۔ ان کا نام شیر اسلام ہے۔ انھوں نے دریا کنارے ایک مسجد میں چاء کا اہتمام کر رکھا تھا۔ جیسے آپ پُل پر سے گزریں انگور کی بیلوں میں ڈھکی ہوئی چھوٹی سی مسجد ہے۔ گاؤں کا نام "ہچ بارگو" ہے۔ اور اس کا واحد مالک شیر اسلام کا چچا ہے باقی سب لوگ اس کے مزارع ہیں۔ بہت لُطف آیا۔ کچھ پھل کھائے۔ حتیٰ کہ مغرب بھی وہیں ادا کی اور پہاڑوں کی اوٹ سے نکلتے ہوئے چودھویں کے چاند کو دیکھا کئے۔

یہ ہچ بارگو گوپس ریاست کا آخری گاؤں ہے یہاں سے آگے پُنیال کی ریاست شروع ہو جاتی ہے اور ایک وادی دوسری طرف مڑتی ہے جس میں الگ ریاست یاسین نامی تھی یہ داخان بارڈر تک جاتی ہے۔ اگرچہ یہ سب ریاستیں سابقہ ہو چکی ہیں مگر سابق حکمرانوں کے بعد بھی ان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں، ہر وہ شے جو قدرتی طور پر پلتی ہے خوبصورت ہے اور ہر وہ کام جو انسانی توجہ کا محتاج ہے، قابلِ رحم حالت میں ہے۔

یہاں سے دس بارہ میل "گاکوچ" تھا۔ جہاں میر صاحب کے ریسٹ ہاؤس میں ہمارا قیام بھی تھا اور طعام بھی۔ رات یوں گزر گئی، جیسے آئی نہ تھی۔ کام محنت اور مشقت، یہ سب چیزیں مشکل تو لگتی ہیں مگر ان میں دُہری لذت بھی ہے، کام کر کے ایک منفرد سا ٹھنڈا ٹھنڈا لطیف اور مزیدار احساس پیدا ہوتا ہے اور جب نیند آتی ہے تو لوریاں دیتی ہے، عجیب بات ہے۔ صبح، نقشے، چارٹ، راستہ پروگرام سب کچھ دیکھ کر پھر ناشتہ اور وہی ویران راستے تھے اور ہم تھے لیکن یہاں سے گلگت تک راستہ تنگ نہیں رہا تھا، فوج کے جوانوں نے خوب کھلا کر دیا تھا

حتیٰ کہ ایک چھوڑ، دو موٹریں بھی پہلو بہ پہلو چل سکتی تھیں مگر تا حال ذرا ہموار نہ تھا، لہٰذا رفتار تو وہی تھی اور کچھ ان حسین وادیوں میں بھاگنے کو جی بھی نہیں چاہتا۔ بھلا کوئی حُسن سے بھی بھاگا کرتا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔

تھوڑی دور سرِ راہ فوجی جوانوں کا کیمپ تھا۔ سب کے لئے سہولتیں فراہم کرنے والے سب کے محافظ، سب سے الگ ڈیرہ ڈالے پڑے تھے۔ دن بھر کام کر کے رات یہاں آرام کرتے۔ شاید شہر کے باسی تو وہاں رہنا سزا سمجھیں، مگر ان کے لئے وہی آرام تھا۔ ہم چلتے رہے، دریا بل کھاتا رہا اور سڑک بھی اس کے ساتھ پہلو بہ پہلو پلٹتی چلی گئی۔ آبادیاں آتی اور گزر جاتی تھیں۔ جماعت خانے آغا خانی فاؤنڈیشن کے نشانات اور مساجد سے محروم گاؤں۔ حتیٰ کہ ایک جگہ ایک معاون نالے پر ایک ٹرک پھنسا ہوا تھا۔ یہ پُل بھی فوجی جوانوں نے عارضی بنایا تھا۔ ایک خاص قسم کے گارڈر اور اُن پر اسی مقصد کے لئے بنی ہوئی مخصوص چادریں۔ مگر چادریں کم تھیں، ایک جگہ سے چادر بیٹھ گئی اور ٹرک کا پہیہ نیچے چلا گیا۔

ہم جیپ کھڑی کر کے دریا کنارے پتھروں پہ بیٹھ کر چاء پینے لگے۔ ایک فوجی حوالدار صاحب نظر آئے جنہوں نے بتایا کہ انھوں نے ایک پُل کے سامان سے تین پُل بنائے ہیں، جو سب ہی ضروری تھے۔ اُن کے تین بلڈوزر تیل کے لئے رُکے ہوتے تھے۔ بس اسی رفتار سے وہاں کام ہو رہا تھا۔

الغرض دو گھنٹے ضائع کر کے وہاں سے نکلے تو گلاپور جا کر رُکے۔ میجر شمس کا گھر تھا۔ گھر والوں کو ذکر کروایا۔ کچھ بچیوں نے بیعت کرنا تھی۔ انھوں نے اصرار تو بہت کیا کہ ظہر پڑھ کر چلے جانا مگر ہم رُک نہ سکے۔ اور یوں ظہر گلگت پہنچ کر ادا کی۔

آج ۱۴ ستمبر تھی اور ہم نے ۶ ستمبر کو پکی سڑک چھوڑی تھی ان نو دنوں میں ہم خود کو

ویرانوں کا حصہ سمجھنے لگ گئے تھے اور تارکول بچھی سڑک، بجلی کے کھمبے، گلیاں اور چوک، آدمیوں کی کثرت، دوکانیں یہ سب کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ الحمدللہ!

ہم گلگت پہنچے، ظہر ادا کر کے کھانا کھایا، آرام کیا اور عصر کے بعد مدرسہ دیکھنے اور علما حضرات کی زیارت و ملاقات کو چلے گئے۔ میں نے ان حضرات کا تذکرہ پہلے کیا ہے ایسے لوگ وہاں رب کریم کا انعام لگتے ہیں کہ ان ویرانوں میں لوگوں کو اللہ کا دین سکھانے کا عظیم کام کر رہے ہیں۔ رات کو احباب کے ساتھ محفل ذکر تھی۔ علی الصبح ذکر کے بعد درس قرآن ہوا۔ ہم نے ناشتہ کیا اور ۱۵ ستمبر کو گلگت سے خنجراب کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ وسیع اور پکی سڑک ہے جو پاکستان آرمی نے چین کے اشتراک سے بنائی ہے اور واقعی دُنیا کا آٹھواں عجوبہ اور دورِ حاضر کی انجینئرنگ کا کمال ہے۔ گلگت سے تقریباً پچیس کومیٹر تک سُنی شیعہ اور اسمٰعیلی آبادی ملی جلی ہے۔ اس سے آگے دو ریاستیں شروع ہو جاتی ہیں جن کو خنجراب سے آنے والا دریا جُدا کرتا ہے۔ جاتے ہوئے دائیں ہاتھ نگر یہ خالص شیعہ ریاست ہے۔ گھر گھر اور شہر شہر امام باڑے ہیں مگر مسجد کا نام نہیں اور دوسری طرف ہُنزہ۔ یہ خالص آغا خانی یا اسمٰعیلی ریاست ہے جس میں جماعت خانے ہیں مساجد کا نام نہیں۔ یہ تقریباً دو سو پچاس کلومیٹر پہلو بہ پہلو چلتی ہیں۔

ہُنزہ کا صدر مقام علی آباد ہے یہاں اب ایک مسجد بنی ہے اور ایک آدھ گھر مسلمان ہوا ہے۔ بہرحال یہ میلوں پر پھیلا ہوا وسیع اور حساس علاقہ، جو ایک طرف سینکڑوں میل واخان کی سرحد سے ملتا ہوا چلتا ہے۔ پھر چین کی سرحد کے ساتھ ہوتا ہوا ہندوستان کی سرحد کو جا چھوتا ہے جس میں کشمیر کا متنازعہ بارڈر بھی ہے۔ تقریباً سارا ہی اسی طرح سے ہے۔ کم از کم چترال سے گلگت، سکردو اور بہت نیچے



خنجراب ٹاپ

دارالعرفان (کافرستان) کو جانے والا پل



تک سوائے شیعہ اور آغاخانیوں کے کوئی نہیں بستا۔ زندگی کی کوئی آسائش ہے نہ مذہب کا کوئی نشان۔ یہ دیس اندر پردیس ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے جنوں کی آبادیاں ہوں یا کوئی اور کسی دوسری دنیا کی مخلوق بستی ہو۔

کیا میرے ہم وطن اس طرف متوجہ ہوں گے؟

ہم آبادیاں دیکھتے حالات کا مشاہدہ کرتے اور راستہ طے کرتے چلے گئے۔ سڑک کنارے چھوٹی چھوٹی مساجد ہیں جو فوجی جوانوں نے بنائی ہیں اور اب بھی سڑک کی مرمت کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ہم نے کھانا خنجراب پاس پر پہنچ کر کھایا جو سولہ ہزار فٹ بلندی پر ہے۔ یہاں سے شاہراہ قراقرم چین میں داخل ہوتی ہے۔ ہم کھانا کھا چکے تو چین کی طرف سے بس آگئی جس میں چینی کسٹم اور فوج کے چند لوگ بھی تھے۔ باقی پاکستانی کچھ غیر ملکی سیاح تھے، ان سے گپ شپ ہی اب واپسی تھی۔ جیپ واپس روانہ کر کے میں نے پیدل چوٹی پہ چڑھنا شروع کر دیا، جو وہاں سے مغرب کو تھی۔ آہستہ آہستہ بلند بھی ہوتی جا رہی تھی اور دور بھی۔ ڈاکٹر عظمت، اختر ڈرائیور اور ایک مقامی ساتھی ارشاد صاحب ساتھ تھے۔

جوں جوں قدم اوپر اٹھ رہے تھے، اعصاب ٹوٹ رہے تھے مگر ہم بڑھتے رہے اور یوں تقریباً دو ہزار فٹ مزید بلند ہوتے تو خوبصورت یاک چرتے ہوئے پائے۔ مگر اختر اور ارشاد کا چہرہ پیلا پڑنے لگا، اُن کی نگاہ بھی متاثر ہونے لگی۔ یہ سب آکسیجن کی کمی کا اثر تھا۔ اس کی وجہ سے اعصاب کام چھوڑنے لگتے ہیں۔ دماغ متاثر ہوتا ہے تو سننے اور سمجھنے کی صلاحیت میں فرق پڑنے لگتا ہے، نگاہ خراب ہونے لگتی ہے بلکہ ایک کے دو نظر آنے لگتے ہیں چنانچہ ان دونوں کو نیچے روانہ کر کے ڈاکٹر صاحب اور میں کچھ دور بڑھتے گئے۔ ہم تقریباً انیس ہزار (۱۹،۰۰۰) فٹ بلند ہو چکے

ہوں گے کہ واپسی کی ٹھانی اب ہماری طبیعت بھی مضمحل ہونے لگی تھی اور اعصاب پر شکستگی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ لہٰذا نیچے اُترنا شروع کر دیا اور چوٹی سے غالباً پانچ چھ کلومیٹر نیچے جیپ سے آملے: ظہر ادا کی کہ اُترتے ہوئے راستہ میں وضو تو کر ہی لیا تھا خوب ٹھنڈا پانی تھا بہت لُطف دے گیا۔

اب واپسی کا سفر شروع ہوا، جو رات کو ختم ہوا اور یوں رات گلگت بسر کر کے ۱۶ ستمبر کی صبح ہم واپسی کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہ قراقرم کی شاہراہ اور وہی ہم سالوں پُرانے رفیق، وہ ہماری واقف ہم اس کے جاننے والے مگر اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ پتہ چلا کہ عہد محمد خانی میں ہی جمہوریت نے سول کے سپرد کر دی تھی۔ ٹھیکیدار بل وصول کرتے رہے، مرمت نہ کی۔ لہٰذا سڑک ختم ہو گئی تاآنکہ پھر فوج کو مرمت کا حکم ہوا ہے جو بڑے زور شور سے کام کر رہی ہے اور یوں نئی سڑک بنتی جا رہی ہے۔ ہم نے داسو سے نکل کر لبِ سڑک اور لبِ دریا کھانا کھایا جو جیپ میں رکھا تھا۔ چائے پی، وضو کر کے ظہر ادا کی اور عصر کے وقت ہم بشام پہنچ چکے تھے جہاں سے پچیس ۷۵ کلومیٹر پر تھا۔ کوٹ سے سڑک دریا چھوڑ کر پہاڑوں پہ چلی جاتی ہے اور ایبٹ آباد جا کر نکلتی ہے مگر ہمیں بشام سے سوات جانا تھا۔ لہٰذا ادھر مڑ گئے۔ آجکل وہاں اپنے ایک عزیز بطور ایس۔پی تعینات ہیں۔ انھیں فون کر کے اطلاع دی تھی۔

سڑک ایکدم چڑھائی چڑھ کر وادی میں داخل ہو گئی۔ تنگ اور حسین وادی، جس کے گھر بتا رہے تھے کہ یہاں کی اکثریت خوشحال ہے۔ خوبصورت گھر اور چادروں کی چھتیں یہ بتا رہی تھیں کہ لوگ اچھے ہیں۔ مساجد، مدرسے، علماء، تبلیغی احباب سب کچھ بڑی کثرت سے تھا۔ ہم چلتے رہے حتیٰ کہ وادی کے خاتمے پہ الپوری کا

شہر آیا، جو غالباً سب تحصیل لگتا تھا۔ وہاں سے سڑک ایکدم اوپر چڑھنے لگی اور موڑ کاٹتی، بل کھاتی، شنگلہ ریسٹ ہاؤس جا پہنچی، جو انتہائی بلندی پر ہے۔ غالباً آٹھ ہزار کچھ فیٹ ہوگا ٹھیک سے یاد نہیں رکھ سکا۔ یہ پولیس والوں کا خوبصورت ریسٹ ہاؤس ہے اور یہاں تھانہ بھی ہے۔

یہاں ہمیں لینے کے لئے آدمی آیا ہوا تھا۔ اُن سے علیک سلیک ہوئی۔ جنگلات والوں کی چوکی بھی ہے اور بہت خوبصورت مسجد، جو جنگلات کے کسی فاریسٹ آفیسر نے چندہ جمع کر کے بنوائی تھی۔ نیز یہاں سے سوات کی ساری وادی سامنے بکھری پڑی تھی۔ مالم جبہ کی مشہور چوٹی بھی، جس پر اب مشہور سیرگاہ بنائی گئی ہے نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر نظاروں سے لُطف اندوز ہوتے اور چل پڑے کہ ہمیں رات منگورہ، جو سوات کا صدر مقام ہے، بسر کرنا تھی۔ راستے میں بدین سے گزر ہوا۔ یہاں سے دوسری سڑک کالام کو جاتی ہے جس کے آگے فلک سیر کی چوٹی ہے جو اٹھارہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے اور یہاں سے جو پانی اِس جانب ڈھلتا ہے دریائے سوات بنتا ہے۔ دوسری طرف کا پانی وادئ شندور کے نیچے لاس پور جا کر ملتا ہے اور یوں دریائے چترال بن کر آتا ہے۔ کابل سے ہو کر اٹک آ کر سندھ میں گرتا ہے۔

بدین ہی سے دوسری طرف بونیر ہے، جہاں بُدھوں کا مشہور قلعہ تھا جس کی شکست کے بعد بُدھوں نے یہ ملک ہی خالی کر دیا تھا اسی راستہ شندور سے گزر کر تبت کو سُدھارے جو اُن کا اصلی وطن تھا۔ سکندرِ اعظم نے مالاکنڈ سے ایک جرنیل کو روانہ کیا تھا، جسے شندور کی طرف سے آ کر کالام پہنچنا تھا اور اس طرف سے بونیر پہ حملہ آور ہونا تھا اور سیدھے راستے سے خود سکندرِ اعظم

کو۔ مگروہ ادھر آنے کی بجائے شندور سے گزر کر گلگت اور آگے ہُنزہ کی طرف چلا گیا اور کبھی واپس نہ آسکا۔ کہا جاتا ہے کہ ہنزہ کے نیلی آنکھوں والے لوگ یونانی نسل سے ہیں۔ سکندر نے خود ہی قلعے پر حملہ کر کے بدھوں کو شکست دی حالانکہ اُس کی فوج ہزاروں میں اور بدھ لاکھوں میں تھے۔ مگر یہ بھاگے اور آج تک واپس نہیں آئے۔ بس لوگ گندھارا کے نام سے مُلک کے اس عہدِ غلامی کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

ہمیں صُبح بدین، کالام اور فلک سیر کی طرف جا کر ان لوگوں کو بھی دیکھنا تھا کہ اس جانب بھی سہُولتیں مفقود ہیں۔ مگر یہاں بندوق کا راج ہے۔ لوگ شمالی علاقوں کی طرح نہیں، بندوق کی نالی سے بات کرنے کے عادی ہیں۔ ہم نے مغرب منگورہ پہنچ کر ادا کی۔ رات آرام کیا۔ امتیاز سے مل کر بہت مسرّت ہُوئی۔ بہت خوبی سے اپنے فرائض نباہ رہا ہے۔ وہاں پتہ چلا کہ کالام کی طرف راستہ بند ہے اور جو سڑک قسم کی شے تھی اس کی مرمّت ہو رہی ہے۔ یوں ہم اس طرف نہ جا سکے لہٰذا صبح واپسی کا پروگرام بنا۔ ناشتے کے بعد نکلے تو دریائے سوات کے اس موڑ پر جہاں سے راستہ لواری ٹاپ کو جاتا ہے۔ چرچل پوسٹ سینہ تانے ہمیں بتا رہی تھی کہ ۶ ستمبر کو یہاں سے شروع ہونے والا سرکل ۱۷ ستمبر کو بارہ دِنوں میں مکمل ہو چکا تھا۔ جس میں سے نو دن ہم دیس میں ہوتے ہوئے خود کو پردیس میں پاتے تھے۔ ہم نوشہرہ رُکے اور دوپہر کا کھانا پنڈی آکر کھایا اور رات بفضل اللہ ہم واپس گھر پہنچ چُکے تھے۔

اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ اللہ کریم توفیق دیں اور ہم سب مل کر اُن لوگوں کے لئے کچھ کر سکیں، مالی طور پر، رُوحانی طور پر اور جسمانی علاج کے طور پر جس

کا ایک طریقہ یہ ہے کہ غیر ممالک کی پبلک تنظیموں کو کہا جائے، یوں روپیہ تو بہت آجائے گا مگر غیرتِ اسلامی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ دین کے کام کے لئے بے دین سے سوال کروں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اُن کی حالتِ زار سے آگاہ کر کے اُن کی مدد کی دعوت دی جائے۔ یہ کام کرنے کے لئے ہی یہ چند حرُوف لکھے ہیں۔

اللہ کریم قادر ہیں کہ اس میں برکت دے دیں!

فقیر محمد اکرم عفی عنہ

دار العرفان، منارہ ضلع چکوال۔

یکم اکتوبر، ۸۹ء

شیروں کے کچھار میں

شمالی علاقہ جات سے پلٹا تو لاہور جانا پڑا۔ یوں ایک رات گوجرانوالہ بھی ٹھہرا۔ کامونکی میں سیرتِ طیبہ ﷺ کا جلسہ تھا جس کی حاضری کا وعدہ دے رکھا تھا۔ وہاں سے لوٹا تو ابتدائے اکتوبر میں لنگر مخدوم کا سالانہ اجتماع تھا، جو بحمد للہ ہر سال اپنی رونقوں کو دوبالا کرتا جا رہا ہے۔ پھر فیصل آباد جانا پڑا۔

غرض ۱۲، اکتوبر واپس پہنچا، ۱۳، کو جمعہ تھا اور ۱۴، اکتوبر ۸۹ء (۱۲، ربیع الاوّل ۱۴۰۹ھ) پروگرام کے مطابق وزیرستان کے دورہ کے لئے چل پڑا، جس میں ڈرائیور کے علاوہ ناظم اعلیٰ سلسلہ عالیہ، ڈاکٹر صاحب، ذاتی گارڈ اور بندہ خود۔ یہ ٹیم دارالعرفان سے روانہ ہو کر ڈیرہ اسمٰعیل خان پہنچی جہاں ایک رات کا قیام تھا۔ عصر کے بعد مسجد کلاں میں حضرت مولانا محمد شعیب صاحب کے پاس احباب سے ملاقات اور بعد از مغرب بیان ہوا جس میں مختصراً یہ عرض کیا کہ جشنِ میلاد النبی ﷺ دراصل ہماری بگڑی ہوئی مذہبی حالت کا ثمر ہے کہ شروع میں میلاد شریف تھا جس میں لوگ عبادت کرتے اور خیرات بانٹتے تھے پھر عید میلاد بنا اور ایک جلسہ کی صورت در آئی۔ رفتہ رفتہ عبادات

کی جگہ رسومات اور خیرات کی جگہ خرافات نے لے لی اور عید جس میں ایک گونہ دینی پہلو تھا جشن سے بدل گئی جشن ہر طرح کی قیود سے آزاد اظہارِ مسرت کا نام ہے چنانچہ کروڑوں روپے پانی کی طرح بہائے جانے لگے۔ واپڈا کی بجلی اور شہر کا امن تو زبردستی لے لئے گئے، ناچ گانا، رنگ برنگے لباس، پٹاخے ہر طرح کی سواریاں اور جو کسی کے جی میں آیا کرتا چلا گیا۔

حق یہ ہے کہ ربِّ جلیل نے عیدین کا تذکرہ اپنی کتاب میں فرما کر ان میں دوگانہ مقرر فرمایا اور ایک پاکیزہ تقریب اظہارِ تشکر کے لئے مقرر فرمائی۔ ایک رمضان کے پورا کرنے پر، دوسری حج اور قربانی کے موقع پر لیکن کیا جس ذاتِ کریم نے حج پر عید کا تذکرہ فرمایا، رمضان کے اختتام پر عید منانے کا حکم دیا، اس ذات نے اپنے حبیب ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے بارے بھی کچھ فرمایا یا نہیں؟ تو کتاب اللہ میں ارشاد ہے لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً۔ تحقیق اللہ نے رسول مبعوث فرما کر مومنین پر بڑا احسان فرمایا۔ جو انہی میں سے ہیں، انہیں اللہ کی آیات سناتے ہیں، ان کا تزکیہ کرتے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں یہی دونوں عیدیں تکمیل نعمت کے بعد ہیں مگر یہ ظہور کے وقت کا تذکرہ ہے اور عید اس کی ہو گی جو آپ ﷺ سے یہ انعامات حاصل کرے گا۔ آپ ﷺ کی ولادت، بعثت اور دنیا سے وصال کا مہینہ، دن اور تاریخ تقریباً ایک ہی ہے۔ کیا ہم رسومات چھوڑ کر بعثتِ عالی کے ذکر سے دل و زبان کو تر کریں گے کہ اس میں ولادت کا تذکرہ بھی آجاتے لڑکپن اور جوانی بھی، بعثت اور اس سے متعلقہ احکام و برکات بھی اور آخرت کی بات بھی۔ اللہ ہمیں توفیق دے۔ آمین۔

اس کے بعد محفل ذکر ہوئی اور عشا میاں حافظ جمال صاحب کی مسجد میں جا کر ادا کی۔ بعدِ عشاء وہاں درسِ قرآن دیا جس کا خلاصہ لکھ کر آپ کو تھکانا نہیں چاہتا۔ یوں رات وہاں بسر کی۔ تہجد کا ذکر قیام گاہ پر اور فجر ادا کر کے نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ دوست وزیرستان سے ساتھ چلنے کے لئے یہاں پہنچ گئے تھے، اُن کی گاڑی ساتھ تھی۔ یوں ہم نے ناشتہ ٹانک پہنچ کر مولانا غلام محمد صاحب کے ساتھ کیا۔ چونکہ وہاں رُکنے کا پروگرام تو تھا نہیں، لہٰذا جلد ہی روانہ ہو گئے۔ یوں تو ٹانک بھی وزیرستان کا دروازہ ہی کہہ لیں مگر اس سے کوئی پون گھنٹہ کی راہ چل کر خرگئی ایک سکاؤٹ پوسٹ آتی ہے جس سے پہلے میدان میں قلعہ اور سکاؤٹوں کا اس علاقہ کا مرکز بھی ہے۔ یاد رہے یہاں وزیرستان سکاؤٹس ایک نیم فوجی تنظیم ہے جو شمالی اور جنوبی وزیرستان میں انتظامی امُور اور قیامِ امن کی ذمہ دار بھی ہے۔ پوسٹ پر ٹریفک رُکی ہوئی تھی، پتہ چلا کہ کسی نے ایک سپاہی قتل کر دیا ہے اور اس کی گرفتاری کے لئے اُن کے جوان گئے ہیں۔ مزید فائرنگ کے خطرے کے پیشِ نظر راستہ بند ہے۔ خیر! ہمارے ساتھ جو وہاں کے مقامی لوگ تھے انھوں نے کہہ سُن کر اپنی دو گاڑیوں کے لئے تو اجازت حاصل کر لی اور یوں ہم آگے روانہ ہوئے۔ پہاڑی علاقہ، نالے اور راستہ کا زیر و بم شروع ہو چکا تھا۔ روایتی قبائلی مکان شروع ہو چکے تھے۔ ایسا ہر مکان قلعہ نما ہوتا ہے۔ باہر کی دیواریں تقریباً بیس فٹ بلند اور اندر ایک بُرج دفاع کے لئے ضرور ہوتا ہے۔

ہم سفر طے کرتے ہوتے جنڈولہ پہنچے جو انگریز کے زمانے میں مشہور ہیڈ کوارٹر اور مرکز ہوتا تھا۔ اب بھی پولیٹیکل ایجنٹ کا دفتر ہے۔ چھوٹا سا بازار

ہے ضروریاتِ زندگی دستیاب ہیں۔ ہوٹل اور دواخانے وغیرہ ہیں: ہر آدمی مسلح ہے اور یہاں سے آگے اسلحہ پر کوئی پابندی نہیں اپنے ملک کے اندر پہلی بار پتہ چلا کہ یہاں سے آگے کسی مقامی کی ضمانت پر جا سکتے ہو جو یہ گارنٹی دے کہ انھیں سلامت واپس لوٹا دیا جائے گا اور کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوگا، نہ یرغمال بناتے جائیں گے۔ اس لکھا پڑھی میں کافی دیر لگی اور یوں ہم کفیل دے کر جنڈولہ سے آگے روانہ ہوئے۔ جنڈولہ ہی کو بنیاد بنا کر جنوبی وزیرستان میں برطانوی فوج پیش قدمی کرتی رہی اور سڑکیں چھاؤنیاں نیز فوجی چوکیاں وغیرہ بنائی گئیں مگر آگے کا ہر موڑ پٹھانوں کے جذبۂ حُریت کا گواہ ہے جس کے پتھروں میں اُن کا خون رچ بس گیا ہے اور قدم قدم پر اس قدر سخت مقابلے کئے کہ انگریز کو ہندوستان چھوڑنے تک اس علاقے میں ایک رات چین نصیب نہیں ہو سکا۔ یہ جنڈولہ کیا ہے شیروں کے کچھار کا دروازہ ہی کہہ لیں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنھوں نے داڑھیاں رکھی ہوئی ہیں مگر جن کی نہیں وہ بھی نماز پنجگانہ ادا نہ کرنے کا کوئی تصوّر نہیں رکھتے۔

یہاں سے آگے واقعی شرعی پردہ ہے اور کوئی خاتون نظر نہ آئے گی اگر کوئی سفر کرتی ہوئی یا پانی وغیرہ لاتی ہوئی نظر پڑی تو سارے وجود کے ساتھ اس کا چہرہ بھی پوری طرح ڈھانپا ہوا ہوگا۔

سڑک پہاڑی نالوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے جنھیں دریا کہا تو جاتا ہے مگر پانی بہت کم ہے ہاں! بارش کا سیلابی پانی ضرور گزرتا ہے۔ مشہور دریا، دریائے شہور ہے جس پر شہور تنگی ایک بہت تنگ گزرگاہ ہے۔ جہاں ۱۹۳۶/۳۷ء میں دو بریگیڈ فوج کو محسودوں نے گھیر کر بے بس کر دیا تھا اور

ایسے زبردست مورچے بناتے تھے جن پر ہوائی جہاز بھی بم نہیں گرا سکتے تھے نہ ان کا فائر کارگر تھا کیونکہ دونوں طرف پہاڑ تھا اور بتدریج بلند ہوتا گیا، لہٰذا مورچے ایسے تھے کہ ان میں سے نیچے نظر بھی آتا تھا اور فائر کرنا بھی آسان تھا مگر اوپر سے ان کا کچھ بگاڑنا آسان کام نہ تھا۔ لہٰذا دو بریگیڈ انگریزی فوج، جس کے ساتھ ٹینک بکتر بند گاڑیاں، توپیں وغیرہ سب کچھ تھا پھنس کر رہ گئی، یہ وزیرستان کی مشہور جنگوں میں سے ایک ہے جس میں فوج کا کافی نقصان ہوا حتیٰ کہ سکاوٹ ٹروپس جمع ہو کر پیچھے سے حملہ آور ہوتے جنہوں نے مجاہدین کو ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ یوں کئی روز بعد فوج کی جان چھوٹی اور پھر انگریز بہادر نے محسودوں کے کئی گاؤں بمباری کر کے تباہ کر دیئے۔ پہلے جہاز بم گراتے پھر توپخانہ گولہ باری کرتا اور پھر پیدل فوج جا کر بچے ہوتے مکانوں کو ڈائنامائیٹ کر دیتی فصلیں اور پھلدار درخت کاٹ دیئے جاتے۔ جنگل اور گھاس جلا دیئے جاتے اور یوں یہ مہذّب قوم وحشت و بربریّت کی وہ داستانیں لکھتی رہی جس پر آج بھی ساری انسانیت کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ یہ انسانی حقوق کے ٹھیکیدار ایسے ظالم تھے، ایسے ظالم ہیں کہ تاریخِ انسانی میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ فرعون ایک تھا مگر اس قوم کا ہر ذی اقتدار فرعون ثابت ہوتا رہا۔ اور اب بھی ان کا کردار یہی ہے۔

جنرل اکرم صاحب کی کتاب میں ہے کہ جب جرمن جہاز لندن پر اندھا دُھند بمباری کرتے تھے تو شاید انگریزوں کو اندازہ ہوا ہو گا کہ وزیرستان میں انکی بمباری سے غریب کسانوں پر کیا گزرتی تھی؟

ہم مشہور تنگی سے گزر رہے تھے اور یہ واقعات حافظے پہ فلم کی طرح

مختلف تصاویر بناتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ سروا کئی پہنچے جہاں سکاؤٹس کا قلعہ اور وائرلیس وغیرہ ہے مگر ہم وہاں سے اندر پہاڑی علاقہ میں داخل ہو گئے، جہاں چند میل پکی سڑک ہمارے ساتھ گئی اور پھر ختم ہو گئی۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اسے پختہ کرنے کا منصوبہ شروع کروایا تھا جو موجودہ عوامی حکومت نے روک دیا ہے۔ یہ شاہراہ سے ہٹ کر دیہات کے اندر سے ایک راستہ ہے جس کے گرد پہاڑوں کی بلندی سات ہزار سے آٹھ ہزار فٹ تک ہے ایک جگہ سڑک پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیتی ہے وہاں ہمارے استقبال کو آنے والی گاڑیاں مل گئیں۔ جن کے ہر سوار کی کلاشنکوف پوری طرح لوڈ تھی اور پھر انھوں نے خوشی میں میگزینیں خالی کر دیں۔ فائر کی آواز سے وادیاں گونج اٹھیں۔ یہ اُن کا خوش آمدید کہنے کا طریقہ تھا۔ پھر سب لوگ ہمارے ساتھ چلے۔ پہاڑ سے گزر کر دوسری طرف وادی میں "اوس پاس" گاؤں سے باہر مدرسہ تھا اس کے مہتمم مولانا سعید نور صاحب بہت نیک متواضع اور قد و قامت والے خوبصورت جوان ہیں یہ اعلیحضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بیعت تھے اور آپ کے ارشاد کے مطابق یہاں مدرسہ شروع کیا تھا۔ جب ہم مدرسہ کے باہر پہنچے تو بہت سے لوگ صف بنا کر کھڑے تھے جن سے ملاقات کی اور پھر آنے والا مسلسل فائرنگ کر رہا تھا جو بہت دیر تک ہوتی رہی۔

اس کے بعد مدرسہ میں ایک بچے کی دستار بندی کی تقریب تھی۔ دُور نزدیک سے کافی لوگ جمع ہو گئے تھے جن میں سے سب اُردو بول تو نہ سکتے تھے مگر سمجھ ضرور سکتے تھے لہٰذا اُردو میں بیان کیا۔ ماحصل دینی تعلیم کی اہمیت و ضرورت کے ساتھ اس کا مصرف بیان کرنا مقصود تھا۔ دین سیکھنے

سے مراد یہ ہے کہ امورِ دنیا کو دینی احکام کے مطابق انجام دیا جائے ۔ مگر ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ جو طبقہ دینی علم حاصل کرتا ہے وہ عملی زندگی میں حصہ نہیں لیتا نہ کسی سرکاری شعبے میں کوئی ایسا آدمی نظر آتا ہے نہ پرائیوٹ سیکٹر میں یہی وجہ ہے کہ ملک مسلمانوں کا ہے مگر طرزِ حکومت کبھی اسلامی نہ ہو سکا ۔

اس کے بعد کھانا وہیں کھایا جو پٹھانوں کا روایتی کھانا تھا کئی طرح کا گوشت اور چاول خوان کی زینت تھے مگر اپنا نصیب تو بغیر شکر کی چاء اور بغیر روغن کے روٹی ہے بہر حال اللہ کریم کا شکر ہے کہ اپنا نام لینے کی توفیق ارزاں رکھے ۔ مسلسل فائرنگ کی آواز سے کسی قدر تھک کر میں نے کہہ دیا کہ بھئی اگر فائر نشانے پر ہو تو کوئی بات بھی ہے ۔ آپ صرف دھماکے کر رہے ہیں ۔ بس پھر کیا تھا میں اپنی بات میں پھنس گیا دراصل ایسی بات کرنا ان کی روایتی نشانہ بازی کے لئے ایک طرح کا چیلنج تھا ۔ روایات سے بے خبری بھی بسا اوقات بہت غضب ڈھاتی ہے ۔ چنانچہ سب جمع ہو گئے اور بڑے احترام سے کہا کہ نشانہ تو اب آپ کو مارنا ہو گا ۔ ساتھ ہی ایک بچے کو چھوٹا سا شیشہ دے کر پہاڑی کی طرف دوڑایا جس نے اندازاً تین سو گز پر شیشہ سورج کے رُخ پر رکھا کہ چمکتا ہوا نظر آئے بمشکل ۲ × ۱ انچ ہو گا ۔ ایک جرمن کلاشنکوف بندہ کو تھما دی ۔ میں نے ایک دو فائر کئے جو قریب لگے مگر رائفل دُرست نہ تھی ۔ دوسری تبدیل کی ۔ اس کا سنگل فائر بھی اس قدر صحیح نہ تھا کہ ایک آدھ انچ کی چیز کو فاصلے پہ لگتا چنانچہ ایک چینی رائفل دی گئی ۔ دریں اثناء ایک پٹھان نشانہ باز لپکا ۔ اُس نے تین فائر کئے مگر اسی انداز میں قریب قریب لگے ۔ آخر بندہ نے چینی رائفل سے شیشہ اڑا دیا تو بہت خوش ہوئے ۔ اگرچہ ساتویں یا آٹھویں گولی لگی تھی مگر

تھیں سب ہی گل ۔ دراصل ٹارگٹ بہت چھوٹا تھا اور بندہ کا یہ پہلا تجربہ بھی ، نشانہ بازی کا نہیں اتنے چھوٹے ٹارگٹ پر اتنی بڑی رائفل کے فائر کا ، ورنہ نشانہ بازی تو ہوتی ہی رہتی ہے ۔

نمازِ ظہر کے لئے گاؤں میں جانا پڑا ۔ اہلِ دیہہ کا اصرار تھا کہ نماز گاؤں کی مسجد میں ادا کریں ، لہٰذا گاؤں میں ظہر ادا کی ۔ چائے پی اور وانہ کے لئے تیار ہوتے ۔ ایک راستہ تو یہ تھا جس پر ہم آتے تھے پھر سروا کئی جا کر مین روڈ سے جاتے ، دوسرا کچا ، مشکل اور خطرناک راستہ تھا جو اسی گاؤں سے آگے خیسورہ کی وادی میں داخل ہو جاتا تھا ۔ دونوں طرف کے پہاڑ آٹھ ہزار فٹ سے کچھ زائد بلند ہیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پانچ پانچ ، چھ چھ گھروں کی آبادی میلوں میں پھیلی ہوئی تھی ۔ یہی خیسورہ کہلاتی تھی ۔ راستہ نالے کے ساتھ ساتھ جاتا تھا جو بارشوں کے پانی سے کافی حد تک خراب ہو چکا تھا ۔

بہرحال ہم نے یہی راستہ اختیار کیا اور اس مشہور وادی کو دیکھتے ہوئے گزرے جہاں انگریز کے جہاز تو بم گرا جاتے تھے مگر اس کے سپاہی اس زمین کو چھو نہ سکے کہ نالہ تنگ ، راستہ دشوار اور دونوں طرف سے فائر کی زد میں تھا گھنٹہ بھر چلنے کے بعد یہ وادی ختم ہو کر آگے کھلی وادی اور اس میں بہت بڑے بڑے گاؤں آ گئے جہاں طیارندہ کا قلعہ اور پوسٹ تھی ۔ یہاں سے وانا سے میرن شاہ جانے والی سڑک مل گئی اور ہم وانا کو مڑ گئے جو زیادہ دور نہ تھا سڑک پہاڑ کے اوپر جا کر دوسری طرف اُتری تو سامنے دریا کے پُل جیسے خرچ پُل کہتے ہیں سے اُس پار پہلے والی سڑک سے مل گئی اور یوں ہم وانا کی مشہور اور پرانی چھاؤنی میں پہنچ گئے جہاں انگریزی عہد میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر ہوا کرتا تھا ۔

یہ جگہ بہت کھلی، کافی بلندی پر اور بہت پُر فضا ہے۔ انگریز کی چھاؤنی کی ضرورت
یہ بھی تھی کہ پہاڑوں سے اِس قدر دور ہو کہ رائفل کا فائر کارگر نہ ہو۔ اِس کے
باوجود چھاؤنی کے گرداگرد پکٹیں تھیں جن میں مورچہ بند فوجی رات دن پہرہ دیتے
ایک مشہور پکٹ کا نام جبرال پکٹ ہے۔ اس پہاڑی کی شکل جبرالٹر کی طرح ہے
اور نالے کے کنارے پر ہے لہٰذا اِسے یہ نام دیا گیا۔

مشرق کی بلند پہاڑی پر شیشہ پکٹ ہے۔ اس کا یہ نام اِس وجہ سے
ہے کہ شیشے کی مدد سے یہاں سے دور دور تک پیغام رسانی ہوتی تھی۔ اب
زمانہ وائرلیس کا ہے مگر پہلے رات کو لائٹ سے اور دن کو شیشے کی چمک
سے الفاظ منتقل کیے جاتے تھے۔ ان سب انتظامات کے باوجود پٹھانوں کی
یلغار نے بارہا وانا چھاؤنی کو تباہ کیا۔ کبھی ملا پونڈہ رحمۃ اللہ علیہ نے، کبھی فقیر ایپی
رحمۃ اللہ علیہ نے اور کبھی قبائلی سرداروں نے۔ ان کا طریقہ شب خون مارنے کا تھا
یہ جیالے منٹوں میں اپنا کام کر کے غائب ہو جاتے۔ رائفلیں اور گولہ بارود لوٹ
کر لے جاتے۔ انگریز اور ہندو کو خصوصاً قتل کرتے بلکہ وزیرستان میں بہت عرصہ
تک شادی کی شرائط میں یہ بات بھی شامل تھی کہ دولہا انگریز یا ہندو کا سر
تو نکاح کر کے دیا جاتے گا۔ یہ مردانگی کا امتحان ہوا کرتا تھا۔

وزیرستان میں چار بڑے قبیلے آباد ہیں محسود، وزیر، بھٹنی اور دوڑ۔ آخرالذکر
کابل کی سرحد سے لے کر میرن شاہ اور میر علی، کھجوری پوسٹ تک آباد ہیں۔ یہ
کاروباری بھی ہیں اور محنتی کسان بھی۔ بھٹنی بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کی سرحد
کے ساتھ ساتھ اور وزیر ٹوچی سے رزمک تک، جو عموماً خانہ بدوش رہتے ہیں
گرمیوں میں پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں اور سردیوں میں اپنے گلے نیچے لے

آتے ہیں۔ آگے وانا تک تقریباً سب محسود ہیں۔ پھر ڈیرہ اور جنڈولہ کی طرف
وادی خیسورہ وغیرہ میں سب وزیر آباد ہیں۔ دریا ٹوچی سے لے کر رزمک تک
وادیاں کشادہ ہیں۔ لہٰذا وزیروں پر انگریزی فوجیں بہت جلدی چڑھ دوڑتی تھیں۔
محسودوں کے علاقہ میں وادیاں اور نالے تنگ اور راستے دشوار گزار ہیں، مگر
مقابلہ ہر طرف مثالی ہوتا تھا۔

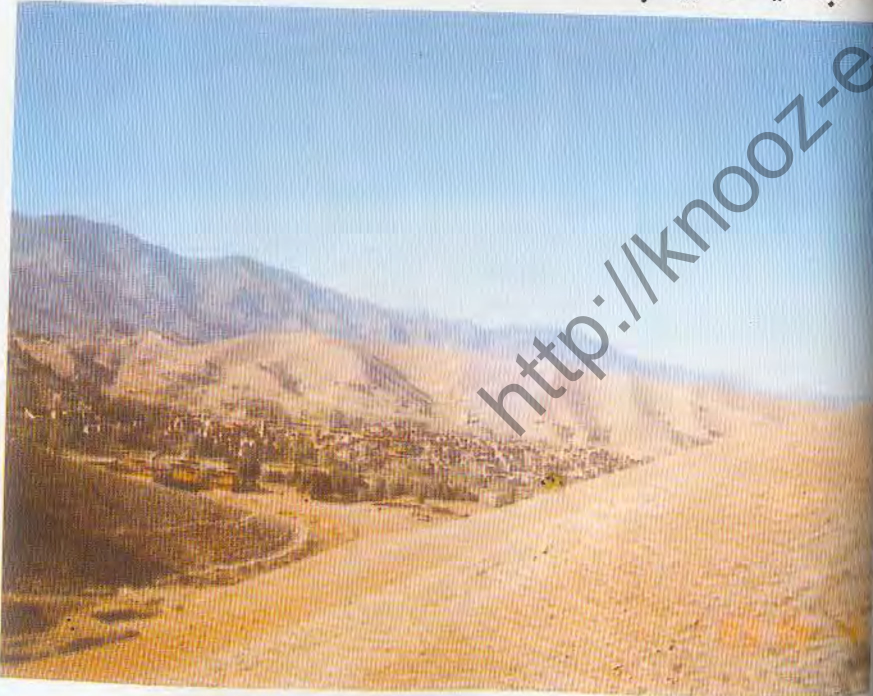
یوں تو یہ شیروں کے کچھار ہیں اور ہر جھاڑی کسی شیر کا مسکن ہے مگر بعض
لوگ اس قدر سربرآوردہ مجاہد تھے کہ نہ تاریخ انہیں فراموش کر سکتی ہے اور نہ دشمن
ان کی جرأت و بہادری کے اعتراف کے بغیر رہ سکتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک
ہستی کا نام فقیر ایپی تھا۔ جن کا نام حاجی مرزا علی خاں طوری خیل وزیر قادری اور
لقب امیر المجاہدین یا مجاہد کبیر تھا۔ یہ ایپی گاؤں کے رہنے والے تھے، اور
فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے آپ سید حسن نقیب چار باغ جلال آباد سے بیعت
تھے اور قادری سلسلہ میں خرقہ خلافت پایا تھا۔

بندہ ناچیز نے ان کے حالات پڑھ کر توجہ کی تو ان کا قلب بہت منور
پایا بلکہ لطیفہ قلب کی کیفیات کے دوران ہی زیارت ہوئی بہت زیادہ مجاہدہ
کرنے والے اور عجیب بات ہے کہ صرف قلب کی روشنی پر بہت تیز مکاشفات
رکھنے والے تھے۔ ان چیزوں کا انحصار عطائے باری کے ساتھ ساتھ بڑی حد
تک مجاہدہ پر ہوتا ہے۔

ان سے پہلے بہت سے سرفروشوں نے انگریز کا مقابلہ جاری رکھا،
جس میں ملا پوندا نے ایک عجیب تحریک چلائی کہ پٹھان سپاہیوں اور اردلیوں
کو انگریز افسر قتل کرنے کی ترغیب دی جس کے نتیجے میں بہت سے انگریز قتل



جنوبی وزیرستان کا چیک پوسٹ



برکی شہر۔ سن برکی یہاں سے ہیں

بھی ہوئے اور باقیماندہ کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی۔ اس کے ساتھ چھاؤنیوں پر شب خون، کانوائی پر حملہ اور مقابلہ جاری رکھا اور ۱۹۱۳ء میں آپ کی وفات پر انگریز بہت خوش ہوئے۔ مگر یہ خوشی بھی دیرپا ثابت نہ ہوئی البتہ مقابلوں میں کوئی مرکزی قوت نہ رہی اور انگریز ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء تک کے عرصے میں جنڈولہ سے وانا اور میرن شاہ سے رزمک، وانا تک سڑک بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کی وجہ سے وانا، رزمک، ڈوسلی چھاؤنیاں بنادی گئیں۔ میر علی اور جنڈولہ پہلے فوجی ہیڈکوارٹر تھے۔ یوں یہ سڑک پورے وزیرستان کے جگر سے گزر گئی۔ مگر ہر میل اور ہر موڑ پر خون دینا پڑا۔

ہفتہ میں دو روز کے لئے سڑک کھلا کرتی تھی اس میں پہلے فوج گرد کی پہاڑیوں پہ قبضہ جماتی پھر درمیان میں کانوائی چلتی۔ اس کے باوجود کسی کانوائے کا بچ کر نکل جانا ایک معجزہ سے کم نہ تھا کہ ۱۹۳۵ء میں لاہور مسجد شہید گنج کا واقعہ پیش آگیا۔ اُدھر بنوں میں ایک ہندو لڑکی نے اسلام قبول کر کے ایک پٹھان نوجوان سے شادی کر لی۔ ہندوؤں نے مقدمہ کیا تو انگریز نے لڑکی ہندوؤں کو لوٹا دی۔ ان دو واقعات نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وزیرستان کے مختلف ملک اور قبائلی سردار جمع ہو کر فقیر ایپی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتے کہ اب مرکزی شخصیت صرف آپ ہی کی ہے لہٰذا آپ نے اللہ کا نام لے کر جہاد شروع کیا اور ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک انگریز کے خلاف پورے وزیرستان میں نبرد آزما رہے۔ آپ کے معرکوں نے امام شامل اور مہدی سوڈانی کی یاد تازہ کردی۔ انگریز نے اپنا پورا زور بازو آزما کر دیکھا۔ مگر یہ مردِ خدا نہ جھکا، نہ ان کے ہاتھ آیا بلکہ ایک کتاب کا نام ہے،

"فقیر آیپی ایک چھلاوہ تھے"

انھوں نے رات دن اللہ کی راہ میں ایک کر دیا۔ بڑے بڑے انگریز سورما دو دو بریگیڈ فوج سے کر حملہ آور ہوتے اور انھیں گرفتار کرنے کی بجائے منہ کی کھا کر ذلت و خواری سے واپس آتے۔ انگریزوں کی روایتی چالیں، رُوپے کا لالچ، عہدے کی ترغیب اور سارے حربے اللہ کے اس بندے نے پاؤں کے نیچے روند دیتے اور یوں برصغیر سے انگریز کے جانے تک برسرِ پیکار رہا۔ سارا وزیرستان آپ کی جولان گاہ تھا۔ کاش! کوئی باقاعدہ نظام تشکیل پاتا تو ایک اسلامی ریاست بن جاتی مگر صرف جہاد اور وہ بھی بندوق تک محدُود رہا۔ آخری دو سالوں میں فقیر صاحب نے توپیں بنوائیں مگر وہ زیادہ مؤثر نہ تھیں۔ کاش! باقاعدہ فوج اور اس کے عہدے، علاقہ، قانون سب بنایا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

آپؒ نے پاکستان کی تقسیم پر بھی کہا تھا کہ ہم اپنا جہاد بند کرتے ہیں کہ پاکستان سے جہاد شرعاً درُست نہیں۔ مگر موجودہ پاکستان بھی انگریز کی سازش ہے۔ ایک حصّہ مسلمان یہاں، ایک حصّہ ہندوستان میں اور ایک حصّہ بنگال میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں سارا کشمیر اور دہلی تک کا علاقہ مسلمانوں کا حق تھا اور ساتھ بنگال بھی۔ بہرحال آپ ۱۹۶۰ء میں واصل بحق ہوتے۔ آپ کا مزار "گوروبخت" میں دشوار گزار پہاڑوں کے درمیان کابل کی سرحد پر ہے۔ جہاں آپ کا بھتیجا فی الحال جانشین ہے جسے امیر المجاہدین کا لقب دیا گیا امیر صاحب کہلواتا ہے۔

وانا چھاؤنی میں بھی خوبصورت اور وسیع مسجد ہے اور باہر آبادی میں بھی ایک بہت شاندار مسجد اور مدرسہ ہے جس کے مہتمم مولانا نور محمد صاحب بہت

معروف شخصیت ہیں۔ آپ کے مدرسہ میں درس نظامی کے ساتھ ایف۔اے تک نصابی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور یہ وقت کی بہت اہم ضرورت ہے۔ اللہ کریم ایسے لوگوں کو مزید ہمت دے جو قوم کی رہنمائی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ بندہ مسجد اور مدرسہ میں حاضر ہوا جسے میں اپنی خوش نصیبی شمار کرتا ہوں۔

وانا سے آگے کابل کی سرحد تقریباً تیس میل ہو گی سامنے پہاڑ کے دامن میں شکئی گاؤں نظر آتا ہے پہاڑ خاصے بلند ہیں اور ان علاقوں میں حکومت کا کوئی اثر نہیں وہ اپنے فیصلے خود کرتے ہیں اور بہت اچھا فیصلہ کرتے ہیں، فوری اور مفت انصاف مل جاتا ہے۔ اس گاؤں کے بہت سے لوگ سلسلہ عالیہ میں بیعت ہوئے۔ ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے جنھوں نے ایک تازہ واقعہ سنایا کہ ان کے بھائی سے ایک آدمی قتل ہو گیا۔ ان کے بھائی کے مطابق گولی اتفاقاً لگ گئی تھی اور پہلے دشمنی بھی نہ تھی۔ مگر ورثاء نے یہ عذر قبول کرنے میں پس و پیش کیا تو وہ گاؤں چھوڑ کر کئی میل دور وانا آیا اور جنوب میں مستی خیل قبیلہ کے گھروں میں جا کر دنبہ ذبح کیا۔ اُن کے بزرگ جمع ہو گئے۔ پوچھا، کیا بات ہے اس نے واقعہ بتایا اور کہا کہ اب خطرہ ہے کہ وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔

انھوں نے اسے اپنا اطالس بنا لیا۔ اس کا معنٰی ہے اٹھارہ، جس کسی پہلے آدمی نے پناہ چاہی تھی تو وہ خاندان کے ممبر سترہ تھے انھوں نے اسے اٹھارواں قبول کیا تھا اب اس کا نام ہی اطالس ہے۔ ان لوگوں نے جا کر بتایا کہ وہ آدمی بے قصور بھی ہے اور ہماری پناہ میں بھی، لہٰذا اسے کوئی نہ چھیڑے۔ چند ماہ بعد جنگل میں اسے گولی ماردی گئی تو وہ اس کے گاؤں گئے جس نے گولی ماری تھی، اسے ملے، کہا، تم نے اچھا نہیں کیا مگر اب پناہ دھیان

رکھنا ہم تمھیں قتل کریں گے، تم ہمارے مجرم ہو، اور ٹھیک تیسرے روز اُس آدمی کو قتل کر دیا۔ اب وہ جھگڑا ان دو قوموں کے درمیاں بن گیا جس کو سلجھانے کے لیے پولیٹیکل ایجنٹ صاحب کوشش کر رہے ہیں۔ بہر حال یہ انکی روایات ہیں جن کی پابندی بہر طور کی جاتی ہے۔

ہم دوسرے روز یعنی ۱۶ اکتوبر کو وانا سے لدھا کے لئے روانہ ہوئے طیارزہ تک تو پہلی ہی سڑک تھی وہاں سے کچھ راستے پر مڑنے کی بجائے سیدھے چلتے رہے تو سڑک پہاڑی علاقہ میں داخل ہو گئی جس میں خوبصورت جنگل بھی تھا، اور چلغوزہ کے درخت بھی نظر آئے جنگلی زیتون کی بہتات تھی۔ پتہ چلا کہ جنگلات کی حفاظت کا اہتمام ان کا اپنا ہے ایک آدمی مقرر ہوتا ہے جو سرخ ٹوپی پہنتا ہے اور جرنیل کہلاتا ہے اسے سب قبائل مل کر مقرر کرتے ہیں۔ معمولی نقصان پر بھی رپورٹ کر دے تو بھاری جرمانہ کیا جاتا ہے۔ گزارے کے لئے ہر سال مختلف علاقوں میں کٹائی کی اجازت دی جاتی ہے اس طرح لوگوں کا گذارہ بھی ہو جاتا ہے اور جنگلات بھی ساتھ ساتھ تیار ہوتے رہتے ہیں۔

ان جنگلات میں سڑک کافی خطرناک اور ڈاکوؤں، لٹیروں کی زد پہ رہتی ہے جو عموماً مفرور ہوتے ہیں مگر موجودہ پولیٹیکل ایجنٹ نے اچھا اہتمام کیا ہے اور بہت سے مفرور پیش ہو گئے ہیں خطرہ نسبتاً کم ہے۔

انہی پہاڑوں میں گھرے ہوئے علاقے کو سلوبختی کہتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی واقعہ پیش آجاتا تو اس علاقہ کے لوگ لشکروں کی صورت میں مقابلے کو نکلتے تھے اور ہر لشکر کم از کم چالیس جوانوں پہ مشتمل ہوتا تھا، جسے پشتو میں سلوبخت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا پورے علاقے کا یہی نام ہے۔ نالوں کے

درمیان ایک خوبصورت گاؤں کا نام بدر ہے۔ پتہ نہیں، کس عاشقِ رسُول ﷺ نے یادیں تازہ کرنے کو چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں بدر کا گاؤں بسایا ہوگا۔ چوٹی پر لیفٹیننٹ جنرل عالم جان محسُود کا گھر ہے جو ان دنوں لاہور میں کور کمانڈر ہیں۔ اس علاقہ سے اکثر لوگ پڑھے لکھے اور اچھے عہدوں پر ہیں، مگر علاقہ کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہر افسر کسی نہ کسی شہر میں بس جاتا ہے اور علاقہ میں وہ بھی ایک سیاح کی مانند ہی کبھی کبھار جاتا ہے۔

اس سے آگے مشہور اور قدیم شہر کانی گرُم ہے۔ پہاڑی نالے کے کنارے اور پہاڑ کے اوپر تک یہ قدیم قصبہ سلطان محمد غوری نے اپنے کسی سردار کو بطور جاگیر بخشا تھا۔ تب یہاں گاؤں نہیں، جنگل تھا۔ یہ گاؤں اُسی سردار کی اولاد ہے جو اُرمڑ قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود کانی گرُم میں ابھی تک اُرمڑی زبان بولی جاتی ہے۔ اگرچہ باہر دوسرے پٹھانوں سے بات چیت پشتو میں کرتے ہیں مگر گھر کے اندر وہی زبان ہے جو پشتو سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ایک زمانے میں کئی برس قحط پڑا تو لوگ مختلف علاقوں کو چلے گئے۔ ہندوستان میں برکی اور مرزا کہلاتے۔ مرزا کے معنی اُرمڑی زبان میں بھائی کے ہیں۔ افغانستان میں لوگر کے علاقہ میں بھی آباد ہوتے۔ وہ ابھی تک اُرمڑ ہی کہلاتے ہیں۔ اس گاؤں میں بندوق اور چھری بطور خاص تیار ہوتی ہے۔ یہاں ایک بزرگ گزرے ہیں جنہیں پیر روشان کہتے ہیں۔ یہ لفظ دراصل روشن ہے پشتو کی کھینچ تان سے روشان بن گیا۔ ایک بار تو سارا وزیرستان ہی نہیں بلکہ کہتے ہیں سارا سرحد ان کے پیچھے چل پڑا تھا۔ کسی کامل ہستی کے مرید تھے ان کی ایک کتاب جرمن کتب خانہ سے دستیاب ہو کر چھپی ہے "خیر البیان"

عربی، فارسی اور پشتو میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پشتو کا سب سے پہلا نسخہ ہے اس میں بہت اعلیٰ خیالات بلند ذوق اور علمی نمونے دستیاب ہیں۔ اس میں بھی دریائے رحمت تک کا تذکرہ ہے جس کی بات وہی صاحبِ حال کر سکتا ہے جس کی رسائی سالک المجذوبی سے بہت اوپر ہو اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ جو بھی ان کے ساتھ چند روز رہتا اس کا قلب روشن اور منوّر ہو جاتا جس پر ان کا نام ہی پیر روشن پڑ گیا مگر آخر میں دھوکا کھا گئے اور ابلیس کے فریب سے نہ بچ سکے اور اباحتی ہو گئے۔ اباحتی سے مراد صوفیوں کا وہ فرقہ ہے جن کے خیال کے مطابق ایک خاص مقام طے کرنے کے بعد صوفی کو نہ عبادت کی ضرورت رہتی ہے نہ گناہ سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ اس مصیبت میں مبتلا ہو کر سب مقامات سلب ہو گئے حتیٰ کہ ایمان بھی گیا اور نور کی جگہ ظلمت نے لے لی۔ مگر لوگوں کی اندھی عقیدت کسی نہ کسی صورت باقی ہے۔

اس شخص کا زمانہ اکبر اعظم کا زمانہ ہے اور اس شخص نے بھی اکبر کے دینِ الٰہی کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کیا تھا جس پر بہت لوگوں نے اسکی پیروی اختیار کی مگر آخر کار نفس کے ہاتھوں تباہ ہوگیا۔ ؎

دریں ورطہ کشتی فرو شُد ہزار
کہ پیدا نہ شُد تختہ بر کنار

جب مذہبِ اباحتی اختیار کیا تو پیر بابا اخوند درویزہ سوات والوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور فتویٰ دیا جس کے باعث بہت سے لوگ گمراہ ہونے سے بچ گئے۔ انھوں نے اس کا نام "پیر تاریکی" رکھا۔

اس علاقہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر گاؤں کے باہر گاؤں کی

سرائے ہے جہاں مسافر بغیر کسی معاوضے کے قیام کرتے ہیں اور ان کا مال یا سواری محفوظ رہتی ہے یہ گاؤں کا ذمہ ہے۔ لہٰذا سرائے میں ٹھہرنے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ ان پہاڑوں سے ذرا کھلی جگہ نکلیں تو سامنے لدھا نظر آتا ہے۔ انٹر کالج ہے، ہائی سکول ہے اور سکاؤٹس کا قلعہ ہے جہاں برطانوی فوج رہا کرتی تھی۔ ہمارا قیام اس سے تین میل ادھر ششتین گاؤں میں سید لعل بادشاہ صاحب کے گھر میں تھا۔

دو گہرے نالوں کے درمیان بلند ابھار پر گاؤں کی آبادی ہے۔ عصر وہاں پہنچ کر ادا کی، اہلِ دیہہ سے ملاقات، بیان اور مغرب کا ذکر مسجد میں جا کر کیا۔ رات بسر ہوئی۔ عجیب لوگ ہیں کوئی بوڑھا ہے یا بیمار، گھر سے نکلے گا تو لاٹھی کی بجائے بندوق اٹھا کر۔ جوان جدید اسلحہ سے لیس، ادھیڑ عمر لوگوں کے پاس پرانی تھری ناٹ تھری اور بوڑھوں کے پاس اپنی ہم عمر کلچ والی سنگل شاٹ رائفل۔ مگر کسی کو خالی ہاتھ نہ پایا۔

صبح ۱۷ تاریخ تھی۔ وہاں سے روانہ ہو کر لدھا سے گزرے آگے لنگر خیل آباد ہیں جن کی لوٹ مار میں بہت شہرت ہے اور ہر گروہ کا سردار عموماً لنگر خیل ہوتا ہے۔ گاؤں کے باہر سے سڑک کے موڑ پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا نظر آیا غالباً ایک صدی کے لگ بھگ عمر ہو گی مگر بندوق گھٹنوں پہ رکھ کر بیٹھا تھا، رزمک سے ذرا پہلے ساؤتھ وزیرستان ختم ہو جاتا ہے۔ غالباً آخری اڈہ مکین ہے جہاں بسوں کا اڈہ ورکشاپیں سپیئر پارٹس کی دکانیں چند دوسری دکانیں اور چند ایک ہوٹل بھی ہیں۔ ایک ہوٹل پر "وزیر آباد ہوٹل" کا بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ آگے وادی بہت کھل جاتی ہے۔ بلندی بھی سات ہزار فٹ کے لگ بھگ ہو جاتی

ہے۔ لہٰذا موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ یہاں رزمک کی مشہور چھاؤنی ہے۔ اب یہاں کیڈٹ کالج ہے اور چھاؤنی کا علاقہ سکاؤٹس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اب کسی حد تک سویلین آبادی بھی ہے۔ انگریزی عہد میں صرف انگریز افسر رہتے تھے اس کا نام چھوٹا ولایت بھی تھا۔

تھوڑی دور جا کر وادی پھر تنگ ہو کر سڑک کو پہاڑ کے اوپر دھکیل دیتی ہے۔ ہر طرف پٹھانوں کے روایتی قلعہ نما گھر بکھرے پڑے ہیں۔ چھوٹی بڑی آبادیاں ہیں۔ رزمک سے آگے پہاڑ اور بھی زیادہ خطرناک شمار ہوتے ہیں۔

ہمارے ساتھ مقامی احباب کی ایک مسلح موٹر بھی تھی۔ پھر بھی انہیں فکر تھی کہ خدانخواستہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آجائے۔ اللہ کریم ایسے قادر ہیں کہ اسی دن رزمک گورنر سرحد کا دورہ تھا۔ لہٰذا رزمک سے لے کر بنوں میرن شاہ روڈ تک سارے راستے پر سکاؤٹس پہرہ دے رہے تھے۔ ہم بھی بے فکر ہو کر سفر کرتے رہے۔ آرڈر کاریں اور مسلح سنتری ہر موڑ پر کھڑے تھے۔ ہم نے اسے اللہ کی عطا سمجھا اور اس کا شکر ادا کرتے ہوئے آرام سے گزر گئے۔

پہاڑ کی بلندی پر ایلگزینڈر فورٹ ہے۔ نہ جانے یہ سکندرِ اعظم کی یاد میں ہے یا اس کی کوئی اور وجہ ہے۔ بہرحال یہ اس کا راستہ بھی ہے۔ مغل فاتحین بھی اس راہ سے گزرے۔ محمود غزنویؒ کے گھوڑوں نے بھی بارہا ان وادیوں کو عبور کیا اور سب سے بڑی بات کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ۲۹ ہجری میں وزیرستان کی زمین کو اپنے قدموں سے روشن فرمایا اور جناب عبدالحلیم اثر افغانی کی پشتو کتاب "سرحدی قبائل میں اسلام کی روشنی" کے مطابق شمالی وزیرستان کی وادی شیرہ تلہ میں حضرت مجاشع برادر، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

کا فوجی کیمپ تھا۔ وادیٔ بویہ (بالائی دوڑ) میں کفار کے جو آثار پہاڑوں پر ملے ہیں۔ ان کے خلاف جہاد میں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کی شراکت کا پتہ ملتا ہے۔ رزمک میں جو کتبہ ملا ہے اس کے مطابق ۱۵۴ھ ہجری تک سلیمان الوزیر برکی کی حکومت تھی۔ یہی طوفانِ نور تھا جو سرزمین سرحد کو منور کر گیا اور قبائلی علاقوں میں ہر طرح کی جہالت بے علمی سخت مزاجی کے باوجود جذبۂ دین کبھی سرد نہیں پڑا۔

یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کرامت ہے کہ جہاں جہاں اُن کے قدوم مبارک لگے ہیں اُس مٹی کے مزاج میں اسلام رچ بس گیا ہے۔ افغانستان سرحد اور قبائل کی دینداری سب انہی کرامات کا ثمر ہے۔ اور تب سے لے کر آج تک کُفر کی ہر آندھی ان پتھروں سے ٹکرا کر مڑ گئی۔ جنہوں نے غلامانِ نبوّت کے پاؤں چُومے تھے۔ ان پہاڑوں کی بلندیاں ایک بار پھر ساتھ چھوڑنے لگتی ہیں تو سڑک تیزی سے نیچے کو آتی ہے موڑ پہ موڑ کاٹتی ہوئی پہاڑ کے ایک سرے سے جھانکتی ہے تو سامنے کھلی وادی نظر آتی ہے۔ زمین کا مزاج ایک سا ہے۔ لوگوں کا لباس ایک سا ہے۔ سلوک ایک طرح کا۔

ان ڈھلوانوں سے ذرا آگے نکل کر ڈوسلی آتا ہے۔ جہاں انگریزوں کا مشہور کیمپ ہوا کرتا تھا۔ قلعہ بھی ہے جس پر ۱۹۳۰ء کا سن لکھا ہوا ہے۔ میر علی، جو میرن شاہ روڈ پر چھاؤنی تھی سے چل کر یہی کیمپ ہوا کرتا تھا۔ ایک انگریز افسر نے پٹھانوں کی روایات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دن نالے کی طرف سے ہم پر فائر آنے لگا جو ایک رائفل کا تھا اور تھوڑی دیر بعد آ رہا تھا۔ میں نے نوجوانوں کو حکم دیا کہ پیچھے سے جا کر گھیرا ڈال لیں۔ چنانچہ گھیرا

ڈال کر بندوق رکھوا لی گئی تو وہ ایک نوجوان لڑکی تھی جسے وہ میرے پاس لائے اس کے بال ماتھے پر سے کٹے ہوئے تھے۔ اس نے کوئی بات نہ کی۔ چنانچہ مسلمان صوبیدار کی تحویل میں دے دی جس نے علیحدہ کوارٹر گارڈ میں بند کر دی۔ صبح اس کے ورثا آئے کہ ہمیں سزا دے لیں اور بچی کو رہا کر دیں۔

میں نے گیٹ سے باہر نکل کر ان کی بات سنی اور پوچھا:

"اس کی جگہ کون سزا کے لئے تیار ہے؟"

تو ایک جوان آگے بڑھا یہ اُس کا منگیتر تھا۔ جسے گرفتار کر کے لڑکی کو چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ ابھی گیٹ بند ہی ہوا تھا کہ ایک فائر ہوا پتہ چلا کہ لڑکی کے بھائی نے اُسے گولی مار دی تھی کیونکہ رات وہ دشمن کی قید میں گزار چکی تھی اور اب اُس کی خون میں نہائی ہوئی لاش کندھے پر لاد کر گھر جا رہا تھا۔

کیسے عجیب لوگ ہیں؟ اور کتنی عجیب روایات کے حامل، لیکن شاید یہ بات ان ذہنوں میں نہ سما سکے جو ابھی انگریز بننے کی کوشش میں اپنے چونڈے کٹا کر عجیب شکلیں بناتے پھرتے ہیں۔

یہ پتھر، یہ جھاڑیاں، یہ خشک برساتی نالے، یہ سنگلاخ پہاڑ۔ نہ ان میں زراعت ہے، نہ پھل لگتے ہیں نہ پھول کھلتا دیکھا نہ چشمے اُبلتے ہیں، نہ بُلبُل کا نالہ ہے نہ رگِ گل، نہ حسن و عشق کی داستانیں ہیں نہ ہجر و فراق کے قصّے مگر ہر پتھر اذان کی آواز سے گونجتا ہے۔ ہر وادی اللہ اکبر کہتی ہے۔ ہوا کا ہر جھونکا آزاد ہے بالکل آزاد اور وہاں کا ہر باسی آزاد ہے۔ ان کا سر ربِ کریم کے حضور بار بار جھکتا ہے مگر اُس کے سوا کسی کے آگے جھکنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ جذبوں کی سرزمین ہے، روایات کی امین۔ اللہ اسے سلامت رکھے!

اس کے جذبوں کو تاقیامت رکھے! آمین۔

آگے پھر پہاڑ کی بلندی عبور کرنا پڑتی ہے جس کے دوسری طرف دریائے ٹوچی ہے جس کے ساتھ ایک طرف دوڑ آباد ہیں اور دوسری طرف وزیر۔ یہیں چھوٹا سا گاؤں ایپی بھی ہے۔ مجاہد کبیر مرزا (بھائی) علی خاں طوری خیل فقیر ایپی کا گاؤں، جو انگریز کے لئے برقِ تپاں ثابت ہوا۔ پانچ فٹ سات انچ کا دُبلا پتلا، کمزور سا انسان جو دمہ کا مریض بھی تھا، رنگ گندمی سیاہی مائل، ڈاڑھی پتلی اور آواز نحیف تھی مگر جذبہ جوان تھا اور گیارہ برس انگریزی فوج کے لئے بلائے ناگہانی بنا رہا۔ آخر عمر میں چارپائی سے اُٹھنے کے قابل نہ رہے تھے مگر ہمت نہ ہاری۔ پاکستان بننے کے بعد گوروبخت ہی میں قیام پذیر ہو گئے کہ انگریز کے گماشتوں نے ان کے بارے غلط فہمیاں پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ دوسری طرف انھیں پٹھانستان کے لئے پاکستان کے ساتھ جنگ کرنے کی ترغیب دی۔ مگر اس مردِ قلندر نے فرمادیا،

"مسلمان کا قتل حرام ہے، یہ جہاد نہیں ہوسکتا"

ع   خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ہم نے ٹوچی دریا پُل پر سے ایشا کے مقام پر عبور کیا۔ کھجوری اور میر علی سے گزرے۔ میر علی تو آج بھی عرب کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ وسیع میدان اور ہر طرف کھجوروں کے جُھنڈ، اس چھاؤنی کی یاد تازہ کر دیتے ہیں جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہاں بنائی تھی۔

یہاں سے آگے راستہ میرن شاہ کو جاتا ہے جسے میرم شاہ بھی لکھا جاتا ہے بہت بڑی آبادی ہے، ڈگری کالج ہے، پولیٹیکل ایجنٹ کا دفتر ہے۔ اور

تیس سے چالیس ہزار کے قریب افغان مہاجرین کے گھر آباد ہیں۔ آبادی کا اندازہ کریں۔ میرن شاہ میر علی وغیرہ بازاروں میں ہر قسم کا اسلحہ کلاشن کوف، پستول راکٹ لانچر، اینٹی ایئر کرافٹ اور چھوٹی توپیں دکانوں پہ یوں بھری پڑی ہیں جیسے گاجر مولی ہوں۔ بہت بڑا بازار ہے۔ میرن شاہ سکاؤٹس ہیڈکوارٹر اور ہیڈکوارٹر ہسپتال بھی ہے۔ نیز بہت بڑا تجارتی مرکز ہے۔

یہاں پہنچ کر ہمارا وزیرستان کا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ رات پروفیسر محمد ابراہیم صاحب کے ہاں قیام رہا۔ مسجد میں بیان اور ذکر ہوا اور ۱۸ اکتوبر کو صبح چل کر کچھ دیر بنوں رُکے پھر لکی مروت عیسیٰ خیل اور میانوالی سے ہوتے ہوئے مرشد آباد ٹھہرے اور شام تک بفضل اللہ واپس پہنچ چکے تھے۔

ایک خوبصورت یاد، ایک بہترین تجربہ، بہت سے اچھے لوگ اور بے شمار مجاہدوں کی ملاقات۔ کچھ اپنی کہی، کچھ ان کی سُنی اور یوں بفضل اللہ ہم نے ایک ہفتہ شیروں کے کچھار میں بسر کیا۔

بنگلہ دیش

جو کبھی مشرقی پاکستان تھا

اس بار صحت بہت خراب رہی۔ ایک آدھ پروگرام اندرونِ مُلک متاثر بھی ہُوا۔ دراصل بلڈ شوگر کنٹرول نہیں ہو پا رہی تھی۔ اب بھی حال تو وہی ہے، لیکن شاید انسان دُکھوں کا بھی عادی ہو جاتا ہے اور پھر اسے تکلیف محسوس نہیں ہوتی، ورنہ خون میں شوگر کی مسلسل زیادتی سے تمام اعضائے رئیسہ یعنی دل، جگر، دماغ اور سارا اعصابی نظام متاثر ہوتا رہتا ہے، مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہتا ہے۔ نگاہ مسلسل کمزور اور گُردے خراب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یعنی ایک مسلسل موت ہے جو آہستہ آہستہ وارد ہوتی رہتی ہے مگر زندگی کو آخر اسی دروازے سے گزرنا ہے ہاں سفر کے قابل نہ رہا تو کچھ پروگرام متاثر ہوتے۔ جو پروگرام منسوخ ہوتے اُن میں بنگلہ دیش کا دورہ بھی تھا۔

وہاں کچھ لوگ حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کے تھے، جو مغربی پاکستان میں ملازمت کے دوران آپؒ کے فیضان سے آشنا ہوئے پھر مشرقی پاکستان ٹوٹ گیا۔ نئی ریاست بنگلہ دیش بنی، آنا جانا مشکل ہو گیا۔ اگر وہ نہیں آسکے تو ہم بھی تو نہ جاسکے۔ بہرحال اس بار یعنی دسمبر ۱۹۸۹ء میں وہاں جانے کا پروگرام بنا،

جو اَب خرابیٔ صحت کی نذر ہو رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق تو ۳، دسمبر کو کراچی جانا تھا اور ۷، دسمبر کو کراچی سے ڈھاکہ، مگر کراچی کی بجائے لاہور جانے کا پروگرام بنا کہ ہسپتال میں مکمل چیک اَپ کرایا جائے، مختلف ڈاکٹروں سے وقت طے ہُوا، اور کراچی کرنل مطلوب اور حضرت حافظ صاحب کو روانہ کر دیا۔

۴، دسمبر کو ابھی لاہور نہ گیا تھا کہ ڈھاکہ سے مولانا نورالدین صاحب کا محبت بھرا خط ملا، جس سے ان کی شدتِ انتظار کا اندازہ ہوتا تھا۔ چنانچہ فیصلہ بدل دیا، کہ ہسپتال کی بجائے ڈھاکہ جاؤں گا۔ اگر مرنا ہی ہے تو الحمدللہ، مگر احباب کو مایوسی کے اتھاہ سمندر میں گرنے نہیں دوں گا۔ مَیں جب مِڈل کا امتحان دینے چکوال ٹھہرا ہُوا تھا تو میرا قیام نانا جان مرحوم کے ایک دوست کے ہاں تھا۔ اُن کے ہاں کبھی کبھی شعر و شاعری کی محفل جما کرتی تھی۔ ایسی ہی ایک محفل دیکھنے اور سُننے کا اتفاق ہُوا۔ یہ تقسیمِ ملک سے پہلے کی بات ہے مگر مجھے ابھی تک اُن کی وہ رُباعی یاد ہے جو وہ مزے لے لے کر احباب کو سنا رہے تھے۔ آپ بھی سُن لیں ؎

قاصد بصد خوشامد و منّت کیا رواں   سامانِ جملہ عیش مہیا کیے یہاں
آہٹ پہ کان، در پہ نظر تھی کہ ناگہاں   آئی خبر کہ پاؤں پہ مہندی لگے وہاں
بس خُوں ٹپک پڑا نگاہِ انتظار سے

سو یہاں ہم لاہور مہندی لگوانے نہ گئے کہ احباب کی نگاہِ انتظار کو خوں باری سے بچا سکیں اور یوں ۶، دسمبر کو اسلام آباد سے کراچی جا پہنچے۔ بنگلہ دیش کا ویزا تو پہلے لیا جا چکا تھا اور ۷، دسمبر کی سیٹ کنفرم تھی۔ لہٰذا علی الصبح روانہ ہو گئے تقریباً ۳۰-۹ پہ چیک اِن ہوتے تو پتہ چلا جہاز ۱۰ بجے کی بجائے ۱۵-۱۱ پہ روانہ ہو گا۔ چنانچہ انتظار گاہ میں وقت گزرا۔ جب جہاز میں بیٹھ چکے تو کپتان نے اعلان

گیا: "رن وے پہ ایک جہاز خراب ہو گیا ہے لہٰذا انتظار فرمایئے!" گھنٹہ بھر میں راستہ صاف ہُوا اور یوں ۱۲ بجے دوپہر جہاز کے پہیّوں نے کراچی کی زمین کو چھوڑا۔

یہ سروس کراچی سے کھٹمنڈو جاتی ہے اور وہاں سے ڈھاکہ اور واپسی ڈھاکہ سے سیدھی کراچی آتی ہے۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد جہاز راجستھان کے صحرا پر محوِ پرواز تھا۔ یہ ایئربس تھی لہٰذا اتنی بلند نہ تھی کہ نیچے کچھ نظر نہ آتا۔ نیچے ہر طرف صحرا کی وسعتیں تھیں جن میں دُور دُور چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ بس اپنے چولستان کی طرح کا علاقہ تھا۔ کافی دیر بعد آبادی کا رنگ بدلنا شروع ہُوا۔ پہلے نسبتاً بڑی بستیاں اور اُن کے درمیان کچی سڑکیں، پھر پکّی سڑکیں اور پھر جہاز بڑے بڑے شہروں کے اُوپر محوِ پرواز تھا۔ ایک تو بہت ہی خوبصورت شہر دکھائی دیا، اُس کے درمیان میں سے دریا گزر رہا تھا جس پر چار پُل اتنے بڑے تھے کہ جہاز پر سے صاف نظر آ رہے تھے۔ افسوس ہُوا کہ کاش! دُوربین ہی ساتھ رکھی ہوتی اور یوں دُور آسمان پر سفید دھاری سی نظر پڑی پھر آہستہ آہستہ صاف ہوتی گئی تو پتہ چلا، ہمالہ نے سفید صافہ لپیٹا ہُوا ہے۔ شمالی علاقہ سے قریب ہوتے جا رہے تھے، آہستہ آہستہ نیچے گھنے جنگل شروع ہوئے اور پہاڑوں نے بلند ہونا شروع کر دیا۔ برف کی سفیدی مزید واضح ہونے لگی۔ اور یوں ہم قدرتِ باری کے شاہکار دیکھ رہے تھے۔

صحرا، ریگستان، ویرانے، کچی بستیاں، پھر بارونق شہر، دریا، پُل۔ ابھی تک اس شہر اور دریا پہ گمان لئے بیٹھا ہوں کہ شاید شاہجہان کی محبت کا مزار شہر آگرہ ہی نہ ہو کہ جہاز کا رُوٹ وہی بنتا ہے۔ بہرحال جب جہاز ہمالہ کی تہرائیوں پہ محوِ پرواز تھا تو کپتان صاحب نے اعلان فرمایا کہ آپ مونٹ ایورسٹ دیکھ سکتے ہیں۔ اور ہم نے دیکھا ہماری بائیں جانب برف کا برقعہ اوڑھے مونٹ ایورسٹ

کھڑی تھی۔ نیچے والے پہاڑوں پر اِکا دُکا گھر، چھوٹی چھوٹی بستیاں اور قابلِ کاشت زمینوں کے ٹکڑے بہار دے رہے تھے کہ پیٹیاں کسنے کا اعلان ہُوا۔ اچانک جہاز ایک کھلی وادی میں جا پہنچا، جہاں چھوٹے چھوٹے مکانوں کا بکھرا بکھرا شہر کھٹمنڈو تھا اور یوں ہم رن وے پر لینڈ کر چکے تھے۔

سب سے پہلے یہاں کی سواریاں اُترنے لگیں۔ عجیب وغریب شکلیں بظاہر سیّاح، مگر درحقیقت انسانی تہذیب کے مسخ شدہ ڈھانچے۔ اور میں ان صورتوں کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ وطن عزیز میں بھی جسے ذرا فراخی نصیب ہوتی ہے۔ اظہارِ شوکت کے لئے صاحب بہادر بننے کی کوشش کرتا ہے مگر یہ صاحب بہادر ہیں کہ آگے آگے ہی بھاگے جا رہے ہیں۔ بھلا لوگ کہاں تک ان کے پیچھے جا سکیں گے۔ مثلاً ایک ساڑھے چھ فٹ کے جوان نے مونچھ ڈاڑھی مُونڈھ کر نہ صرف عورتوں کی طرح بال بڑھا رکھے تھے بلکہ کانوں میں بڑے بڑے بُندے بھی لٹکا رکھے تھے تو دوسرے نے گالوں کو صاف کر کے ٹھوڑی پر ڈاڑھی بے تحاشا بڑھا رکھی تھی۔ تیسرے نے زنانہ بالوں کے ساتھ بڑے بڑے گُل مچھے رکھے ہوئے تھے پتہ نہیں یہ ابلیس کے سفیر انسانیت کا دامن کہاں تک داغدار کرتے چلے جائیں گے۔

جب ہماری باری آئی تو پتہ چلا کہ ڈھاکہ جانے والی سواریوں کو اُترنے کی اجازت نہیں۔ لوگ باہر نکلنے کی بڑی حسرت رکھتے تھے مگر مجبوری تھی۔ چند تبلیغی جماعت کے احباب نیچے اُترے، رن وے پر چادر بچھائی، ہم بھی اُتر گئے اور یوں اللہ کے ان نیک بندوں کے ہمراہ عصر با جماعت ادا کی۔ بہت خوبصورت ہوا چل رہی تھی نہ دُھواں، نہ گرمی، نہ سردی کی شدت۔ بس یوں کہیئے خوبصورت

اِردگرد مناظرِ فطرت اپنا حُسن لُٹا رہے تھے۔ چند لمحے ہم بھی لُطف اندوز ہوئے اور پھر واپس جہاز میں آ بیٹھے۔ لوگ جہاز کے عملے سے زبردستی کرکے بھی کم ازکم سیڑھی تک ضرور جاتے اور باہر کا نظّارہ کرتے ہوائی میزبان خواتین اور ایک صاحب بڑی شِدّت سے لوگوں کو منع کررہے تھے مگر حال وُہی تھا کہ کچھ ہٹ کر اندر چلے جاتے تو دوسرے ان کی جگہ لینے کو آجاتے۔

آخر اعلان ہُوا کہ سیٹوں پہ بیٹھیں تاکہ نئے آنے والوں کو سوار کیا جائے اور جب لوگ ہٹ گئے تو ان میزبان خواتین نے کیمرہ نکالا۔ ان صاحب سمیت سب سیڑھی پہ کھڑی ہوگئیں اور ایک کو کیمرہ تھما دیا کہ ہماری تصویریں اُتارو مگر یاد رہے ماؤنٹ ایورسٹ پس منظر میں ضرور آنی چاہیئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ انسان خواہ عمرِ عزیز کو ہواؤں کے دوش پہ گزار دے وہ اپنے پہلو سے دل کو نوچ کر نہیں پھینک سکتا۔ نئے آنے والے بھی تہذیبِ مغرب کے کھنڈرات تھے۔ حیرت ہوئی کہ یہ ڈھاکہ کیوں جائیں گے تو پتہ چلا کہ یہ کراچی کی سواریاں ہیں جو وایا (VIA) ڈھاکہ لے جائی جائیں گی۔

جہاز ایک بار پھر بلند ہُوا تو دُنیا کی عظیم ترین چوٹی، جو تیس ہزار فٹ بلند ہے کے پہاڑ کی گود میں پھیلا ہوا بھوٹان اپنے چھوٹے چھوٹے مکانوں کے ذریعے قدیم ہندو تہذیب کی نشاندہی کررہا تھا۔ مجھے تو ایک ہی پُختہ سڑک نظر آئی باقی تو کچی گلیاں ہی تھیں۔ بہرحال ایک طائرانہ نظر سے دیکھا بھی کیا جاسکتا ہے؟ جہاز جو کراچی سے لیٹ تھا، یہاں اور بھی لیٹ ہوا اور یوں عشاء کے وقت ڈھاکہ ایئرپورٹ پہ جا اُترا۔ احباب نہایت بے چینی سے منتظر تھے تقریبًا بیس برس بعد ملاقات ہو رہی تھی، گلے لپٹ لپٹ کر ملے اور یوں رات گئے مکان پہ پہنچے،



بنگلہ دیش کے علماء

ڈھاکہ شہر کے سائیکل رکشے



جہاں ہمیں ٹھہرنا تھا۔ علی الصبح نماز کے بعد بیان ہوا۔ ذکر تو سحری سے شروع ہو چکا تھا "ضرورتِ ذکر" پہ بیان ہوا۔ دن لوگوں سے ملاقات کی نذر ہوا۔

عصر کے بعد ذرا باہر نکلے تو بوڑھی گنگا دیکھی۔ یہ دریائے گنگا کی ایک بہت بڑی شاخ ہے جو قدیم زمانوں سے ڈھاکہ شہر کے ساتھ ہو کر گزرتی ہے اور شمالی نیز جنوبی علاقوں کا ڈھاکہ تک کا آبی راستہ ہے۔ اس کے کنارے قدیم "نواب گان" کے محلات ہیں۔ دوسرے کنارے بھی بہت بڑا شہر ہے جو کبھی الگ تھا مگر اب پُل بنا کر ڈھاکہ سے ملا دیا گیا ہے تو ڈھاکہ ہی کا حصہ معلوم ہوتا ہے بلکہ شمار ہوتا ہے۔ رنگا رنگ چھوٹی بڑی کشتیوں کی بھیڑ تھی۔ بڑی بڑی کشتیوں سے جنگلات سے ڈھاکہ آنے والی لکڑی اتاری جا رہی تھی۔

ایک جگہ مچھلی نیلام ہو رہی تھی۔ لوگ دریا سے پکڑ کر لاتے اور یہاں نیلام کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں انکشاف ہوا کہ اوپر ہندوستان نے بند باندھ رکھا ہے جب بنگال میں پانی کی ضرورت ہو وہ روک لیتے ہیں اور یوں قحط پیدا ہوتا ہے اور جب ضرورت نہ ہو تو ایکدم پانی چھوڑ دیتے ہیں، جس کے باعث ڈھاکہ میں سیلاب آجاتا ہے۔

دوسرے روز ہمیں میرپور، جو ڈھاکہ کے دوسرے سرے پہ آبادی ہے جانا تھا تو شہر سے گزرنا پڑا۔ مسلمانوں کی اس ریاست میں بہت زیادہ بدحالی ہے خود ڈھاکہ شہر کا بیشتر حصّہ تنگ گلیوں پہ مشتمل ہے جن میں صفائی کا بھی کوئی اہتمام نہیں۔ سب سے بڑی سواری انسان کا چلانے والا سائیکل رکشا ہے جس میں دو آدمی سوار ہوتے ہیں اور ایک انسان اسے چلا رہا ہوتا ہے۔ بچے، بوڑھے، جوان صحتمند اور بیمار ہر طرح کے لوگ یہ رکشا کھینچتے نظر آتے ہیں۔ وہ بچے جن کے

ہاتھوں میں کتابیں ہونا چاہئیں تھیں، وہ بزرگ جن کو تسبیح ہاتھ میں اور آرام کی
ضرورت تھی، ایسے بیمار جو دوا کے حاجتمند تھے، سب رکشا میں جُتے ہوئے تھے۔
آپ کو یقین نہ آرہا ہو تو وطن عزیز میں ڈیرہ اسمٰعیل خان اور بہاولپور کے شہروں
میں بھی یہ نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

جہاں انسانیت کی اس طرح تذلیل ہو، وہاں کسی بھی قسم کے معاشی یا
معاشرتی انصاف کی توقع ہی سِرے سے فضول ہے۔ حکمرانوں کے لئے کاروں
کے جلوس، اور شہری گھوڑے اور گدھے کی جگہ سواری کھینچنے کے لئے جُتا ہوا ہے۔

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

حیرت اس بات پہ ہوتی ہے کہ سواری کرنے والے افراد کھینچنے والے
کے لئے ہرگز پریشان نہیں ہوتے۔ رکشا پھنس جائے یا اُس کا پہیہ کہیں نالی میں
اُتر جائے تو وہ چلانے والا بیچارا دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر اسے باہر نکالے گا
سوار تو مدد کیا کرتے، اُتریں گے بھی نہیں کہ چلو، وزن ہی کم کر دیں اور ڈھاکہ شہر
میں تقریباً دو لاکھ لائسنس ہے اور ہر لائسنس پر دس سے بیس تک رکشے ہیں تو
شہر میں کم و بیش بیس لاکھ ایسے رکشے ہوں گے۔ بازاروں میں، سڑکوں پر، چوک
میں ہر طرف یہی پھیلا ہوا ہے۔ پولیس کا سپاہی بھدی سی وردی ہاتھ میں ڈنڈا لئے
کھڑا ہوتا ہے۔ اگر رش زیادہ ہو جائے تو چوک سے ایک طرف ہو جاتا ہے اور لوگ
خود ہی ہمت کر کے راستہ بنا لیتے ہیں۔ پُرانی کاریں خال خال نظر آتی ہیں عموماً ۶۲،
۶۹ ماڈل، چند ایک ۷۰، ۷۱ بھی اور محدودے چند ۸۵، ۸۶ جو شاید اعلیٰ افسروں
کی ہوں گی۔ چیزوں کی قیمتیں آسمان کو چھوتی ہیں۔ بہت اچھا اناناس، مگر پچاس
روپے میں ملے تو کون خریدے؟ ڈاب یعنی ناریل کا پھل جس میں گری بننے سے

قبل ڈیڑھ جگ کے قریب ٹھنڈا اور میٹھا پانی ہوتا ہے۔ سیب چھوٹا سا داغدار مگر
پچاس روپے کلو۔ مالٹا کھٹا اور چھوٹا سا مگر پچیس روپے کے چار۔ یہی حال باقی
اجناس کا ہے حتیٰ کہ آج کا بنگالی مچھلی پکڑتا ہے مگر کھا نہیں سکتا کہ بیچ کر دوسری
ضرُوریات پُوری کرتا ہے اور صُبح شام مٹھی بھر چاول مل جائیں تو غنیمت ہے۔
غربت و افلاس نے لوگوں کی نہ صرف کمر توڑ دی ہے بلکہ چہروں کی رونق چھین
لی ہے۔

اگلے روز چٹاگانگ جانے کا پروگرام بنا تو ہم ریل گاڑی سے جانے پہ تیار
ہوئے۔ فرسٹ کلاس کی ٹکٹیں منگوائی گئیں اور صُبح سویرے ریلوے سٹیشن پہنچے۔
پاکستان کے زمانے کی بنی ہوئی خوبصُورت عمارت ہے گاڑی کے ڈبے لگے ہوئے
تھے۔ نام کو تو فسٹ کلاس مگر عام سی نشستوں کے سامنے ایک میز نما شے
لگی ہوئی تھی اور سر پر گھُومنے والے چھوٹے پنکھے۔ پٹڑی میٹر گیج کی مگر ڈبے بڑے
بڑے، جس کے نتیجے میں گاڑی دائیں بائیں بہت زیادہ جھُولتی تھی۔ حتیٰ کہ باتھ رُوم
جانا خاصا مشکل تھا۔ فرسٹ کلاس میں ناشتہ بھی ملا اور پھر دن بھر قیمت دے کر
چاء اور کھانا ملتا رہا جیسا بھی تھا، دستیاب تھا۔

ڈھاکہ شہر کا کچھ حال ریل میں بیٹھ کر دیکھا۔ سب سے عجیب حصے وہ تھے
جہاں سیاہ رنگ کا بدبودار پانی کھڑا تھا اور اس کے اوپر بانسوں پر بنے ہوئے
جھونپڑوں میں انسان مقیم تھے۔ ایسے کئی محلے دیکھے جو ریلوے لائن کے ساتھ
تھے۔ ظاہر ہے ان میں پانی کا نل تو نہ ہوگا۔ لہٰذا ان آبی محلوں کے باہر جہاں
کوئی نل بھی تھا لوگوں کے انبوہ تولئے لئے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے جبکہ
ایک دو نہا رہے تھے۔ یہ حال تو مقامی آبادی کا تھا۔ خدا جانے وہ بستیاں

کیسی ہوں گی جہاں بہاری مسلمان اور پاکستانی پناہ گزین رہتے ہیں، دیکھنے کی حسرت رہی۔ وقت نہ مل سکا کہ جا کر دیکھ آتے۔ ڈھاکہ اب بہت پھیل چکا ہے۔ تقریباً دو صد مربع میل علاقہ شہر نے گھیر لیا ہوگا۔ دھان منڈی کا علاقہ کھلا اور پختہ ہے۔ یہ وہاں کا گلبرگ کہہ لیجئے۔ اسی میں مجیب الرحمٰن کا وہ گھر جو اس کا مقتل بھی ہے اور جہاں اب اس کی بیٹی مقیم ہے، نظر آتا ہے۔ ایک سڑک کے کنارے ایک عجیب و غریب طرز کا اونچے نیچے ڈاٹوں والا برآمدہ سا ہے، اس کے نیچے تین قبریں ہیں۔ ایک میں خواجہ ناظم الدین، دوسری میں حسین شہید سہروردی اور تیسری میں شیرِ بنگال مولوی فضل الحق آرام فرما ہیں۔ برآمدے کی طرز سے لگتا ہے جیسے وہ بھی پریشان ہوں۔

اس سے آگے پرانا ایئرپورٹ ہے جو آجکل پریڈ گراؤنڈ بنا ہوا ہے۔ وہاں ۱۶، دسمبر کی آزادی کی پریڈ کی مشقیں ہو رہی تھیں۔ ہاں! اسی ۱۶، دسمبر کو جب جناب جنرل نیازی صاحب نے جو (شیر) TIGER کہلواتے تھے، بلّی بن کر اپنا پستول کھول کر جنرل اروڑہ کو پیش کیا تھا اور انھوں نے سنگینوں سے جنرل صاحب کے ستار نوچے تھے۔ اب اس فتح کی خوشی میں لاہور چھاؤنی میں قلعہ نما گھر بنایا ہے تاکہ فتح کی یادگار رہے اور دیکھنے والے جان سکیں کہ یہاں TIGER مقیم ہے۔

بہرحال ریل آگے بڑھتی رہی اور ہم چھوٹے بڑے سٹیشن پیچھے چھوڑتے رہے۔ زمیندار زمینوں میں کام کر رہے تھے۔ سال میں چاول کے دو فصل ہوتے ہیں اور یہ موسم ایک فصل کی برداشت اور دوسرے کی کاشت کا تھا۔ لہٰذا کیچڑ میں لت پت ہل چلا رہے تھے یا سہاگہ پھیرا جا رہا تھا۔ بچے، بوڑھے اور جوان سب مصروف تھے مگر افلاس کا یہ عالم کہ ایک جگہ، ایک بوڑھا آگے سے سہاگہ کھینچ رہا تھا اور پیچھے ایک نوعمر بچی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں ذرا بلندی پر تھے۔ کھیتوں

میں ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ سُنا ہے کبھی یہاں بے شمار بطخیں ہوتی تھیں۔ اب تو کسی کسی گاؤں میں چند ایک نظر آجائیں ورنہ مشکل۔ بارشوں کے موسم میں صرف گاؤں نظر آتے ہیں اور کھیتوں کی منڈیریں بھی ڈوب جاتی ہیں۔ پھر گاؤں سے گاؤں تک صرف کشتی ہی وسیلہ ہوتی ہے۔

گاڑی مزے سے جھولتی جا رہی تھی کہ پچھلے ڈبے سے کسی نے زنجیر کھینچ دی۔ ہم سے پیچھے بھی اِک ڈبہ تھا۔ "گر گیا! گر گیا" کے شور میں گاڑی تھم گئی۔ یا اللہ! کیا گر گیا؟ کوئی آدمی ہوگا، جو غریب کچلا گیا ہوگا۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ پھر پتہ چلا آدمی نہ تھا، بریک کھُل کر گر گیا۔ شاباشے بھائی!

یہ فرسٹ کلاس کے ڈبے اور نان سٹاپ ٹرین تھی۔ بس سے نہ گئے کہ پانچ دریا بس سمیت کشتی پہ چڑھ کر عبور کرنا ہوتے ہیں تو سارا دِن لگ جائے گا۔ ریل کے پُل ہیں یہ پانچ گھنٹے میں پہنچا دیتی ہے مگر "ایں گُل دیگر شگفت"۔ اب کیا ہوگا؟ کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ رسّی سے باندھ دیا ہے اور اب آگے برہمن باڑیا سٹیشن آرہا ہے وہاں جا کر ٹھیک کرلیں گے۔ چلو جی اچھا ہُوا۔ چلتے ہوتے برہمن باڑیا پہنچے۔ وہاں اور گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ اندر کا حال تو اللہ جانے، البتہ چھت بھی مخلوقِ خدا سے اَٹے ہوئے تھے جو نہایت صبر سے بیٹھ کر ریل کے چلنے کی منتظر تھی۔ کملاپُور میں کملے بِک رہے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا مالٹا نما پھل ہے جو کا یعنی کھٹا سا ہوتا ہے۔ ایک جگہ سے گاڑی ہندوستانی بارڈر کے ساتھ سے گزرتی ہے۔ دوسری طرف اگرتلہ ہے جو سازش کے نام کے ساتھ بہت مشہور ہوا تھا۔ آگے پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے یہاں پہاڑ مٹّی کے ہیں جن پر رُوئیدگی کی بہت زیادہ بہتات ہے۔ ایک سٹیشن سیتا کنڈ آتا ہے جس کے مقابل پہاڑوں پر سیتا

کا مشہور مندر ہے۔ یوں ہم نے بنگالی مسلمان کو بنگال میں بھوک کے ہاتھوں
بہت اذیت میں دیکھا۔

عصر کے قریب گاڑی چٹاگانگ پہنچی تو ایک ساتھی کے دوست کی وین
منتظر تھی۔ جس کا ڈرائیور اردو بھی بولتا تھا اور داڑھی بھی خوب رنگ کر سیاہ کر
رکھی تھی۔ اُس نے ہمیں سٹیشن سے اٹھایا اور ایک مسجد کے پاس اُتار دیا، جو
ایک ویرانے سے میں تھی، ساتھ ملحقہ مدرسہ بھی تھا۔ عصر ادا کی اور ہوٹل کو چلے
تو گاڑی غائب۔ اب کیا ہو؟ دوسری سواری تو رکشا ہی ہے مگر انسان کے
کھینچنے والا رکشا تو منظور نہ تھا۔ لہٰذا ایک ڈیزل رکشہ تلاش کیا بمشکل گھسڑ کر اس میں
بیٹھے تو سڑک پر حادثہ ہو گیا اور ٹریفک رُک گئی، پولیس والے الگ کھڑے گپ لگا
رہے تھے جیسے اُن کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ خیر رکشہ والا مختلف گلیوں سے
گزرتا ہوا مغرب کے قریب ہمیں ہوٹل میں لے گیا جس کا نام "ہوٹل ہوائی" تھا۔
کمرے دو عدد ٹھیک تھے، ایک میں کرنل صاحب اور بندہ اور دوسرے میں ساتھی
ٹھہرے۔ رات کا ذکر بھی وہیں ہُوا اور اسی جگہ سحری کا ذکر بھی ہُوا۔ چٹاگانگ
کے احباب بھی جمع ہو گئے تھے۔ یوں پندرہ بیس ساتھی بن گئے۔ ہوٹل کا بیرا
بہاری لڑکا تھا اُس نے ہمارے لئے باوضو ہو کر کھانا تیار کیا۔ اور یوں رات گئی۔

اب گاڑی کا پتہ کرایا تو پتہ چلا واپس نہیں پہنچی۔ پتہ نہیں اُسے کیا ہُوا؟
بالآخر رات ۱۲ بجے گھر پہنچی۔ ڈرائیور ہم سے بھاگ کر کہیں سواریاں ڈھوتا رہا تھا۔
بہت حیرت ہُوئی مگر دوست نے جملہ کہہ کر حیرت دُور کر دی کہ غربت اِس سے
بھی بڑے جرائم کو جنم دیتی ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ صبح احباب تو واپس چلے
گئے، ہم نے ناشتہ کیا اور بل پُوچھا۔ دو کمرے ڈبل بیڈ، پرانے بستر اور پاکستان

کے زمانہ کے کمبل، جن میں سے جگہ جگہ سے روشنی اور ہوا کے لئے روزن بن چکے
تھے۔ رات سبزی اور پاؤ بھر کا مُرغ ہو گا۔ صبح ایک ایک فرائی انڈا اور ٹوسٹ،
یاد ہے کھانا اور ناشتہ صرف مَیں نے اور کرنل صاحب نے کیا۔ بل بنا تین ہزار
ٹکے، جی ہاں! -/۳۰۰۰ اونلی۔ وہ پاؤ بھر کا مُرغا فرائی ایک سو پینتیس -/۱۳۵ روپے
کا تھا۔ اب پتہ چلا کہ ہوٹل خالی خالی کیوں تھا؟

خیر نو بجے کے قریب ہم نکلے۔ ایک گاڑی منگوائی ٹویوٹا ہائی ایس کی قسم کی
چھوٹی گاڑی تھی۔ دو لڑکے ساتھ تھے۔ چٹاگانگ دیکھنے نکلے۔ مشہور سڑکیں، پھر
وہ پارک جہاں میجر ضیاء نے بنگلہ دیش کا اعلان کیا تھا اور ساتھ وہ سرکٹ ہاؤس
ویرانہ اور تنہا سا، جہاں جنرل ضیا بحیثیت صدرِ بنگلہ دیش داخل ہُوا اور ایک
مقتول نعش کی صُورت باہر آیا۔

بنگال کی سیاست بھی عجیب ہے۔ جلسے جلوس روزمرہ کا کام ہے بالکل
پہلے کی طرح۔ جب مجیب نے نعرہ مارا "بھٹو یحییٰ، اندرا اور مجیب" اپنی اپنی ہوس
پُوری کرنے کے لئے انسانوں کے خُون سے ہولی کھیلے۔ بھٹو اور مجیب کو اقتدار
مل گیا۔ اندرا فاتح کہلائی مگر یحییٰ خاں کی محرومی کا دَور شروع ہُوا جو نہ صرف ذلت
بلکہ گمنامی کی موت پر منتج ہوا پھر مجیب کی باری آئی، سارے خاندان سمیت قتل ہُوا
اس کے خاندان کے بائیس افراد مارے گئے جن میں سب رشتہ دار شامل تھے
اور کئی دن بعد بوری میں ڈال کر گڑھے میں پھینکا گیا۔ یہ ہمت ضیاء الرحمٰن نے کی
تھی۔ چند جوان افسروں کو آگے کر دیا، جب وہ قتل کر چکے تو خود حکومت سے وفاداری
کا اعلان کر دیا اور انہیں ملک سے باہر بھگا دیا۔ آرام سے حکومت کرتا رہا، مگر
مدت پُوری ہو گئی۔ صدر ارشاد نے اس کے خلاف سوچا، جنرل منظور کو تیار کیا۔

جس نے چٹاگانگ، ضیاء کو قتل کر کے دفن کر دیا اور خود اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ یہ اس کے ساتھ ملے تھا مگر ارشاد صاحب حکومت کے وفادار بن گئے۔ اس کی گرفتاری کا حکم دیا، اُس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر پکڑا گیا اور قتل ہُوا کہ اگر زندہ رہتا تو افشاء کا خوف تھا۔ اب ارشاد صاحب کا طوطی بول رہا ہے، مگر مکافات کا پہیہ بھی تو حرکت میں ہے کون جانے کب کیا ہو؟

اُدھر اندرا اپنے محافظ کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچی پھر بیٹا وزیر اعظم بنا اور اب وہ بھی منظر سے غائب ہو چکا ہے۔ ادھر جناب بھٹو اپنے انجام کو جا گئے پھر ادھر بھی ضیاء صاحب آئے مگر اس اللہ کے بندے نے مسلمانوں کی بحیثیت قوم بہت خدمت کی اور افغان جہاد میں بھرپور حصہ لے کر دُنیا کی تاریخ میں پہلی بار روس کی قابض فوجوں کو واپسی پہ مجبور کر دیا۔ اللہ نے اس کا جہاد قبول فرما کر اُسے شہادت سے نوازا۔ اور مکافات کا عمل بینظیر کو گھیر کر آگے لایا اس کے ہاتھوں ہم اپنے اعمال کی سزا بھگت رہے ہیں اور ایک روز وہ اپنا انجام پالے گی اور اس پہ کوئی حیرت نہ ہوگی کہ یہ ایک مسلسل عمل ہے نہ اس پر کسی کو خفا ہونا چاہیئے۔

تو چلئے! آگے ایک مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے۔ وہ دیکھیں، یہ اس سے پہلے ایک چڑیا گھر ہے۔ بنگال کا چیتا، مختلف نسلوں کے بندر، چٹاگانگ کے جنگلوں کا ریچھ، چتکبرے ہرن اور ایک بہت بڑا شاہین۔ ادھر دیکھیں! یہ کئی اژدھے پڑے ہیں۔ کم و بیش بیس پچیس فٹ لمبے اور عجیب بات ہے اژدھے کی آنکھ نہیں ہوتی بلکہ آنکھ کی جگہ بٹن نما ایک شے لگی ہے یہ صرف محسوس کرتا ہے دیکھ نہیں سکتا۔ آج اس محاورے کی سمجھ آئی کہ "تمھاری آنکھیں ہیں یا بٹن" سُنتے آئے تھے، پتہ نہ تھا۔ ایک کمرہ نما پنجرہ چھوٹے پرندوں کا تھا۔ رنگ برنگے چھوٹے

بڑے پرندے، بڑے خوبصورت۔ مَیں قریب ہوا تو اندر ایک تار پر اک مینا بیٹھی تھی، ایک چھوٹا سا پھول انتہائی سُرخ رنگ کا اس کی چونچ میں دبا ہُوا تھا جس کے تین ڈنٹھل تھے باقی دو پر دو ادھ کھلی کلیاں تھیں۔ مَیں ذرا اور قریب ہو گیا پھر اور قریب۔ خیال تھا کہ اُڑ کر دوسری طرف چلی جائے گی مگر اُسے میری خبر ہی کب میں بالکل جنگلے کی جالی سے لگ گیا۔ عین میری آنکھوں کے برابر، ایک فٹ کے فاصلے پر بیٹھی تھی اور بغیر آنکھ جھپکے دیکھ رہی تھی دُور بہت دُور، سرسبز و شاداب جنگلوں میں جہاں کوئی اُسے تلاش کر رہا ہوگا۔ اس کا محبوب، اس کا ساتھی یا اس کی کوئی بہت ہی پیاری سہیلی، جسے وہ روزانہ پھولوں کا تحفہ دیا کرتی تھی۔ اُس نے حسبِ معمول پھول تو توڑ لئے تھے مگر پنجرہ کہیں جانے کی اجازت نہ دے رہا تھا۔ عین ممکن ہے اس کے ننھے مُنے بچے ہوں جن کی یاد نے اُسے دو عالم سے بیگانہ کر دیا تھا۔ مگر اُس کے بچوں کی عمر نہ تھی۔

مَیں دیر تک اُسے دیکھا کیا، مگر کیا مجال جو اُس نے آنکھ جھپکی ہو یا چونچ کھولی ہو۔ مَیں نے پھول کو غور سے دیکھا جو اَب کملانے لگا تھا شاید کسی کی یاد میں بیٹھے مینا کو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اُس کا یہ وارفتہ پن مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہا مَیں نے پوچھنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ بہت ہی زیادہ محبت کرنے والا پرندہ ہے۔ آدمی سے ایسا گھُل جاتا ہے کہ اس کی زبان تک سیکھ لیتا ہے اور پھر باتیں کرتا ہے۔ پتہ کیا، کہیں مل سکے گا؟ تو پتہ چلا کہ بازار میں ایک جگہ بکتے ہیں۔ بھئی! ایک خریدیں گے۔

آگے چلے تو جھیل کی طرف چڑھائی تھی جس کے درمیان میں یادگارِ شہدا بنی ہوئی تھی۔ یہاں شہدا سے مکتی باہنی کے وہ لوگ مراد ہیں جو ہندوستان

سے تربیت لے کر آئے تھے۔ اور جن لوگوں نے مشرقی پاکستان کو بچانے کے لئے جانیں دیں وہ غاصب اور مجرم گردانے گئے۔

خیر! جھیل بھی دیکھی اور واپس چلے کہ ایک ساتھی کے گھر کھانا تھا اور پھر ایئرپورٹ جانا تھا۔ واپسی "بیمان" سے تھی۔ یہ BIMAN بنگلہ دیش ایئرلائن کا نام ہے۔ کھانا بہت پُرتکلف تھا، چونکہ گھر پہ تھا کچھ ساتھی بھی جمع تھے۔ موٹر والوں نے بھی دعوت کھائی اور یوں ظہر پڑھ کر ہم ایئرپورٹ کو نکلے۔ راستے میں SEA-PORT کا نظارہ بھی کیا، بہت خوبصورت بندرگاہ بنی ہوئی ہے۔ ایئرپورٹ پر وہی شور اور ہاتھا پائی۔ اندر سے جنگلہ بند کر کے ملازم کھڑے تھے اور باہر دھینگا مُشتی ہو رہی تھی۔ پہلے تو موٹر والوں کا حساب ہُوا، آٹھ سو پچاس ٹکے لے کر ہم سے جھگڑ رہے تھے اور ہم نے بمشکل بیس میل موٹر استعمال کی تھی۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ رات جو گاڑی لے گیا تھا اس نے بھی یقیناً ہزار بارہ سو کما لیا ہوگا۔ یہ مہنگائی کا حال اور گداگر کپڑے پھاڑے دے رہے تھے۔

اندر داخل ہوئے، کارڈ حاصل کئے، مینا ٹِک کرائی اور یوں پاکستان کے زمانہ کے نوکر میں جا بیٹھے جو اُڑنے کے لئے رستے تڑا رہا تھا۔ میں نے جہاز میں بیٹھ کر اندازاً حساب جوڑا تو ڈھاکہ سے چٹاگانگ اور واپس ڈھاکہ ایک رات دن میں تقریباً دس ہزار سے زائد خرچہ تھا۔ بنگال کا ڈیڑھ ٹکہ ہمارا روپیہ بنتا ہے ہاں! مینا خریدنے بازار گئے تھے وہ خرچہ الگ تھا کہ انھوں نے دو ہزار مانگے اور آخر بارہ سو پر سودا ہُوا کہ ہم نے ایک ایسی نوعمر خریدی تھی جو ابھی بولنا نہ جانتی تھی۔ بھلا جو وہاں کی بولی سیکھ چکی تھی، ہمارے کس کام کی۔

جہاز اُڑا اور خلیج بنگالہ کے اُوپر سے گزرا تو دیکھا کہ سمندر نے خشکی کی طرف

بڑھنا شروع کیا ہُوا ہے اور دُور دُور تک دلدل سی بن رہی ہے۔ غریب مُلک کے تین اطراف ہندوستان ہے جس کو بارہ کروڑ مسلمان کی منڈی مل گئی ہے، جن سے ہر چیز اَونے پونے میں خرید لیتا ہے اور ہندوستان کی ناقص مصنوعات انھیں مہنگے داموں بیچتا ہے اور یوں وہ دن بدن غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں اور ایک طرف سمندر ہے جس نے زمین کو نگلنا شروع کر دیا ہے۔ اگلے دِنوں یہی بات کی تو انگلستان سے آنے والا ایک دوست بتا رہا تھا کہ سائنسدانوں کے مطابق کئی ایک علاقے سمندر میں ڈوب جائیں گے جن میں بنگلہ دیش بھی شامل ہے۔ اللہ ہی جانے، کیا ہوگا؟

پچھلے پہر ڈھاکہ پہنچے اور اگلی صبح ہماری واپسی تھی۔

ڈھاکہ میں قادیانیوں کی بھی ایک بہت بڑی مسجد ہے جو ایشیا بھر کے لئے مرکز ہے اور یہاں کے مسلمانوں کے لئے قادیانی بھی ایک بہت بڑی مصیبت ہیں کہ یہاں تو انھیں غیر مُسلم قرار نہیں دیا گیا، نیز حکومت میں وُزراء اور سیکرٹری تک کے عہدوں پہ قابض ہیں ایک طرف تبلیغی جماعت کا بھی بہت بڑا اور قدیم مرکز ہے جہاں کا سالانہ اجتماع ایشیا بھر میں مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے، اوسطاً بیس۲۰ لاکھ کے قریب مسلمان جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنے جنّتی ہونے کا یقین دِلا کر گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ یہ میں اِس لئے کہہ رہا ہوں کہ بیس۲۰ لاکھ ووٹ کسی سیاسی پارٹی کے پاس نہیں۔ اگر یہ اللہ کے بندے اپنے بزرگوں کو آگے لائیں تو اقتدار اِن کے قدموں میں ہو اور یوں بارہ کروڑ مسلمان شاید سکون کا سانس لے سکیں۔ مگر انھیں پتہ نہیں کس نے کہہ دیا ہے کہ آپ نیک لوگ ہیں سیاست بدکاروں کا کام ہے، آپ مساجد میں بیٹھیں اور دعا کیا کریں۔ اور یہ بھی

خوش ہیں کہ ہم کو تو جنّت جانا ہے۔ دُنیا میں تکلیف بھی آجائے تو خیر ہے لیکن شاید جنّت کا مالک ان کی طرح اپنے بندوں کو چھوڑ نہ دے گا اور یقیناً ان سے بھی پُوچھے گا کہ کروڑوں مسلمانوں کے لیئے عملی جدّوجہد میں آپ کا حصّہ کیا ہے اور اگر آپ کچھ نہیں کر پائے تو پھر جنّت میں آپ کا کیا کام؟ کہ محمد رسُول اللہ ﷺ نے تو مسلمانوں کو ریاست دی۔ ابوبکر، عمر اور تمام خلفاءِ راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین تو سیاسی قیادت فراہم کرتے رہے۔ یہ آپ کے دَور میں کیسے شجرِ ممنوعہ قرار پائی کہ مسلمانوں پر حکومت تو دین سے بے نیاز لوگ کریں اور آپ گوشوں میں الگ بیٹھ کر تنہا جنّت کی تیاری کرتے رہیں۔ شاید اس طرح آپ لوگ حوروں کی آغوش میں آرام نہ کر سکیں گے۔

یہی حال پاکستان میں مذہبی پیشواؤں اور خصوصاً تبلیغی جماعت کا ہے۔

کاش! یہ بزرگ، جو رائے ونڈ میں تشریف رکھتے ہیں، اُن کا ڈیرہ ایوانِ صدارت میں اور وزیرِاعظم سیکرٹریٹ میں ہوتا۔ اور اگر یہ مسلمان قوم کو قیادت فراہم کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو پھر بزرگ کیسے بن گئے اور کس بات کی بزرگی ہے عملی زندگی سے فرار کسی بزرگی کی دلیل نہیں نہ قرینہ۔ خدا جانے انھوں نے یہ راہبانہ اسلام کہاں سے لیا جس میں انھیں رحمت العالمین کی یہ سُنّت کہیں نظر نہیں آتی کہ حضور اکرم ﷺ نے اُمّت کو ابوبکر و عمر رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے قائد تیار کر کے دیئے تھے۔ یہ حضرات حضور اکرم ﷺ کی اس سُنّت کو کفر سمجھتے ہُوئے اس سے برملا بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ واقعی شیطان بڑا کائیاں ہے۔ کس کس رُوپ میں مسلمان کو دین سے دُور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ڈھاکہ مسجد الفلاح میں علماء حضرات کا اجتماع بھی ہُوا جن سے یہی تلخ نوائی

کرتا رہا کہ ہم سب پر فرض ہے کہ اس مشکل ترین دَور میں مُسلم قوم کو قیادت فراہم کریں اور آپس کے فروعی اختلافات پر جن کی اکثریت ذاتی مفادات کی پیدا کردہ ہے۔ ذرا وسیع القلبی کا ثبوت دیں کہ ملکِ عزیز میں بھی اسلامی حکومت قائم ہو اور دُنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک مثالی حکومت نظر آئے کہ وہ بھی اس مثبت اور مثالی تبدیلی سے مستفید ہوں۔ اللہ کرے، ایسا ہی ہو!

جہاں تک بنگلہ دیشی مسلمان اور عام شہری کا تعلق ہے، تو انھیں اپنی غلطی کا احساس بہت شدت سے ہو چکا ہے اب وہ یہ جان رہے ہیں کہ چند مفاد پرستوں نے انسانوں پر حکومت کرنے کی خاطر کتنی شاطرانہ چالیں چلیں، جن کی لپیٹ میں آکر لاکھوں مسلمان کچلے گئے اور نتیجتاً ایک مسلمان ملک، ایک لادینی ریاست قرار پایا جس کی شہ رگ پر ہندو بنیا اپنے خُونی دانت گاڑے ہُوئے لہٰذا وہ لوگ جنھیں مغربی پاکستانی کے خلاف لڑایا گیا۔ اب مغربی پاکستانی کو دیکھ کر ہاتھ چُومتے ہیں اور باقاعدہ بڑی پُرزور تحاریک چلا رہے ہیں کہ دوبارہ الحاق کی صورت بن جائے اور اس تحریک میں علماء، مشائخ، سیاست دان، کاروباری اور ملازمت پیشہ حضرات سے لے کر عام بنگالی مسلمان تک ہر طبقۂ زندگی کے لوگ شامل ہیں۔ اس ضمن میں ان سب کا یہ سوال بھی تھا کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ مغربی حصے میں یا پاکستان میں کیا سوچا جا رہا ہے؟ تو عرض کیا، نہ صرف ہو سکتا ہے بلکہ ہونا چاہیئے۔ نہ صرف ان دو برادر ملکوں میں بلکہ دُنیا کی سب مسلم ریاستوں کا ایک وفاقی ڈھانچہ ہونا چاہیئے اگر امریکہ کی پچاس سے زائد ریاستیں وفاق بنا سکتی ہیں تو مُسلم ریاستیں کیوں یکجا نہیں ہو سکتیں۔ مگر مصیبت صرف یہ ہے کہ ہمارا دین دار طبقہ ابھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ سیاست بُرا کام ہے اور یہ نیک لوگوں کے بس کا نہیں اور جو لوگ

سیاست پہ قابض ہیں وہ اپنے مفاد کے لئے بچے کھچے پاکستان کو مزید تقسیم کرنا
چاہتے ہیں لیکن انشاء اللہ ایسا نہ کر سکیں گے۔

چار دنوں میں تقریباً سات یا آٹھ بیان مختلف مساجد اور اجتماعات میں ہوئے
جن میں مرکزی بات وہی تھی جو ہمارے سلسلہ عالیہ کا مشن ہے کہ مسلمانوں کو عملی
زندگی کا درس دیا جائے اور پھر سے ایسی قوم میدانِ عمل میں لائی جائے جو نماز کے
وقت امام ہوں اور جہاد کے وقت سالار، انصاف کے وقت قاضی بن سکیں اور
ملکی سیاست میں جذبہ صدیقیؓ اور جرأتِ فاروقیؓ کے مظہر ہوں۔ جو حیاءِ عثمانؓ اور
علمِ علیؓ کے وارث ہوں کہ یہ بدحالی دراصل ہماری اسی غفلت کا نتیجہ ہے جس کا
شکار ہم طاغوتی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث ہو چکے ہیں۔ پوری قوم
دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک طبقہ واقعی نیک اور دینی علم سے آگاہی رکھنے
والا ہے مگر مساجد سے باہر اُن کا کوئی کردار نہیں رہا اور میدانِ عمل ان سے خالی۔
دُوسرا طبقہ میدانِ عمل کا اور سیاسیات کا دھنی ہے مگر ان کی پیشانیاں سجدوں
سے عاری اور دل علمِ دین سے خالی ہیں۔ اسی خلا کے باعث آج برِصغیر میں
مسلمان اکثریت کو بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان میں بانٹ کر بارہ بارہ کروڑ کر دیا
گیا ہے۔ حالانکہ صرف برِصغیر میں مسلمانوں کی تعداد چھتیس کروڑ سے کسی طرح کم نہیں۔
الحمدللہ! اس بات کے لئے بنگالی مسلمانوں کے دل کھلے ہوتے پائے اور بہت سے
لیڈر قسم کے احباب نیز جوان داخلِ سلسلہ ہوئے۔ اگرچہ ہم بہت کم وقت لے کر
گئے تھے مگر کام ہماری محنت اور توقع دونوں سے بڑھ کر ہوا۔ الحمدللہ! احباب
وہاں بھی بہت محنت کر رہے ہیں کہ مصیبت جب آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی وہاں
سوشلسٹوں اور روافض نے بھی ایک مصیبت کھڑی کر رکھی ہے اور حکومتِ ایران

بے تحاشا لٹریچر بنگالی میں شائع کر کے وہاں بانٹ رہی ہے جس کے جواب میں
احباب نے ایک مؤثر تنظیم بنائی ہے اور اپنا پریس لگا کر دینی کتب اور رسالہ جات
کو بنگالی میں ڈھالنے کا اہتمام کیا ہے اور یہ کام پورے جوش و خروش سے کر رہے
ہیں اللہ کریم ان کی کوششوں میں برکت دے۔ آمین۔

احباب نے دوبارہ جلد آنے پہ بہت اصرار کیا کہ وہ احیائے اسلام کی
اس تحریک میں اب مزید تاخیر نہیں چاہتے اور علماء اور با اثر حضرات نے بھی اس
بات کو پسند فرمایا کہ اب قوم کے مسائل کا حل صرف ایک بات میں ہے کہ قومی
قیادت دیندار طبقہ کے ہاتھ میں ہو۔ اگرچہ اس اَمر کی ضرورت یہاں پاکستان میں
بھی وہاں سے کسی طرح کم نہیں مگر شاید ابھی یہاں لوگ اس حقیقت کو جاننے یا
ماننے سے پہلے مختلف تجربات کرنا چاہ رہے ہیں جبکہ وہاں آخری تجربہ یعنی خانہ جنگی
تک کا تجربہ ہو چکا ہے اور اب انہیں یہ سمجھ آ رہی ہے کہ دین صرف نماز و روزہ کا
نام نہیں بلکہ عبادات اللہ کریم سے ایک قلبی اور رُوحانی قوت کے حصُول کا سبب
ہیں اور اس قوت کے اظہار کی جگہ میدانِ عمل ہے۔ بالکل اُسی انداز میں جس انداز
میں آقائے نامدار ﷺ نے قوم تیار فرمائی تھی کہ عابد و زاہد بھی ہے اور مجاہد و
غازی بھی، تاریخ اسلام بھی اس بات پہ گواہی دے رہی ہے کہ جب تک تلوار عبادت
کرنے والوں اور خوفِ خدا رکھنے والوں کے ہاتھ میں رہی تب تک مسلمان کی
شوکت قائم رہی اور جب تلوار دین سے عملی طور پر محروم لوگوں کے ہاتھ آئی، تو
شوکتِ مسلم بھی قصۂ پارینہ بن گئی۔

اور آخر میں ہلکی سی جھلک جو اُن دلوں میں ہمارے لئے محبت کی ہے
وہ اُن معصوم بچیوں کے رویئے میں نظر آتی ہے جن کے ہاں ہم مقیم تھے وہ مجھے

"نانا بھائی" کہتی ہی نہیں سمجھتی بھی تھیں اور میرے لئے چائے، کھانا ڈھونا تو الگ بات، اپنے ہاتھ سے کھلانے پہ مصر رہتی تھیں ۔ ہم رات بارہ بجے لوٹے تو انھیں منتظر پایا کہ نانا بھائی آئیں گے ان کو بستر دینا ہے، شاید چائے مانگیں جب وہ لیٹ جائیں گے تو ہم سوئیں گی ۔ یہ میری نواسیاں ننھی منی تین بہنیں تھیں ۔ ایک رات چھوٹی نظر نہ آئی تو منجھلی سے پوچھا، کہنے لگی: "گھوم گئی ہے" ۔ میں بڑا پریشان ہوا اُن کے ابّا سے پوچھا تو پتہ چلا، سو گئی ہے ۔ بنگالی میں سو جانے کو گھوم جانا کہتے ہیں ۔ میں نے اُن سے گنتی لکھنا سیکھی اور حروفِ تہجی سیکھنا شروع کئے مگر وقت بہت کم تھا ۔ بہرحال آنے تک وہ بیچاریاں بہت پریشان تھیں ۔ میں انھیں اکثر یاد کرتا ہوں اور اُمید ہے انشاء اللہ اگلے ماہ پھر جانے کا موقع بن جائے گا کہ اپنا مشن تو احیائے اسلام ہے دُنیا کے کسی بھی حصے اور گوشے میں ہو، ہونا ضرور چاہیئے ۔ اور اب انسانیت کو اس کی ضرورت ہے ۔ لہٰذا ربِّ جلیل سے اُمید ہے کہ ایسا ضرور ہوگا ۔ یہ تقاضائے ربوبیت ہے کہ جس شے کی ضرورت ہو وہ مہیا کی جائے اور اب گناہ کی دلدل میں پھنسے ہوئے، ظلم و جور میں پستے ہوئے خاک و خون میں غلطاں بندوں کو اسلامی انصاف، اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کی ضرورت ہے ۔ انشاء اللہ ! اب یہ سُورج پھر پوری آب و تاب سے دمکے گا اور فسق و فجور کی سیاہ رات چھٹ جائے گی ۔ اسلام کی نسیم خوشبو سے دامن بھر کر پھیلے گی اور ظلم و جور کے بگولے نابود ہو جائیں گے ۔ اللہ کریم مسلمانوں کو پھر سے جدوجہدِ حیات میں سرگرمِ عمل کر دے ! آمین ۔

ہم ۱۲، دسمبر کو ڈھاکہ سے واپس روانہ ہوئے ۔ مگر افسوس ! کہ ہماری مینا نہ آسکی ۔ رات پتہ کیا تو بتایا گیا کہ آپ لے جا سکتے ہیں ۔ مگر جب چیک اِن کے

لئے گئے تو کہا، اس کا ہیلتھ سرٹیفکیٹ ہمراہ ہونا چاہیئے ۔ وقت نہ تھا، چھوڑ کر چلے آئے ۔ اب اطلاع ملی ہے کہ اسے لانے کے لئے وزیرِ جنگلات سے اجازت لینا ہوگی ۔ اسے کہتے ہیں: "دمڑی کی بڑھیا ٹکہ سر منڈائی" ۔ مگر خیر! جو اللہ کریم کو منظور ہوگا ۔ ہماری کوشش اور نیّت لانے کی ہے ۔

واپسی کا سفر ڈھاکہ، کلکتہ، وسطی ہندوستان کے اوپر سے اور پھر راجستھان اور کراچی کا تھا ۔ سارا راستہ نیچے کے مختلف مناظر نظروں کے سامنے سے گزرتے رہے، یہ وہ زمین تھی جس پر ایک ہزار برس فرزندانِ توحید نے عظمتِ الٰہی کے گیت گائے ۔ آج اسی زمین پر ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے ۔

خیال تھا، چند سطور لکھوں گا مگر مصروفیات نے دامن نہ چھوڑا ۔ سفرِ عمرہ میں مکّہ مکرمہ میں یہ چند حروف لکھے جو آج مدینہ منورہ میں ختم کر رہا ہوں ۔ میرے کمرے سے گنبدِ خضراء کا نظارہ نظر نواز ہے اور لب پہ دُعا ہے کہ

اے بارِ الٰہ ! مسلمانوں کو پھر سے توفیقِ عمل عطا فرما اور اپنے سجدہ گزار بندوں کو فلاحِ مملکت کا شعور بھی عطا کر ! آمین ۔

فقیر محمد اکرم عفی عنہ

مدینہ منورہ، ۸ جنوری ۹۰ء

برفانی چوٹیوں کا ہیرو

شکار عمر بھر میری کمزوری رہا ہے۔ اب عمر بھی ڈھل چکی ہے۔ ساتھ مختلف امراض نے بھی دوستی کر لی ہے۔ خصوصاً" ذیابیطس جو سب کا جامع ہے اب عمر بھر کی ساتھی ہے۔ علاوہ ازیں موٹر کے دو حادثات نے بدن کا ڈھانچہ ہلا دیا ہے۔ اور ہر حرکت پر کسی نہ کسی جوڑ سے چوں چوں کی آواز آتی ہے۔ درد کی ٹیس اٹھتی ہے۔ اس کے باوجود شکار کا جذبہ جوان ہے۔ ایک بار ہٹل آزاد کشمیر تک خوار

ہوا ہوں اور شکار بھی نہ ملا۔ اب کے پھر سوجھی تو ہمالہ کی ترائی میں جانے کی تیاری کی اور مشہور مارخور جو اڑیال ہی کی نسل کا جانور ہے اور پہلے اس کے بارے میں لکھ بھی چکا ہوں کہ شکار کی تیاری کر لی۔

چنانچہ مارچ کے پہلے ہفتے رخت سفر باندھا اور چل نکلا۔ ڈاکٹر بٹر تو ویسے ساتھ ہوتے ہیں۔ بٹ صاحب ابو ظہبی سے آئے تو انہیں بھی ہمالہ کے دامن میں جھانکنے کا شوق چرایا۔ اس طرح ہم تین آدمی عازم سفر ہوئے۔ دامن کوہ میں ایک دوست کو اطلاع دی۔ جن کا نام نامی ٹی ڈبلیو میر ہے۔ اور یوں ان کے پاس آدھمکے۔ اس گاؤں میں حاجی صاحب معروف شکاری ہیں۔ پہلے سے کئی بار مل کر شکار پر جا چکے تھے۔ انہیں بلوایا اور یوں تعداد پانچ ہو گئی۔ اب مسئلہ کھانے پینے کا تھا۔ چنانچہ ایک عزیز ارشاد السالکین کو یہ ذمہ داری سونپی اور یوں اللہ کے نام پر ہم تیار تھے۔

فیصلہ ہوا کہ علی الصبح ایک بجے روانہ ہوا جائے اس لئے کہ ایک تو راستہ خطرناک ہے اور خراب بھی ہے۔ دوسرے کم از کم تین سو کلو میٹر فاصلہ طے کرنا ہے۔ چنانچہ رات سب نے اپنے اپنے حصے کی اشیاء کو پیک کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ادویات' بٹ صاحب نے کیمرہ' میر صاحب نے بندوقیں اور چھٹے جوان نے کھانے پینے کا سامان جمع کیا۔ جیپ تیار کی اور عشاء کے بعد سونے کے لئے لیٹ گئے۔

مگر مجھے نیند نہ آئی۔ میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب میرے کمرے میں

تھے۔ انہیں بھی سونے نہ دیا اور گپ شپ چلتی رہی۔ پونے ایک بجے سب کو جگایا۔ تہجد ادا کی' چائے پی اور نکلتے نکلتے ڈیڑھ بج گیا۔ ڈرائیونگ کے لئے کرۂ فال میرے نام پڑا۔ یاد رہے بندوقیں ہمارے پاس صرف دو تھیں۔ ۷.۶۲ اور ایک بارہ بور کہ ممکن ہے کوئی پرندہ شکار کر لیں۔

باتیں کرتے رہے اور جیپ پہاڑی راستوں کے پیچوں میں ہچکولے کھاتی فجر کے وقت تقریباً دس ہزار فٹ کی بلندی پر ایک ایسی وادی میں داخل ہو چکی تھی۔ جہاں سے شکار گاہ شروع ہو جاتی ہے۔

سرد ترین ہوا سینہ شق کئے دیتی تھی۔ فجر کا وقت داخل ہو رہا تھا۔ جیپ روکی اور نماز ادا کی۔ چائے کا ایک ایک کپ پیا اور جیپ میں بیٹھ کر ذکر الٰہی کرنے لگے۔ کچھ روشنی ہوئی تو آگے چلے۔

اب ہماری رفتار بہت آہستہ تھی۔ جیپ میں سے پہاڑ کے دامن اور تنگ وادی کو دیکھتے جا رہے تھے کہ علی الصبح وہاں مارخور کے ملنے کے امکانات تھے۔ ورنہ پہاڑوں کے پیچھے تو کسی بھی وقت مل سکتے تھے۔ مگر وہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ ہمارا شکار تو یہ تھا کہ سڑک پر فائر کر لیں۔

آہستہ آہستہ بلندی بھی بڑھتی جا رہی تھی اور وادی بھی دامن سمیٹتی جا رہی تھی۔ جوں جوں وادی تنگ ہو رہی تھی۔ سردی کے علاوہ ہوا میں شدت بھی آتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ سات بجے کے قریب ہم ایک ایسے موڑ پر تھے۔ جہاں ایک طرف سے دھوپ پڑ رہی

تھی اور وادی میں یا دھوپ کے گزرنے کا راستہ تھا یا برفانی پانی کا نالہ سا بہہ رہا تھا۔ یہی مختلف نالے جوں جوں نیچے جاتے ہیں ملتے جاتے ہیں اور آخر دریا کا روپ دھار لیتے ہیں۔

میں تو بڑی احتیاط سے جیپ لے جا رہا تھا کہ نالے کے پار مٹی پر کنکر گرے۔ چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اوپر سے آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کنکر گر رہے ہیں۔ یہ عموماً اوپر جانوروں کے ہونے کی دلیل ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے جیپ روکے بغیر حاجی صاحب سے کہا کہ پچھلا دروازہ کھول کر اوپر دیکھیں۔

حاجی صاحب نے خبر دی کہ مارخور اوپر ہے۔ جیپ رک گئی۔ ہم نیچے اترے دیکھنا شروع کیا تو آٹھ دس کے قریب مادائیں اور نوخیز بچے ایک طرف سے گزر رہے تھے اور کافی بلندی پر جا چکے تھے۔ ویسے بھی مادہ یا چھوٹا ہمارا ٹارگٹ نہیں تھا۔ اور ان چٹانوں سے انہیں دیکھنا بھی آسان کام نہیں تھا کہ ان کا رنگ اور عمودی چٹانوں کا رنگ ایک جیسا ہوتا ہے۔ معاً ایک چٹان کی اوٹ سے تین بڑے بڑے نر نکلتے ہوئے نظر آئے۔ یہ جوں جوں بڑے ہوں رنگ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ تقریباً نمایاں ہوتے ہیں۔ اگرچہ پانچ سو گز سے تو دور ہی ہوں گے۔ مگر شکاری کب جانے دیتا ہے۔ فوراً رائفل سے نشانہ لینے لگا۔ اب دوسری مصیبت یہ تھی کہ ایسی جگہ ہو جہاں جانور زخمی ہو کر گرے تو آپ اسے حاصل بھی کر سکیں۔ ورنہ مارخور اکثر ایسی جگہ نظر آتا ہے جہاں انسان کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ میں بھی

سانس روکے اندازہ کر رہا تھا کہ کہاں فائر کروں۔ وہ آہستہ آہستہ اوپر ہی اوپر جا رہے تھے۔ چٹان بالکل عمودی تھی۔ آخر ایک جگہ ایک جانور ایسی پوزیشن میں کھڑا ہوا کہ ایک ابھری ہوئی چٹان تھی جو اس عمودی چٹان پر کنگرے کی طرح بنی تھی۔ اور جانور اس کے اوپر نظر آیا۔ صورت حال یہ تھی کہ اس طرف گرے تو نیچے آنے تک راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی اور اگر دوسری طرف گر گیا تو پھر شاید پرندوں کی غذا کا کام دے۔ فاصلہ زیادہ تھا سوچا گر بھی گیا تو تڑپے گا۔ اٹھنے کی کوشش کرے گا اور یقیناً نیچے آئے گا۔ چنانچہ ٹریگر دبا دیا۔ دھماکہ گونجا اور ساتھ ہی جانور چٹان کی دوسری طرف گر گیا۔ ساتھی دوربین لگائے دیکھ رہے تھے۔ اور گولی ایسی کاری لگی کہ پھر تڑپا بھی نہیں۔ باقیوں نے رفتار بڑھا دی۔ اوپر کو بھاگنے لگے۔ یہ رائفل بہت ظالم قسم کا زخم لگاتی ہے۔ اگرچہ دور تھا مگر وہیں رہ گیا اور ہم حسرت سے ان بلند چٹانوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو ہماری ہنسی اڑاتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ہمالہ کی ترائی یہ زندگی اور موت کا کھیل روز مرہ کے معمولات کا حصہ ہے۔ بہرحال ہم نے سمجھا کہ یہ پرندوں کی غذا کا اہتمام ہوا اور آگے چل دیئے۔ دراصل ہمیں اطلاع تھی کہ ۱۷،۰۰۰ فٹ بلندی پر ایک وادی ہے۔ آج کل اس میں مارخوروں کا ایک گلہ ملتا ہے۔ جو دو صد سے زیادہ ہی ہوں گے۔ اور وہی وادی ہمارا ٹارگٹ تھی۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ابھی مزید دو گھنٹے جیپ چلانا تھی۔ لہٰذا ہم ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے چلتے رہے۔ ایک جگہ

پہنچ کر ایک دم سے بلندی شروع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہاں رک کر چائے پی۔ دراصل اس سے پہلے وادی کا سفر کافی تھکا دینے والا تھا۔ اگرچہ چڑھائی زیادہ نہ تھی مگر بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ اور وہاں پہنچ کر ایک دم سے اوپر چڑھنا پڑتا تھا۔ اور سڑک اوپر تک بہت سے موڑ کھا کر بلندی کو چھو لیتی تھی۔ جہاں ہم تھے یہاں دریا جم چکا تھا اور ہر طرف برف کی چاندی بکھری پڑی تھی۔ چائے کا کپ پیا اور چل پڑے۔ اللہ کا نام لے کر اوپر اوپر چڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ موڑ ختم ہوئے اور سڑک کسی حد تک سیدھی نظر آئی۔ ساتھ دریا بھی اوپر آ چکا تھا۔ اور ایسی جگہ تھی جہاں سے دریا شروع ہوتا تھا۔ یہاں پانی جما ہوا تھا اور دریا پر خوبصورت میدان بنا ہوا تھا۔ جس کے کنارے پر ہم سفر کر رہے تھے۔ اس طرف تو تھوڑی سی ڈھلان تھی مگر دوسری طرف ایسی پہاڑی تھی جو دریا سے ہی سیدھی اٹھتی تھی اور کوئی دو سو گز تک چٹان سی تھی۔ جس میں انسان کے لئے چڑھنا تقریباً ناممکن تھا۔ پھر اس پر تازہ برف بھی پڑی ہوئی تھی کہ اتنی بلندی پر تو کم از کم ہر رات کو ضرور برف باری ہوتی ہے۔

ہم حسن فطرت کی رعنائیاں دیکھنے میں مصروف تھے۔ سامنے سے ایک شیر نے سڑک عبور کی اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے برفانی شیر کو شاہانہ انداز سے گزرتے دیکھا۔ سفید برف کی طرح جسم اور اس پر گول گول دائرے سے بنے ہوئے تھے۔ نہایت لمبی دم چمکدار آنکھوں اور بہت بڑے بڑے پنجوں والا (Leopard:

Snow) سنو لیپرڈ تھا۔ جو خونخوار ترین درندہ ہے۔ یہ انتہائی بلندیوں
کا باسی ہے۔ اور برفانی درندوں میں تو سب سے بڑا ہے۔ سوائے
ریچھ کے مگر زندگی میں اس کا ریکارڈ ہے کہ کبھی دو بھی مل کر نہیں
رہتے۔ ہر ایک نے اپنا علاقہ مختص کر رکھا ہوتا ہے۔ جو دوسرے کو
گھسنے نہیں دیتا۔ صرف ملنے کا موسم ہو تو زیادہ کچھ روز مل کر رہتے
ہیں۔ ورنہ پھر علیحدہ ہی رہیں گے۔ یہ کبھی شیر اور چیتے کی طرح کنبہ
نہیں بناتا۔

شیر ہم سے بے نیاز دریا کے تختے پر سے گزرا اور سامنے کی
ترچھی چٹان پر چڑھنے لگا مگر اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے لڑکے کھیلتے
ہیں۔ اگلے پنجوں سے گولے سے بناتا ہوا نظر آتا تھا اور آہستہ آہستہ
بلند ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے گاڑی روکی۔ رائفل نکالی تو ڈاکٹر صاحب
نے کہا یہیں بیٹھے ہوئے فائر کریں مگر میں تو سٹیرنگ کے پیچھے پھنسا ہوا
تھا۔ لہٰذا نیچے اترنے کے سوا چارہ نہ تھا اور نیچے اترنا بہت خطرناک
تھا کہ اگر درندہ حملہ آور ہو گیا تو کیا ہو گا۔ کیوں کہ اس کی عادت
ہے کہ یا تو فائر کے دھماکے سے بھاگ جاتا ہے اور یا پھر حملہ کر بیٹھتا
ہے یہ دوسری صورت اس کے معمولی زخمی ہونے میں بھی بالکل یقینی تھی
یعنی اگر گولی کم خطرناک لگتی تو ضرور حملہ کرتا۔ مگر اللہ کا کرنا یہ ہوا
جب میں نیچے اترا تو درندہ رک کر کھڑا ہو گیا اور اپنا رخ تو اسی
طرف رکھا مگر سر سما کر مجھے دیکھنے لگا۔ شاید اسے یہ بات پسند نہیں آ
رہی تھی۔

میں نے رائفل کندھے سے لگا کر نشانہ لیا اور انتظار کرنے لگا
کہ ممکن ہے یہ پہلو بدلے اور یوں بڑا ٹارگٹ بن جائے۔ مگر وہ اسی
طرح کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ حاجی صاحب جیپ میں سے شور کر رہے
تھے کہ ابھی فائر نہ کریں اسے پہلو بدلنے دیں۔ اس میں خطرہ بھی تھا
کہ یہ پہلو بدل کر کھڑا رہے گا یا حملہ آور ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہو تو
پھر اسے مارنا آسان کام نہیں ہوتا کہ وہ بجلی کی طرح حرکت کرتا ہوا
آتا ہے۔ برف میں جہاں کئی کئی فٹ پاؤں دھنس جاتے ہیں۔ یہ ۴۰
میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ اور باہر تو ۷۰ میل تک اس
کی رفتار ہوتی ہے۔ نیز یہ بہت بڑی چھلانگ لگاتا ہے۔ لہٰذا میں نے
ٹریگر دبا دیا کہ زیادہ انتظار کا موقع نہ تھا۔ رائفل گرجی اور شیر وہیں
کھڑا رہا تو میں نے سوچا کہ گولی اس کا کام کر گئی ورنہ اسے یا بھاگ
جانا چاہئے تھا یا پھر حملہ آور ہوتا۔

وہیں کھڑے کھڑے اس نے پہلو بدلا تو دوسرا فائر کیا وہ چند قدم
اوپر کو چلا پھر ایک فائر کیا وہ دو قدم اور بڑھا۔ حاجی صاحب نے کہا
مجھے دیں میں فائر کروں۔ انہوں نے کیا تو دو قدم اور چلا۔ میر صاحب
نے للکارا مگر میں نے منع کر دیا۔ دراصل ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے
پاس صرف ایک میگزین تھی جس میں ۲۸ گولیاں تھیں۔ جن میں بیشتر
درہ کی تھیں۔ جو یا تو فائر نہ ہوتیں اور اگر ہو جاتیں تو نشانہ پر لگنے کا
تو سوال ہی نہ تھا۔ چنانچہ کوئی بھی نہ لگی اور چند مس بھی ہو گئیں
یعنی سرے سے فائر ہی نہ ہوئیں اور اب باقی صرف تین تھیں۔ کچھ تو

راستے میں فائر ہو چکی تھیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ شیر پر فائر ہونے والی گولی صحیح تھی۔

خیر شیر کھڑے کھڑے بیٹھ گیا مگر ابھی تک سر اٹھا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر آرام سے سر رکھ دیا۔ تو میں جان گیا کہ اس نے جان دے دی۔ معاً اس نے پلٹا کھایا کہ پنجوں کی گرفت ختم ہو چکی تھی اور پھر پلٹے پہ پلٹے کھانے لگا۔ حاجی صاحب چلا رہے تھے۔ خدایا اسے نیچے لانا۔ خدایا راستے میں رک نہ جائے حتیٰ کہ وہ پلٹے کھاتا دریا کے منجمد پانی پر آگیا۔

اب ہماری باری تھی۔ احتیاط کے ساتھ اس کی طرف اترنا شروع کیا۔ حاجی صاحب کو بندوق تھمائی کہ ممکن ہے معمولی جان بھی ہو تو آدمی کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہ تیزی میں اترے تو برف میں گرے ڈاکٹر صاحب اور میرے سوا سب نے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ان کی تقلید کی۔ دراصل جہاں برف کرسٹل بن چکی ہو وہاں پاؤں پڑ جائے تو گرنے کا مزا آ جاتا ہے۔ اور اٹھ کر گرنا پڑتا ہے۔

بہرحال یوں رفتاں و خیزاں ہم اس تک جا پہنچے۔ بڑی احتیاط سے دیکھا مر چکا تھا۔ اب مسئلہ کھال اتارنے کا تھا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ ناپ کیا تو ناک سے دم تک ساڑھے سات فٹ تھا۔ اور برفانی شیر کا بہت بڑا سا منہ تھا۔ ورنہ تو سفید چیتے کی نسل وہاں ملتی ہے جو چھوٹے چھوٹے کتے کے قد کا ہوتا ہے۔ بہرحال

ہم نے کھال جیپ میں رکھی اور گوشت تو مقامی آبادی کا حصہ تھا جو کبھی کبھار اگر شیر ہاتھ آ جائے تو اس کے گوشت پر باقاعدہ تہوار مناتے ہیں۔ شکاریوں کے نعرے اپنا الگ حسن رکھتے ہیں۔ اب واپسی کا سفر درپیش تھا جو کم از ۷ گھنٹے کا تھا لہٰذا ہم جانب منزل چلے اور شام ہوتے ہوتے قیام گاہ پہنچ چکے تھے۔ یہ زندگی کا انوکھا تجربہ تھا کہ چند سو گز سے زمین پر کھڑے ہو کر آمنے سامنے سے ایسے خونخوار درندے کا شکار ہوا۔ جس کے بارے میں ایسا سوچنا بھی مشکل ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بیماریٔ اور حادثات کے بعد اللہ کریم نے اس قدر صحت بخشی کہ میں نے اس روز تقریباً ۱۴ گھنٹے پہاڑی راستوں پر جیپ چلائی جو بجائے خود ایک مشکل ترین کام تھا۔

اِسرارُالتنزِیل

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان کی دلکش تحریر میں قرآن کریم
کی ایک منفرد اندازِ تفسیر۔
کہ قرآن کریم کو سمجھنا نہ صرف آسان
بلکہ دلچسپ بنا دیا ہے۔
پڑھ کر خود ہی افادیت کا اندازہ لگایئے۔

اویسیہ کتب خانہ

اویسیہ سوسائٹی، کالج روڈ، ٹاؤن شپ، لاہور